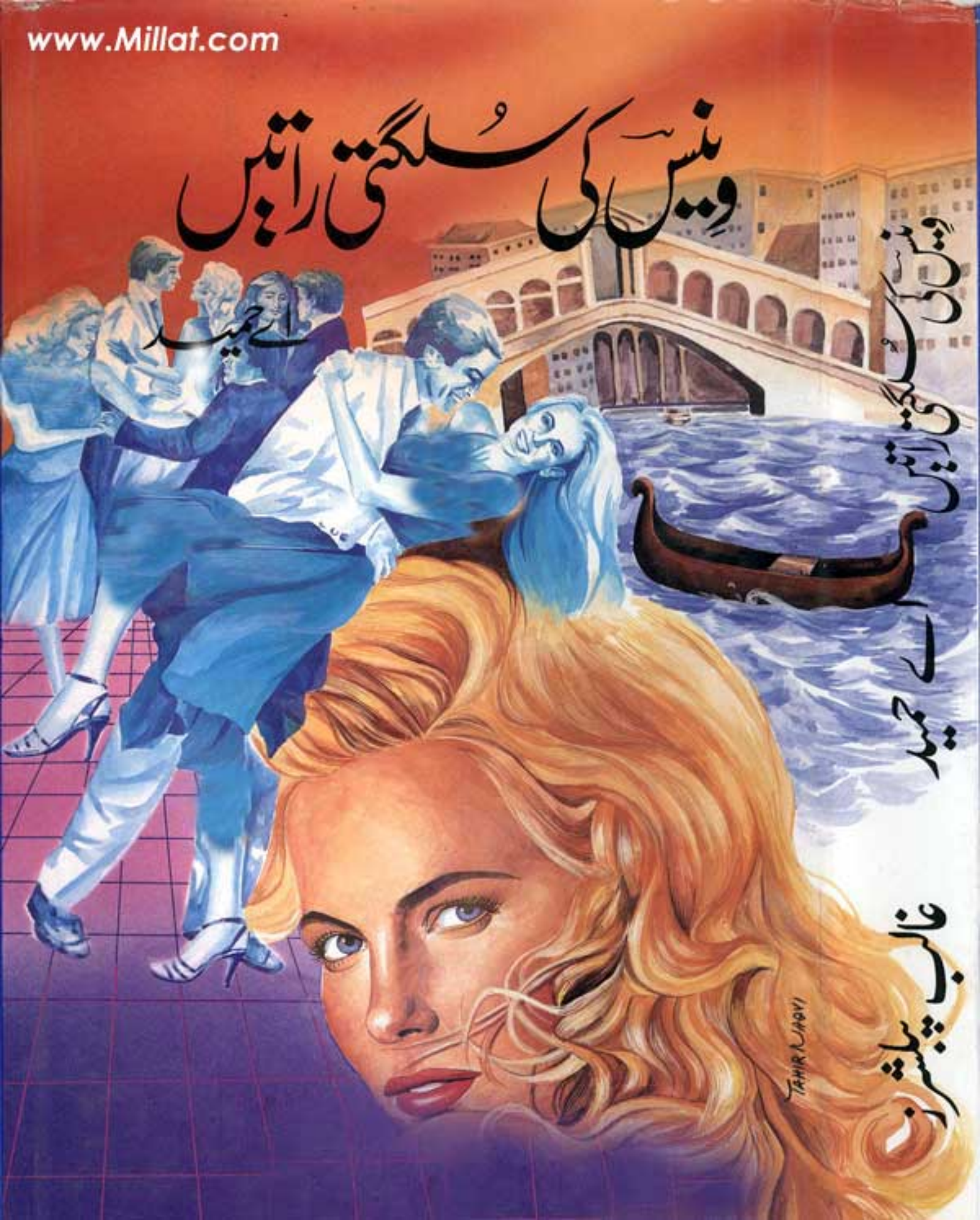
www.Millat.com

وینس کی سلگتی راتیں

اے حمید

وینس کی سلگتی راتیں

اے حمید



غالب پبلشرز

مجھے اٹلی کے شہر وینس پہنچنا تھا۔

میری جیب میں پاسپورٹ، بحرین تک سمندری جہاز کے ٹکٹ اور پچیّس امریکی ڈالروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اٹلی کا ویزا میں نے کسی نہ کسی طرح لگوا لیا تھا۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سفرنامہ لکھ رہا ہوں تو وہ سب واقعات پوری دیانت داری کے ساتھ بیان کروں گا جو مجھے دوران سفر اور اٹلی پہنچ کر پیش آئے۔ میرے سفر کی یہ داستان بالکل سچی ہے۔ اسی لئے میں لکھتے ہوئے نہ تو مبالغے سے کام لوں گا اور نہ اپنی طرف سے کوئی واقعہ لکھوں گا۔ میرا سفرنامہ پڑھ کر اگر کوئی مجھے برا بھلا کہتا ہے تو بے شک کہتا پھرے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے حقائق بیان کروں اور جو کچھ مجھ پر بیتی ہے، وہ صحیح تفصیلات کے ساتھ پیش کر دوں۔

میرے پاؤں میں شروع ہی سے ایک چکر رہا ہے۔ بچپن میں ہی میں گھر سے بھاگ کر جنوب مشرقی ایشیا کے شہروں، سمندروں اور جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا اور وہاں ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ آج انہیں یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل میں محبت بھری یادوں کی شمع بھی روشن

ہو جاتی ہے۔

میں نے اٹلی کا سفر کیوں اختیار کیا؟

اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں ان کھنڈرات کو دیکھنا اور وہاں رات بسر کرنا چاہتا تھا جو کبھی عظیم رومن ایمپائر کے عظیم الشان محلات ہوا کرتے تھے اور ان محلات کے ایوانوں میں سنہری بالوں اور سیاہ آنکھوں والی شہزادیاں رہا کرتی تھیں۔ میں پرانے قلعوں کے وہ تاریک تہہ خانے بھی دیکھنا چاہتا تھا جہاں قیدیوں کے سروں میں میخیں ٹھونک کر انہیں اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں کسی گولڈن بالوں والی خوبصورت اطالوی لڑکی سے رومانس لڑانا چاہتا تھا۔ اطالوی لڑکیوں کے حسن و جمال کے بارے میں، میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اور بہت کچھ سن بھی رکھا تھا۔ ان کی عیاشیوں کی کہانیاں بھی میں نے بہت سنی تھیں۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں اٹلی پہنچ کر یہ ساری عیاشیاں بھی کرنا چاہتا تھا اور اٹلی کی شان و شوکت والی تہذیب کے بوسیدہ کھنڈر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

یہی شوق فضول اور ایڈونچر تھا جو مجھے اٹلی کی طرف کھینچے لئے جا رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہاں میں کہاں رہوں گا۔ دن کہاں گذرے گا، راتیں کہاں بسر ہوں گی، سورج غروب ہوتے ہوئے مجھے کس حال میں دیکھے گا اور جب طلوع ہو گا تو میں کہاں اور کس حال میں ہوں گا۔ بس میرا ذوق آوارگی اور ذوق عیاشی مجھے کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ پردیس میں تکلیفیں اٹھانے کا مجھے پہلے ہی سے تھوڑا بہت تجربہ تھا مگر یہ معاملہ یورپ کا تھا جہاں اگر جیب خالی ہو تو کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ اس کے

باوجود میں اپنی منزل یعنی اٹلی کے شہر وینس پہنچنے کو بے تاب تھا۔ وینس کا شوق مجھے اس لئے بھی تھا کہ میں نے پڑھا بھی تھا اور فلموں میں بھی دیکھا تھا کہ اس شہر کی گلیوں میں ایڈریاٹک سمندر کا پانی بہتا ہے اور گلیوں میں کشتیاں چلتی ہیں جنہیں گنڈولا کہا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر آباد یہ ملک میں ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ جس اطالوی لڑکی سے میں عشق کرنے کی نیت اور خیال لے کر جارہا ہوں' وہ مجھے وینس میں ہی ملے گی۔ اس خیالی اطالوی لڑکی کا تصور میرے اندیشہ ہائے دور دراز کو میرے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ میں نے اپنا سفر کراچی سے شروع کیا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے ایک طرح سے بحرین کے آگے پیدل ہی سفر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میرے پاس کرایہ صرف بحرین تک کا ہی تھا اور جو پچیّس امریکی ڈالر تھے' وہ زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ راستے میں جہاں کوئی چھوٹا موٹا کام ملا کرلوں گا اور جب کرایہ جمع ہو گیا تو اگلے شہر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ میری منصوبہ بندی بہت اچھی اور منطقی تھی مگر راستے میں مجھے کیسے کیسے ہوش ربا واقعات پیش آئیں گے اور کیسے کیسے دشوار گذار جنگلوں سے مجھے اکیلے گذرنا پڑے گا' اس کا مجھے پورا احساس نہیں تھا۔ بحرین میں میرا ایک امرتسری دوست کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ کچھ روز اسی کے پاس رہوں گا۔ اس کی مدد سے بحرین میں کوئی جاب حاصل کروں گا اور تھوڑی بہت رقم جمع کر کے آگے چلوں گا۔

میرا روٹ یہ تھا:۔ بحرین سے بذریعہ بحری جہاز بصرہ جاؤں گا۔ بصرے سے بغداد' بغداد سے شام کے ملک میں داخل ہوں گا اور لبنان پہنچ جاؤں گا۔ لبنان سے بحری جہاز میں بیٹھ کر سیدھا اٹلی جانے کی کوشش کروں

گا۔ اگر اتنے لمبے سمندری سفر کا کرایہ مجھ سے نہ ہو سکا تو راستے میں رکتا ہوا اپنا سفر جاری رکھوں گا' یعنی لبنان سے سائپرس (قبرص) جاؤں گا۔ وہاں محنت مزدوری کر کے کرایہ جمع کروں گا اور "کریٹ" پہنچوں گا اور وہاں سے کسی جہاز میں سوار ہو کر اٹلی کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ پروگرام بنانے بڑے آسان ہوتے ہیں۔ لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تب جا کر پتہ چلتا ہے کہ جس ایک چیز کو ہم بہت آسان سمجھ رہے تھے' اس کی مشکلات کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

یہ سفرنامہ لکھنے کا میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جو نوجوان یہ ایڈونچر کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں' وہ میرے سفرنامے سے راہ نمائی حاصل کریں۔ اس طرح وہ ان مصیبتوں اور ناگہانی آفتوں سے محفوظ رہ سکیں گے جو مجھے اپنے پیدل سفر کے دوران قدم بقدم پیش آئیں۔

اب میں اپنا ہوش ربا رونگٹے کھڑے کر دینے والا سفرنامہ شروع کرتا ہوں۔ اسلام آباد سے اپنے پاسپورٹ پر اٹلی کا ویزا لگوانے کے بعد میں لاہور واپس آ گیا۔ یہ ٹورسٹ ویزا تھا اور اس کی مدت تین ماہ کی تھی۔ میں اٹلی میں اتنی دیر ہی ٹھہرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میرے نزدیک اٹلی میں رہ کر وہاں رومن ایمپائر کے کھنڈرات' وینس کی گلیاں جہاں نہریں بہتی تھیں' دیکھنا اور وینس کی کسی گولڈن بالوں والی لڑکی سے عشق کرنے کے لئے اتنی مدت کافی تھی۔ لاہور میں' میں نے کسی سے ذکر تک نہ کیا کہ میں اٹلی جا رہا ہوں۔ میرے وسائل محدود تھے۔ میں کسی سے قرض بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ کچھ رقم میں نے اس ایڈونچر کے لئے بچا کر رکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک روز میں تین کپڑوں میں گھر سے اٹلی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

مجھے دیکھ کر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ نوجوان لاہور سے اٹلی جارہا ہے۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ ایک ٹوتھ برش تھا۔ سیب کاٹنے والا چاقو اور ایک بٹوہ تھا جس میں میں نے لاہور سے بدلوائے ہوئے ڈالر اور پاسپورٹ رکھ کر اسے ایک رومال میں لپیٹ کر بنیان کے اندر کمر سے باندھا ہوا تھا۔ باقی اللہ کا نام تھا اور میں تھا۔ میں نے زندگی میں جتنے بھی ایڈونچر کئے' اسی بے سروسامانی کی حالت میں کئے تھے۔ سامان ساتھ رکھ کر ایڈونچر نہیں ہوتا۔ پھر آدمی سامان کو ہی سنبھالتا رہتا ہے۔ ٹرین نے مجھے کراچی پہنچادیا۔ کراچی میں اپنے ایک دوست کے فلیٹ میں ٹھہرا۔ اسے میں نے خط لکھ کر پہلے سے اطلاع کردی تھی کہ میں اٹلی جارہا ہوں۔ وہ مجھے سٹیشن پر لینے آیا ہوا تھا۔

پوچھنے لگا: "سامان کہاں ہے؟"

میں نے کہا: "کونسا سامان؟"

وہ حیران ہوکر مجھے تکنے لگا۔

"تو کیا ان تین کپڑوں میں اٹلی جاؤ گے؟"

کہا: "کیا آدمی تین کپڑوں میں اٹلی نہیں جاسکتا؟"

بہرحال وہ میری طبیعت سے واقف تھا۔ کہنے لگا:

"تم جانو' تمہارا کام۔"

کراچی میں میرے اسی دوست کا کاروبار تو چھوٹا سا تھا مگر اسکی واقفیت بہت تھی۔ اس نے دو تین روز کی تگ و دو کے بعد کراچی سے بحرین جانے والے ایک بحری جہاز کے ڈیک کی ٹکٹ دلوادی۔ وہ مجھے جیٹی تک چھوڑنے آیا۔ جب میں نے اسے خدا حافظ کہا تو وہ مجھ سے بغل گیر ہوگیا اور

بولا:

"دوست! کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا۔ اپنا خیال رکھنا۔"

میں مسکرا دیا۔ بحری جہاز کے بندر گاہ سے روانہ ہونے میں ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میرا دوست چلا گیا۔ میں جہاز کے ڈیک پر آکر ٹہلنے لگا۔ بحرین جانے والے مسافر اپنا اپنا سامان ڈیک پر لگا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر مزدور پیشہ محنت کش لوگ تھے۔ عورتیں اور بچے بھی ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ میں لوئر ڈیک میں آگیا۔ یہاں جہاز کی چھوٹی سی کینٹین تھی۔ میں نے کینٹین میں بیٹھ کر چائے پی۔ جہاز پر میرا کوئی واقف نہ تھا۔ کچھ دیر اکیلا کینٹین میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ پھر اوپر ڈیک پر آگیا۔ جہاز لنگر اٹھا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جہاز کے انجن چلنے لگے۔ ان کی تھرتھراہٹ، میں ڈیک کے لکڑی کے فرش پر محسوس کر رہا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی سمندری جہازوں میں سفر کر چکا تھا۔ جہاز رک رک کر وسل دے رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کراچی کی بندر گاہ کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ یہ منظر مجھے ہمیشہ بڑا اچھا لگا تھا۔ میں ڈیک کے جنگلے پر جھک کر کھڑا جہاز کو آہستہ آہستہ جیٹی کے پشتے سے پیچھے ہٹتے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے اور بندر گاہ کے درمیان سمندر کا نیلا پانی حائل ہو رہا تھا۔ یہ فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ جہاز جب کراچی کی بندر گاہ سے کافی آگے آگیا تو اس نے اپنا رخ مغرب کی طرف پھیرا اور کھلے سمندر کی جانب اپنا سفر شروع کر دیا۔

سمندر کا یہ سفر بھی کٹ گیا اور جہاز گلف کے خوبصورت جزیرے بحرین کی بندر گاہ پر پہنچ گیا۔ یہاں بھی میرا بحرین والا دوست مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی سب سے پہلا سوال یہی کیا:

"سامان کہاں ہے؟"

جب اسے معلوم ہوا کہ میں بغیر سامان کے، سفر کر رہا ہوں تو وہ بھی بڑا حیران ہوا۔ میرے اس بحرین والے دوست نے میری بڑی مدد کی۔ اس نے مجھے ایک نائیلون کا بنا ہوا سفری تھیلا اور ضرورت کی کچھ چیزیں بھی خرید کر لے دیں۔ یہ تھیلا سیاح لوگ سفر کرتے ہوئے اپنی کمر پر باندھ لیتے ہیں۔ کہنے لگا:

تم جس ملک میں جا رہے ہو، وہاں سخت سردی پڑتی ہے، یہ ٹھنڈی جیکٹ تمہارے کام نہیں آئے گی وہاں۔"

اس نے مجھے نائیلون کے فوم والی گرم جیکٹ بھی لے دی جو زپ لگا کر گلے تک بند ہو جاتی تھی۔ اس جیکٹ کے ساتھ ایک گرم ٹوپی بھی تھی جس کے پہننے سے کان ڈھک جاتے تھے۔ ایک گرم پتلون بھی خرید کر دی۔ میرے پاس خرچ وغیرہ کر کے بیس ڈالر باقی رہ گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنی طرف سے مزید بیس ڈالر دے دیئے۔ میں نے اسکا شکریہ ادا کیا۔ دوست واقعی وہی ہوتا ہے جو مشکل میں دوست کے کام آئے۔

میرے پاسپورٹ پر اٹلی کے علاوہ شام، سائپرس، سسلی کے ویزے بھی لگے ہوئے تھے۔ چونکہ یہی میرا روٹ تھا، اس لئے میں نے اسلام آباد میں اطالوی سفارت خانے سے ان ملکوں کے خاص طور پر ویزے لگوا لئے تھے۔ دو تین دن میں بحرین میں اپنے دوست کے پاس رہا۔ پھر اس نے مجھے بصرہ جانے والے بحری جہاز میں بٹھا دیا۔ یہاں سے مجھے بغداد جانا تھا۔ میرے دوست نے مجھے راستے کے بارے میں ساری معلومات گوش گذار کر دی تھیں۔ وہ ان ملکوں میں کافی سفر کر چکا تھا۔ چنانچہ بصرے پہنچ کر میں اپنے

دوست کے بتائے ہوئے تیسرے درجے کے ایک ہوٹل میں آگیا۔ یہاں میں نے ایک گندے مندے کمرے میں رات بسر کی اور ساری رات مچھروں سے لڑتا رہا۔ دوسرے دن میں کویت کی سرحد پار کر کے عراق میں داخل ہو گیا۔ عراق کی قدیم تہذیب کے بارے میں میں نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ یہ بابل کے بادشاہ مموربتی کی سرزمین تھی۔ جہاں کبھی ایک چاہ بابل ہوا کرتا تھا۔ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے اپنی چہیتی بیوی کے لئے اپنے محل کی چوتھی منزل پر معلق باغات لگوائے تھے۔ اس کی وجہ یورپ کے مورخین نے یہ لکھی ہے کہ بخت نصر شاہ بابل کی اس بیوی کا تعلق میڈیا کے علاقے سے تھا جو ایک سرد علاقہ تھا۔ عراق کی سخت گرمی میں ملکہ پریشان ہوگئی۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کی خاطر محل کی چھت پر باغات لگوائے جہاں بڑے گنجان درخت تھے اور ان باغات کو پانی نیچے سے اوپر سپلائی کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں یہ انجینئرنگ کا ایک کمال تھا۔ میں سارے بغداد میں اور اس کے قرب و جوار میں گھوما پھرا۔ مجھے چاہ بابل اور بخت نصر کے معلق باغات والا محل کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس عالی شان محل اور چاہ بابل کے اب کھنڈر بھی باقی نہیں تھے۔ صحرا کی ریت نے بابل کے شاہی محلات کو نگل لیا تھا۔ جہاں کبھی ان شان و شوکت والے بادشاہوں اور نازک اندام بستر کمخواب پر سونے والی شہزادیوں کی خواب گاہیں ہوا کرتی تھیں، وہاں اب ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

بغداد کے چھتے ہوئے بازار رات کے وقت ضرور الف لیلیٰ کی داستانوں کی یاد دلاتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے خلیفہ ہارون الرشید کے بغداد کا زمانہ زندہ ہو گیا، جب اس شہر کو حقیقی معنوں میں عروس البلاد کہا جاتا تھا۔ یہاں بیٹھ کر مسلمان سائنس دانوں نے طب، فلسفہ، فزکس، جغرافیہ،

کیمیا، فلکیات اور ریاضی کے علوم میں حیرت انگیز ریسرچ کی اور ایسی شمعیں روشن کیں کہ جن کی روشنی میں یورپ نے نشاۃ ثانیہ کی راہیں تلاش کیں۔ کس قدر جلیل القدر تھے وہ مسلمان سائنس دان کہ جن کی دکھائی ہوئی روشنی آج بھی یورپ کے سائنس دانوں کی راہ نمائی کر رہی ہے۔ اور ان کی کتابوں کے تراجم آج بھی یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ الف لیلیٰ اس شہر بے مثال کا ایک ایسا کارنامہ تھا کہ جس نے بغداد کو دنیائے ادب میں ایک کلاسیکی حیثیت کا حامل بنادیا۔

مگر آج کا بغداد پرانے بغداد سے کافی مختلف تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی ہر طرف امن تھا۔ لبنان میں بھی خانہ جنگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ عراق پر صدر صدام حسین امن چین سے حکمران تھے۔ ایران کے ساتھ ان کی سیاسی چپقلش ضرور چل رہی تھی مگر جنگ تک نوبت نہیں پہنچی تھی۔ میں بہت سوچ سمجھ کر پیسے خرچ کر رہا تھا۔ کیونکہ ان ممالک میں مجھے کسی جاب کے ملنے کی توقع نہیں تھی۔ میں ایک سرائے نما تھرڈ کلاس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جہاں ایک حویلی نما ہال کمرے میں مجھے صرف ایک چارپائی رات کو سونے کے لئے مل گئی تھی۔

بغداد میں میں نے متبرک زیارات کا شرف بھی حاصل کیا۔ مقدس مزارات پر فاتحہ خوانی کی۔ بغداد کی سب سے بڑی مسجد میں جمعۃ المبارک کی نماز پڑھی اور خدا کے حضور پاکستان کے استحکام کے لئے دعائیں مانگیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے وطن سے باہر جاتے ہی اپنے وطن کی قدر و قیمت کا مجھے احساس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میرے ڈالر خرچ ہونا شروع ہو گئے تھے۔

اٹلی پہنچنے

تک میں کم از کم خرچ کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی یہ ممالک جن کے گلی کوچوں کی میں سیاحت کر رہا تھا' پاکستان کے مقابلے میں بڑے مہنگے تھے اور چیزیں پاکستان کے مقابلے میں نسبتاً مہنگی تھیں۔ مگر ایک بات ضرور تھی کہ چیزوں میں ملاوٹ بالکل نہیں تھی۔ بغداد کی تندوری روٹی بڑی لذیذ اور خالص تھی۔ دریائے دجلہ کے کنارے ایک معمولی سے ریستوران میں بیٹھ کر میں نے مچھلی کے کباب کھائے اور ان کا میٹھا اور گاڑھا قہوہ بھی پیا۔ یہاں شام کے وقت ایک گٹار نواز سے عربی گانے بھی سنے۔ یہ گٹار نواز موصل کا رہنے والا تھا اور بغداد کے ریستورانوں میں گٹار پر عربی گانے گا کر اور عربی گانوں کی دھنیں بجا کر اپنی روزی کماتا تھا۔

بغداد کو میں نے ایک دن صبح صبح الوداع کہا اور ملک شام کی طرف بذریعہ بس روانہ ہو گیا۔ ملک شام کے لوگوں کا رنگ عراقیوں کی نسبت زیادہ صاف اور گورا تھا۔

اس ملک کی تہذیب اور تاریخ بھی بہت پرانی ہے لیکن یہ ملک قدیم زمانے میں زیادہ تر بابل کے بادشاہوں کے زیر نگیں رہا ہے۔ یا پھر ساسانی شہنشاہوں نے اسے اپنے ملک فارس میں شامل کر لیا تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے شام کی تہذیب ایک وقت میں اپنے عروج پر تھی اور اس کے خود مختار بادشاہ پورے شرق الاوسط پر حکمرانی کرتے تھے۔ دمشق میں بڑے بڑے جلیل القدر مسلمان بادشاہوں نے بھی حکومت کی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے یہاں بیت الحکمت قائم کیا جہاں طب سمیت زندگی کے دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

آج کا دمشق ایک ماڈرن شہر ہے۔ یہاں بڑی بڑی عالی شان ماڈرن

ماڈرن عمارتیں ہیں۔ تعلیم عام ہے اور شامی خواتین مردوں کے دوش بدوش دفتروں، عدالتوں اور کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔

دمشق کے بعد میں لبنان کے شہر اور بندر گاہ بیروت میں آگیا۔ یہ شہر اس زمانے میں اپنی جاگتی روشن راتوں کی وجہ سے سارے یورپ میں مشہور تھا۔ ایک بار تو میری آنکھیں بھی اس شہر کی روشنیوں اور عیش پرستی کے ماحول کو دیکھ کر چکا چوند ہوگئیں۔ مگر میری منزل لبنان نہیں اٹلی تھی۔ بیروت میں ہر شے اتنی مہنگی تھی کہ میں سوچ سمجھ کر خرچ کر رہا تھا۔ میرے پاس صرف پندرہ ڈالر باقی رہ گئے تھے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میں صبح کافی کے ایک پیالے کے ساتھ ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے کھا کر ناشتہ کرتا۔ دوپہر کو کسی سستے سے سستے ریستوران میں جاکر ایک طرح سے چٹنی کے ساتھ روٹی کھالیتا اور رات کو بھی ایسا ہی کرتا۔ یہاں قدم قدم پر بیروت کے حسن جہاں سوز کی عشوہ طرازیاں میرا دامن کھینچ رہی تھیں۔ میں تو وہ آدمی ہوں کہ عشوہ طرازیاں میرا دامن نہ بھی کھینچتیں تو میں خود بخود ان کی طرف چل پڑتا مگر مجبور تھا۔ کیونکہ بیروت میں ڈالر کے بغیر عشق میسر نہیں آتا تھا۔ اور میں، چند ایک ڈالروں کو جو بچ گئے تھے، اٹلی کے لئے بچا کر رکھے ہوئے تھا۔ میں صرف اٹلی پہنچنا چاہتا تھا۔ اگر مجھے کوئی حماقت کرنی ہی تھی تو میں اٹلی پہنچ کر یہ حماقت کرنا چاہتا تھا۔

میری اگلی منزل سائپرس یعنی قبرص تھی جو بحیرہ روم میں ایک بہت بڑے جزیرے پر آباد ہے اور جہاں مسلمان ترکوں اور یونانیوں کی آبادی ہے۔ بیروت سے چھوٹے بڑے بحری جہاز سائپرس جاتے تھے۔ بعض بحری جہاز سسلی جاتے ہوئے راستے میں سائپرس رکتے تھے اور بعض سیدھے اٹلی

کے لئے روانہ ہوتے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بیروت سے اٹلی کے جنوبی شہر کی بندر گاہ تک کا بحری جہاز کے تھرڈ کلاس کا کرایہ اتنا ہے کہ میرے پاس اسکا تیسرا حصہ بھی نہیں ہے۔ سوچنے لگا کیا کروں؟ کسی مال بردار بحری جہاز میں اگر جگہ مل جائے تو جہاز پر کام مل جانے کی صورت میں پیسے بھی بچ جائیں گے۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اٹلی پہنچ کر میرے پاس چند ایک ڈالر ہی بچتے تھے۔ اتنی تھوڑی سی رقم اٹلی ایسے ملک میں داخل ہونے کے لئے ناکافی تھی۔ خاص طور پر جبکہ وہاں میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا اور مجھے کوئی جاب ملنے میں بھی دیر لگ سکتی تھی۔ بیروت میں بھی میرا کوئی واقف کار نہ تھا۔ میں جس چھوٹے سے ریستوران میں کھانا وغیرہ کھاتا تھا' اس کا مالک ایک مسلمان عراقی تھا۔ میں نے اس کو سارا ماجرا بیان کیا اور مدد چاہی۔ وہ کافی عرصے سے لبنان میں رہ رہا تھا۔ اس کی وساطت سے میں ایک عرب مکینک سے ملا جو بندر گاہ پر کام کرتا تھا۔ قصہ مختصر اس عرب نے مجھے ایک مال بردار بحری جہاز کے کیپٹن سے ملایا جس کو دیکھ کر مجھے بحری ڈاکو یاد آگئے۔ اس کے منہ میں سگار تھا۔ مجھے دیکھ کر کرخت لہجے میں بولا: "تم چوری تو نہیں کرتے؟"

یہ فقرہ اس نے انگریزی میں پوچھا تھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔ اس کے آگے کا ایک دانت غائب تھا۔ وہ جہاز کے ڈیک پر کھڑا یوں جھول رہا تھا جیسے پیئے ہوئے ہو۔ اس نے میری تلاشی لی۔ پاسپورٹ دیکھا۔ کہنے لگا: "اوکے' کل صبح صبح جہاز پر آجانا۔"

یہ مال بردار جہاز اٹلی کی جنوبی بندر گاہ ٹارنٹو جارہا تھا جو ایونین سمندر میں اٹلی کے جنوب میں واقع تھی۔ میں نے نقشے میں اٹلی کے تمام شہروں

کو دیکھ رکھا تھا۔ دوسرے روز میں صبح صبح جہاز پر پہنچ گیا۔ کیپٹن نے مجھے اسی وقت کچن میں کام پر لگادیا۔ میرا کام ڈش واشنگ اور کچن کی صفائی ستھرائی کرنا تھا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کیپٹن نے کہا تھا کہ کھانا وغیرہ تمہیں مفت ملے گا اور اٹلی پہنچ کر تمہیں تھوڑا بہت معاوضہ بھی دے دیا جائے گا۔ میں بہت خوش تھا کہ اٹلی بھی پہنچ جاؤں گا اور تھوڑی بہت رقم بھی میری جیب میں آجائے گی۔ یہ مال بردار جہاز دن کے وقت بیروت کی بندر گاہ سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ راستے میں جہاز نے رکنا تھا۔ سب سے پہلا سٹاپ سائپرس تھا۔ یہاں جہاز پورا ایک دن رکا رہا۔ کچھ سامان اتارا گیا۔ نیا سامان لادا گیا۔ جہاز کی اگلی منزل بحیرہ روم میں واقع یونان کا جزیرہ کریٹ تھا۔ کریٹ پہنچنے پر میں جہاز سے اتر کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ یہ وہ جزیرہ تھا جہاں یونانی تہذیب اور ڈرامے نے جنم لیا تھا۔ یہ جزیرہ سطح مرتفع پر آباد تھا۔

مکانوں کی تعمیر اور لوگوں کے چہروں سے یونانی تہذیب اور کلچر کے آثار صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ کریٹ سے روانہ ہو کر جہاز بحیرہ روم سے نکل کر شمال کی جانب ایونین سمندر میں داخل ہوگیا۔ یہ سمندر دنیا کی دو قدیم ترین تہذیبوں کے حامل ممالک یونان اور روم کے درمیان موجزن تھا۔ شمال کی جانب سے ایڈریاٹک سمندر کا پانی آکر ایونین اور بحیرہ روم کے پانیوں میں شامل ہو رہا تھا۔ میں سارا دن کچن میں برتن صاف کرتا۔ پھر کچن کے فرش پر گیلا جھاڑو لگاتا۔ رات کو تھک ٹوٹ کر وہیں کچن کے فرش پر سو جاتا۔ آخر ایک دن دوپہر کے بعد جہاز اٹلی کی بندر گاہ ٹارنٹو پہنچ گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

میں ڈیک پر کھڑا اٹلی کے نیلے آسمان کو تک رہا تھا۔ آسمان پر آبی

پرندے جہاز کے اوپر چکر لگا رہے تھے۔ سمندر کے نیلے پانیوں کو دیکھ کر مجھے معاً خیال آگیا کہ آج سے سینکڑوں برس پہلے یہاں نہ جانے کتنی بحری جنگیں لڑی گئی تھیں۔ یہی وہ سمندر ہے جہاں یونان کے مختصر سے بحری بیڑے نے ایران کے بہت بڑے بحری بیڑے کو شکست دے کر ایران کی بحری بالادستی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ میں اپنے تصورات میں گم تھا کہ پیچھے سے کسی نے بڑے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ یہ جہاز کا کپتان تھا۔ وہ اپنے مخصوص اجڈ لہجے میں بولا: "چلو نیچے اترو، تمہارا سفر یہاں ختم ہوتا ہے۔"

کیپٹن نے مجھے اپنی جیکٹ کی جیب میں سے پچاس امریکی ڈالروں کے نوٹ نکال کر دیئے اور کہا: "یہ تمہارے کام کی مزدوری ہے۔ چلو۔ اب بھاگ جاؤ۔"

میں نے کچن میں جاکر اپنا سفری تھیلا باندھ کر کمر پر ڈالا اور جہاز سے اتر گیا۔ اٹلی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میں نے گہرا سانس لیا۔ میرا خیال تھا کہ اٹلی کی فضاؤں میں سائپرس کے درختوں اور سرخ گلابوں کی خوشبو ہوگی۔ مگر ایسی بات نہیں تھی۔ بندرگاہ کی فضا میں تو ڈیزل کی بو رچی ہوئی تھی۔ اطالوی مزدور جہاز پر سے سامان اتار رہے تھے۔ میں بندرگاہ سے باہر آگیا۔ اٹلی میں یہ بہار کا موسم تھا۔ میں نے اپنے ایڈونچرس سفر کے لئے پوری معلومات حاصل کر کے وہ مہینہ چنا تھا جب اطالیہ میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔

یہ یورپ تھا اور میں اٹلی کے جنوبی ساحلی شہر میں کھڑا تھا۔ میرے سامنے دو رویہ سڑک تھی جس پر موٹر گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ اطالوی مرد اور عورتیں کھلے موسم کے لباس میں فٹ پاتھ پر تیز تیز قدموں سے چلے جا رہے

تھے۔ عورتیں بڑی خوبصورت تھیں۔ کسی کے بال سنہری تھے تو کسی کے سیاہ تھے۔ رنگ سب کے گورے تھے۔ میں ابھی کسی سنہری بالوں والی اطالوی دوشیزہ سے عشق کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ویسے بھی مجھے وینس پہنچنا تھا جو ملک کے شمال میں کافی فاصلے پر ایڈریاٹک سمندر میں واقع تھا۔ پچاس امریکی ڈالر بحری جہاز پر تھرڈ کلاس میں سفر کرنے لئے بہت تھے۔ مگر میں دو ایک روز ٹارنٹو شہر میں رک کر اس کر شہر کی سیر و سیاحت کرنا چاہتا تھا۔

میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہاں ایک بہت بڑی مصیبت میرا انتظار کر رہی ہے۔ ایک ریستوران میں بیٹھ کر میں نے بلیک کافی پی۔ کافی کا ذائقہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میرے پاس امریکن سگریٹ تھے جو میں نے جہاز پر ہی خریدے تھے۔ کھانا بھی میں نے جہاز پر کھالیا تھا۔ یوں میں نے دوپہر کے کھانے کے پیسے بچا لئے تھے۔ کافی دیر تک میں ٹارنٹو شہر کی سڑکوں اور پارکوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ شہر کی عمارتیں جدید بھی تھیں اور پرانی عمارتیں بھی جگہ جگہ نظر آرہی تھیں۔ چھوٹی سڑکوں پر دونوں جانب اونچے اونچے پرانے ٹائپ کے چھجوں والے مکان تھے جن کے درمیان لوہے کے تار باندھ کر وہاں عورتوں نے گیلے کپڑے سکھانے کے لئے ڈال رکھے ہوئے تھے۔ یہ منظر میں نے اطالوی فلموں میں بھی دیکھا ہوا تھا۔

رات میں نے بندر گاہ کے پاس ہی ایک سرائے نما ہوٹل میں بسر کی۔ رات کا کرایہ ایک ڈالر تھا۔ بحری جہاز کے سفر نے اور کچن میں ڈش واشنگ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ چنانچہ ساری رات سویا رہا۔ صبح آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ بڑی سڑک پر سے ٹرام کے گذرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ نیچے آکر ریستوران کی ٹوٹی پھوٹی کرسی

پر بیٹھ کر ناشتہ کیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے وینس پہنچنے کے لئے کون سا روٹ اختیار کرنا چاہئے۔ بحری جہاز کا ٹارنٹو سے وینس تک کرایہ بہت زیادہ تھا۔ بس پر سفر کرتے ہوئے بھی مجھے تین چار دن لگ جاتے اور بسوں کا کرایہ بھی اٹلی میں بہت زیادہ تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہچ ہائکنگ کی جائے۔ یعنی بڑی شاہرہ پر پیدل چلنا شروع کر دوں۔ ہائی وے پر گذرتی ہوئی موٹر گاڑیوں' ٹرکوں کو ہاتھ دیتا جاؤں' کوئی نہ کوئی تو مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا ہی لے گا۔ اس طرح اٹلی کی وادیاں' جنگل اور راستے میں پڑنے والے سارے شہر اور قصبے بھی دیکھ لوں گا اور کرایہ خرچ کئے بغیر وینس پہنچ جاؤں گا۔

یہ پروگرام مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے وقت دیکھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ سڑکوں پر سائن بورڈ اطالوی زبان میں لکھے ہوئے تھے' مگر میں اپنا مطلب نکال لیتا تھا۔ میں ریستوران سے نکل پڑا۔ سفری تھیلا میں نے پیٹھ پر باندھ رکھا تھا جو بڑا ہلکا تھا۔ اس میں ایک گرم کمبل اور قمیص' پتلون کی سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ گرم کمبل مجھے مال بردار جہاز کے کیپٹن نے بطور تحفہ دیا تھا جو بہت عمدہ قسم کا تھا۔ رات کو ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ میں یہی کمبل اوڑھ کر سوتا تھا۔ میں اندازے سے شمال کی طرف سڑک کے فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ ہائی وے کا حدود اربعہ میں نے ہوٹل والوں سے ہی پوچھ لیا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے بھی میں نے ایک دو آدمیوں سے پوچھ لیا تھا۔ آخر میں شہر کے باہر سے گذرتی ہائی وے پر آ گیا۔ یہ کافی چوڑی سڑک تھی۔ چار لین تھی۔ دو شمال کی طرف اور دو جنوب کی طرف جاتی تھیں۔ میں ہائی وے سے تھوڑا ہٹ کر شمال کی طرف چل پڑا۔ میں بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا کہ اگر مجھے لفٹ ملنے میں دیر بھی ہو جائے تو تھکاوٹ نہ ہو۔ پیچھے سے گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے

آرہی تھیں اور شوں کی آواز کے ساتھ آگے نکل جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس سے لفٹ مانگوں۔ انگریزی فلموں میں 'میں نے لفٹ لینے کا طریقہ دیکھا ہوا تھا۔ مگر میں ابھی پیدل ہی چلنا چاہتا تھا۔ جب میں شہر سے کافی دور نکل آیا اور سرسبز وادیوں اور چھوٹے چھوٹے سرسبز ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو میں سڑک کے کنارے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ جو گاڑی آتی 'میں ہاتھ کا مخصوص اشارہ کرتا' جس کا مطلب تھا کہ میں ٹورسٹ ہوں۔ اور مجھے اگلے پڑاؤ تک کے لئے لفٹ چاہئے۔ کسی نے پروا نہ کی۔ گاڑیاں پیچھے سے آکر گذرتی رہیں۔ میرا ہاتھ تھک گیا۔ میں نے دل میں ان گاڑیوں والوں کو پنجابی میں گالیاں دیں اور پیدل ہی چلنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی۔ ہو سکتا ہے یہاں سیاحوں کو لفٹ دینے کا رواج ہی نہ ہو۔ میں کہاں تک پیدل چل سکوں گا۔ میں سڑک کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

ابھی میں ٹارنٹو شہر سے اتنی دور نہیں آیا تھا کہ واپس نہ جاسکوں۔ سوچنے لگا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بحری جہاز میں سفر کرتا' پیسے خرچ ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ کم از کم پیدل چلنے سے تو نجات مل جائے گی۔ آخر میں کب تک اور کہاں تک پیدل چل سکوں گا۔ کہیں بیمار پڑ گیا تو یہاں تو کوئی پرسان حال بھی نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور واپس چلنے لگا۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ دور سے ایک بہت بڑا ٹرک آتا نظر آیا۔ میں نے رک کر یونہی اسے اشارہ کیا۔ ٹرک میرے قریب سے گذر گیا۔ میں ٹرک ڈرائیور کو گالی دینے ہی والا تھا کہ ٹرک تھوڑی دور جاکر رک گیا۔ میں بڑا خوش ہوا اور ٹرک کی طرف دوڑ پڑا۔ ٹرک ڈرائیور ایک بھاری جسم والا

اطالوی بوڑھا تھا جس کی ڈاڑھی کے سفید بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے سر پر کالی کمانڈوز والی ٹوپی ترچھی کر کے جمائی ہوئی تھی۔ منہ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ سامنے لگے شیشے میں سے اس نے مجھے آتا دیکھ کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ میں ٹرک پر چڑھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور انگریزی میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ بوڑھے ٹرک ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا۔

ٹرک آگے چل پڑا۔ کچھ دور جا کر ٹرک ڈرائیور نے کہا: "میرا نام اولتارو ہے۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ وہ چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد بولا: "تم انڈین ہو؟"

میں نے کہا: "نہیں میں پاکستانی ہوں۔"

وہ شکستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پاکستان کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ پاکستان ایک آزاد اسلامی ملک ہے جو انڈیا کے شمال میں واقع ہے۔ ساتھ ہی میں نے اسے تھوڑا سا سیاسی پس منظر بھی بتایا۔ وہ بے توجہی سے سنتا رہا۔ اس نے آگے سے کوئی بات نہ کی۔ ٹرک ایک خاص رفتار سے ہائی وے پر چلتا رہا۔ کافی وقفے کے بعد اولتارو نے کہا: "میں سان مارینو جا رہا ہوں۔ تم کہاں جاؤ گے؟"

"وینس۔" میں نے جواب دیا۔

ٹرک ڈرائیور نے سگریٹ کھڑکی کے باہر پھینک کر کہا: "سان مارینو تک بڑا لمبا سفر ہے۔ میں تمہیں رات کو اپنے ٹرک پر سونے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

میں نے کہا: "کوئی بات نہیں، میں کسی درخت کے نیچے سو جاؤں گا۔

میرے پاس کمبل ہے۔"

وہ "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ایک ساحلی شہر آیا جس کا نام BARI تھا۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ یہاں وہ دو گھنٹے رکے گا۔ میں نے پوچھا: "کیا میں ٹرک سے دور چلا جاؤں؟"

وہ ہنس پڑا۔ اس کے دانت کالے ہو رہے تھے۔ کہنے لگا: "نہیں، تم چاہو تو ٹرک میں ہی بیٹھے رہو۔ چاہو تو 'باری' شہر کی سیر کرو۔"

باری ایک پہاڑی قصبے کی قسم کا شہر تھا۔ پہاڑی کے دامن میں اور ڈھلانوں پر سرخ چھتوں والے مکان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ٹرک ایک منڈی میں جا کر رکا تھا جہاں بڑا شور تھا۔ میں ٹرک سے اتر آیا۔ ادھر ادھر پھرنے لگا۔ بوڑھے ڈرائیور نے مجھے بتا دیا تھا کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد آجانا، نہیں تو میں تمہارے بغیر ہی چل پڑوں گا۔ میں یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے سان مارینو تک مفت سفر کرنے کا بڑا سنہری موقع مل گیا ہوا تھا۔ چنانچہ میں ٹرک کے آس پاس ہی منڈی کے گوداموں اور کوارٹروں کے آس پاس ہی پھرتا رہا۔ پھر ایک گھٹیا سے ریستوران کے باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اطالوی بیرے نے آکر اطالوی زبان میں پوچھا کہ مجھے کیا چاہئے۔ الفاظ میری سمجھ میں نہ آئے لیکن ظاہر ہے اس نے یہی پوچھا ہو گا۔ میں نے کہا: "کافی۔"

وہ واپس چلا گیا۔ پھر ایک مگ میں کافی بھر کر لے آیا اور میز پر زور سے رکھ کر چلا گیا۔ کافی بلیک تھی۔ میرا دل دودھ والی کافی پینے کو چاہ رہا تھا۔ مگر مجھے اطالوی زبان میں دودھ کے لئے جو لفظ تھا، وہ معلوم نہیں تھا۔ بیرا ایک بار میرے قریب سے گذرا تو میں نے ملک کا نام لیا۔ وہ ہنس کر آگے

نکل گیا۔ خدا جانے وہ کیا سمجھا تھا' کیونکہ اس کے بعد وہ دودھ لے کر بالکل نہ آیا۔

اسی طرح وقت گذر گیا۔ میں نے اطالوی سگرٹوں کا ایک پیکٹ خریدا۔ یہ سگریٹ بڑے سستے تھے اور بڑے سخت تھے۔ شاید اسے بندر گاہوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور پیتے تھے۔ ایک کش لگایا تو نانی یاد آگئی۔ میں آدھا گھنٹہ پہلے ٹرک کی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ ٹرک ڈرائیور ٹرک کا پچھلا دروازہ کھولے لکڑی کی پیٹیاں اتروا رہا تھا۔ اور نئے کریٹ لدوا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ٹرک "باری" شہر سے روانہ ہوا۔ یہ سارے کا سارا پہاڑی علاقہ تھا۔ اور ٹرک پہاڑی ٹیلوں کا چکر کاٹ کر جارہا تھا۔ شام کے سائے پھیلنے شروع ہوگئے۔ سردی محسوس ہونے لگی۔ مگر میری جیکٹ نے مجھے کافی حد تک سردی سے بچایا ہوا تھا۔ پھر سورج شمالی اٹلی کی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہوگیا اور وادیوں میں اندھیرا چھاگیا۔ ٹرک کی ہیڈ لائیٹس روشن ہوگئیں۔

ٹرک سڑک پر چلتا گیا۔ کوئی آدھی رات کے قریب راستے میں ایک قصبہ آیا جہاں ڈرائیور نے ٹرک ایک چھوٹے سے اڈے کے احاطے میں کھڑا کر دیا۔ میری طرف دیکھ کر بولا: "سینور! یہاں میں رات ٹھہروں گا۔ تم جہاں چاہو' جاکر سو جاؤ۔ میں ٹرک لاک کر رہا ہوں۔"

میں ٹرک سے اتر گیا۔ میں نے دوسری طرف جاکر ڈرائیور سے پوچھا کہ وہ صبح کس وقت روانہ ہوگا۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں صرف اتنا کہا: "دس بجے آجانا۔"

وہاں قریب ہی ایک پٹرول پمپ تھا جہاں بڑی روشنی ہو رہی تھی۔

رات کے وقت کافی ٹھنڈ ہوگئی تھی۔ اگرچہ یہ بہار کا موسم تھا مگر معلوم ہوا کہ یورپ میں موسم بہار میں بھی راتیں کافی سرد ہوتی ہیں۔ میں رات گذارنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ ایک طرف مجھے ایک کاؤنٹر سا بنا ہوا نظر آیا۔ یہ شاید کسی سبزی یا پھل فروش کا کاؤنٹر تھا۔ ٹریش میں سے باسی سبزیوں کی بو آرہی تھی۔ کاؤنٹر لکڑی کا تھا جس کے پیچھے کھڑے ہونے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ یہ کوئی دو فٹ چوڑی اور سات فٹ لمبی جگہ تھی۔ یہاں ہلکی ہلکی گرمائش بھی تھی۔ سونے کے لئے اس سے بہتر جگہ مجھے اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے تھیلے میں سے کمبل نکالا۔ تھیلے کا تکیہ بنایا۔ کمبل اوپر لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ میری آنکھوں میں لاہور شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں کی تصویریں پھرنے لگیں۔ لاہور کی یاد نے نیند غائب کردی۔ مگر میرے سر پر وینس شہر دیکھنے اور وہاں کی کسی سنہری بالوں والی لڑکی سے رومانس لڑانے کا بھوت سوار تھا۔ میں کیسے ابھی لاہور واپس جاسکتا تھا۔ پس لاہور کے خیال کو دل سے نکال دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی میں غنودگی کے عالم میں ہی تھا کہ اچانک کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے سوچا کوئی چوکیدار قسم کا آدمی ہوگا' گذر جائے گا۔ مگر قدموں کی آواز کاؤنٹر کے پاس آکر رک گئی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اوپر دیکھا کہ اچانک کسی نے میرے اوپر کمبل پھینک دیا۔ ابھی میں سنبھل ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے اوپر چھلانگ لگادی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جو میرے اوپر گرا تھا وہ بھی گھبرا گیا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ یہ ایک عورت تھی۔

وہاں اتنا بھی اندھیرا نہیں تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی جلدی سے پیچھے ہٹی اور کسی اجنبی زبان میں مجھے کچھ کہنے لگی۔ میں نے انگریزی میں سوری کہی تو وہ مسکرائی اور پھر زور سے ہنس پڑی۔ یہ ایک لڑکی تھی جس کی آنکھیں نیم اندھیرے میں برنٹوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے سیاہ لمبے بال کھلے تھے۔ ماتھے پر اس نے ایک پٹی باندھی ہوئی تھی۔ بدن پر جیکٹ اور جینز تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا:

"میں سمجھی تھی یہ جگہ خالی ہے۔ میں ٹورسٹ ہوں۔ میرا نام ہلڈا ہے۔ میں انڈیا سے آرہی ہوں۔ واپس برلن جارہی ہوں۔ کیا تم بھی ٹورسٹ ہو؟"

اس جرمن ٹورسٹ کا ایک پہلو میرے جسم کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اسکے جسم کی گرمی مجھے سکون بخش رہی تھی۔ میں نے کہا:

"میں ٹورسٹ ہوں' وینس جارہا ہوں' پاکستان سے آیا ہوں۔"

"پاکستان؟" وہ بے اختیار پکار اٹھی۔ "میں نے وہاں سیر کی ہے۔ اوہ گاڈ۔ بیوٹی فل لوگ۔"

وہ اپنا کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹتی ہوئی کہنے لگی:

"کیا میں تمہارے ساتھ یہاں سو جاؤں' میرا مطلب ہے تمہیں کوئی

اعتراض تو نہیں؟"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے خوش ہو کر کہا:

"بے شک۔ سو جاؤ۔"

وہ جمائی لے کر بولی:

"میں بہت تھک گئی ہوں۔"

اور وہ میری ٹانگوں کی طرف سرک کے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اسکا آدھا جسم میرے آدھے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ وہ سو گئی تھی مگر میری نیند اڑ چکی تھی۔ خدا جانے کس وقت رات کو مجھے بھی نیند آگئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب دھوپ کاؤنٹر کے اوپر پھیل چکی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ میں کمبل اور تھیلا سمیٹ کر کاؤنٹر پر آگیا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ کچھ فاصلے پر جو ہائی وے تھی۔ اس پر گاڑیاں شوں شوں کرتی گذر رہی تھیں۔ پٹرول پمپ کی طرف ایک جگہ دو تین عورتیں کھڑی شاید کسی بس کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے سروں پر رنگ برنگے ریشمی رومال باندھے ہوئے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے کمبل تہہ کر کے تھیلے میں رکھا۔ تھیلا کاندھے پر لٹکایا اور اس طرف چل پڑا جہاں بوڑھے ڈرائیور نے رات کو اپنا ٹرک کھڑا کیا تھا۔ ٹرک اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ ڈرائیور غائب تھا۔

میں نے ٹرک کے گرد ایک چکر لگایا۔ ٹرک کی دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ پٹرول پمپ کے ساتھ ہی ایک باتھ روم تھا جہاں ایک دروازے پر مرد کے جوتے کی اور دوسرے دروازے پر عورت کے سینڈل کی تصویر بنی ہوئی

تھی۔ مجھے پاکستان ریلوے کے دیہاتی ریلوے اسٹیشنوں کے باتھ روم یاد آگئے جو ٹین کی چادروں کے بنے ہوتے تھے اور جہاں عورتوں والے باتھ روم کے باہر ایک عورت کی تصویر بنی ہوتی تھی جس نے ہاتھ میں جھاڑو پکڑ رکھا ہوتا تھا' اسی طرح مرد والے حصے میں مرد کی تصویر بنی ہوتی تھی اور مرد کے ہاتھ میں بھی جھاڑو تھمایا گیا ہوتا تھا۔ میں مسکراتا ہوا مردانہ باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ باتھ روم میں ایک زنگ آلود ٹب بھی تھا۔ اس میں بیٹھ کر جس طرح سے بھی نہا سکتا تھا' نہایا۔ شیو بنائی۔ تھیلے میں سے دوسری قمیض اور جینز نکال کر پہنی اور واپس اپنے ٹرک کے پاس آگیا۔ میری آنکھیں ڈرائیور کے علاوہ اس جرمن ٹورسٹ لڑکی کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں جس نے میری ساری رات برباد کر دی تھی مگر وہ تو جیسے کسی چڑیل کی مانند غائب ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی چڑیل ہو۔ اسکا مطلب ہے کہ اٹلی میں بھی چڑیلیں ہوتی ہیں اور خوبصورت لڑکیوں کا روپ بدل کر ملنے آتی ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اٹلی کی سنہری بالوں والی لڑکی اگر چڑیل کے روپ میں بھی میرے پاس آجائے تو میں اسے جانے نہیں دوں گا۔ میں بھی بھوت بن جاؤں گا۔ ہم لوگ آدھے بھوت تو پہلے ہی ہوتے ہیں۔

پٹرول پمپ کے پاس ہی ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ میں نے وہاں پیزے اور کافی کا ناشتہ کیا۔ سگریٹ سلگا کر ٹائم دیکھا۔ ابھی دس نہیں بجے تھے۔ بوڑھے ٹرک ڈرائیور نے مجھے دس بجے آنے کو کہا تھا۔ مگر ٹرک ڈرائیور اطالوی نہیں تھا شاید۔ یا شاید اطالوی ہی تھا۔ ابھی میں اس کی قومیت کا تعین نہیں کر پایا تھا کہ وہ مجھے ایک طرف سے سگریٹ پیتا بھالو کی طرح چلتا نظر آگیا۔ میں دوڑ کر ٹرک کے پاس آگیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور مسکرایا۔

بولا کچھ نہیں۔ ٹرک میں بیٹھنے کا اشارہ ہی کیا۔ اپنی کھڑکی کی طرف سے ٹرک میں داخل ہونے کے بعد اس نے میری کھڑکی کو کھول دیا۔ میں ٹرک کے بمپر پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ کر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کیا۔ گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور ریس دینے لگا۔ جب انجن اس کی مرضی کے مطابق گرم ہو گیا تو ٹرک کو چلا دیا۔

اس طرح راستے میں ہمیں ایک اور رات بسر کرنی پڑی۔ دوسری رات میں نے ٹرک کی چھت کے اوپر لیٹ کر گذاری۔ اس کی میں نے خاص طور پر منت سماجت کر کے ڈرائیور سے اجازت لے لی تھی۔ رات کو سردی بھی تھی اور اوس بھی پڑ رہی تھی مگر کمبل بڑا گرم تھا۔ اس نے مجھے سردی سے بچائے رکھا۔ تیسرے دن شام کے وقت ہمارا ٹرک سان مارینو پہنچ گیا۔ یہاں ٹرک ڈرائیور مجھ سے جدا ہو گیا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا:

"یہاں سے آگے تم بلوگنا جاؤ گے۔ بلوگنا سے وینس تک سٹیمر چلتے ہیں۔ سٹیمر میں سفر کرنا۔ اور ہاں اب تم اٹلی میں ہو۔ ہوشیار ہو کر چلنا پھرنا۔ یہاں تمہارے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے۔"

بوڑھا ڈرائیور ہنستا ہوا ٹرک میں بیٹھ کر سان مارینو شہر میں داخل ہو گیا۔ میں شہر کے پرانے دروازے کے باہر ایک سنگی مجسّمے کے پاس کھڑا تھا۔ یہ کافی بڑا شہر تھا۔ ہر طرف ماڈرن بلڈنگیں تھیں۔ شہر کا چوک نیون سائن اور سٹریٹ لائٹس کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ شہر کی روشن روشن سڑکوں پر خوش لباس عورتیں اور مرد تیز تیز قدموں سے آجا رہے تھے۔ سکوٹر اور گاڑیاں وغیرہ بھی چل رہی تھیں۔ ایک خالی ٹیکسی میرے قریب سے گذر گئی ۔ عورتوں کا حسن زیادہ تر مشرقی تھا۔ یعنی اکثر عورتوں اور لڑکیوں کے بال سیاہ

اور آنکھیں بھی سیاہ تھیں۔ رنگ اگرچہ گورے تھے۔ مجھے قدیم رومن ایمپائر کا دور یاد آگیا۔ مگر اٹلی کے اس ماڈرن شہر میں رومن ایمپائر کے زمانے کی کوئی بھی نشانی باقی نہیں تھی۔ یہاں صرف ایک شکستہ پرانا دروازہ تھا جو بھاٹی گیٹ کے دروازے سے ملتا جلتا تھا اور جس کے محرابی ستون کے پاس میں کچھ حیران کچھ پریشان کھڑا تھا۔ پریشان اس لئے کہ مجھے خیال آنے لگا تھا کہ اتنے ماڈرن شہر میں مجھے رات بسر کرنے کے لئے کوئی سستا ہوٹل کہیں نہیں ملے گا۔ نیون سائن کئی کمپنیوں کے تھے ان میں شراب اور کوکا کولا کے نیون سائن سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ بھڑکیلے تھے۔ دو لڑکیاں جو نیم عریاں لباس میں تھیں اور گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔ میرے قریب سے گذریں تو انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ایک لڑکی نے ہاتھ سے کچھ اشارہ بھی کیا۔ مگر دونوں میں سے کسی لڑکی کے بھی بال سنہری نہیں تھے اور یہ وینس کی لڑکیاں نہیں تھیں۔

میں روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے فٹ پاتھ پر ایک طرف چل پڑا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اس فیشن ایبل خوش پوش علاقے کے آگے مڈل کلاس کے لوگوں کی کوئی بستی ہو جہاں مجھے سستا سا ہوٹل مل جائے اور میں رات بسر کرلوں۔ چلتے چلتے میں ایک پارک کے قریب سے گذرا تو رک گیا۔ پارک بالکل خالی تھا۔ کیونکہ رات ہوگئی تھی اور اوس گرنے لگی تھی جس کی وجہ سے موسم سرد ہو گیا تھا۔ پارک کا گیٹ بند تھا۔ مجھے دور لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ایک خالی بنچ نظر آگیا۔ یہ جگہ رات بسر کرنے کے لئے موزوں تو نہیں تھی مگر پارک میں کوئی دوسری جگہ بھی میسر آسکتی تھی۔ میں ایک جگہ سے گارڈینیا کی باڑ پھلانگ کر پارک میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ درختوں کا

جھنڈ تھا۔ یہاں اوس نہ گرنے کی وجہ سے فضا میں کچھ گرماہٹ تھی۔ ایک خالی بنچ بھی تھا۔ یہ رات بسر کرنے کے لئے آئیڈیل جگہ تھی۔ میں نے بنچ کا انتخاب کرلیا اور واپس چوک میں آگیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ جگہ جگہ ریستوران تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ یہاں مجھے سستا کھانا نہیں ملے گا۔ میں سڑک پار کر کے دوسرے فٹ پاتھ پر آیا تو ایک جگہ بڑی سی چھتری تانے ایک آدمی برگر بیچ رہا تھا۔ میری روح خوش ہوگئی۔ یہ اطالوی برگر تھے۔ جس کی تعریف میں نے بہت سن رکھی تھی۔

برگر واقعی بڑے لذیذ تھے اور سستے بھی تھے۔ میں نے خوب مزے لے لے کر برگر کھائے۔ وہاں کافی بھی چلتی تھی۔ کافی کا ایک مگ پیا۔ سگریٹ سلگایا اور ٹہلتا ٹہلتا پارک کی باڑ کے پاس آکر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی چوکیدار تو نہیں مجھے دیکھ رہا۔ جب وہاں مجھے کوئی گارڈ نظر نہ آیا تو میں باڑ پھلانگ کر پارک میں داخل ہوگیا۔ سیدھا درختوں کے نیچے خالی بنچ پر آکر تھیلے کا تکیہ بنایا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ کہتے ہیں رات کو درختوں کے نیچے نہیں سونا چاہیے۔ مگر میں پردیس میں تھا اور بے سروسامانی کے عالم میں سفر کر رہا تھا۔ درختوں کے نیچے زیادہ سردی نہیں تھی۔ مجھے جلدی نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو پارک میں سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک باوردی گارڈ میرے پاس آکر کہنے لگا۔

"میں نے تمہیں جگایا نہیں۔ تم ٹورسٹ ہو۔ ٹورسٹ ہمارے ملک کو زرمبادلہ دیتے ہیں۔ اب جاگ پڑے ہو تو یہاں سے چلتے بنو۔ پارکوں میں سونا منع ہے۔"

وہ صاف انگریزی بول رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"سینور! کیا تم مجھے بتا سکو گے کہ بلوگنا شہر کے لئے یہاں سے سٹیمر کب روانہ ہوتے ہیں اور ان کا کرایہ کتنا ہے؟"

گارڈ کے ہاتھ میں پالش کیا ہوا ڈنڈا تھا۔ اس نے ڈنڈا گھما کر اپنی کنپٹی کے ساتھ لگایا اور گردن ٹیڑھی کر کے مجھے دیکھنے لگا:

"تم ٹورسٹ ہو۔ ظاہر ہے تمہارے پاس اتنے فالتو ڈالر نہیں ہوں گے کہ سٹیمر کا کرایہ برداشت کر سکو۔ تم وہی کرو جو دوسرے ٹورسٹ کرتے ہیں۔"

اس اطالوی گارڈ نے مجھے وہی طریقہ بتایا جس پر میں اب تک عمل کرتا آیا تھا۔ یعنی ہچ ہائکنگ یعنی لفٹ لے کر ہائی وے پر سفر کرنا۔ میں تھیلا کندھے پر ڈال کر پارک سے نکل آیا۔ میرے پاس ڈالر زیادہ نہیں تھے۔ پھر بھی میں پوچھتا پوچھتا مختلف بسوں میں سفر کرتا ہوا سان مارینو کی بندر گاہ پر جا پہنچا۔ میں نے معلوم کیا تو گارڈ کی بات درست نکلی۔ سٹیمر کے تھرڈ کلاس کا کرایہ بھی بہت زیادہ تھا۔ میں نے سٹیمر میں سفر کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ایک بار پھر ہائی وے پر آ گیا۔ یہاں ایک پٹرول پمپ کے باتھ روم میں گھس کر منہ ہاتھ دھویا۔ وہیں ایک کینٹین پر ناشتہ کیا اور ہائی وے کے کنارے بلوگنا شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

چند قدم چل کر میں رک کر پیچھے دیکھتا۔ پیچھے سے جو گاڑی آ رہی ہوتی، اسے انگوٹھے کا اشارہ کرتا۔ مگر کوئی گاڑی نہ رکتی۔ میں کوئی ایک گھنٹے تک چلتا رہا۔ آخر ایک پھٹیچر قسم کے ٹرک کے ڈرائیور نے مجھے لفٹ دے دی۔

یہ ادھیڑ عمر کا اطالوی اپنے گھر کا سامان لے کر بلوگنا جا رہا تھا۔ اس

کے سامان میں مرغیوں کے ڈربے بھی تھے۔ یہ بڑا باتونی شخص تھا۔ سارا رستہ اطالوی بول بول کر میرے کان کھاتا رہا۔ اب میں تھوڑی تھوڑی اطالوی زبان سمجھنے لگا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ شکستہ انگریزی بھی بول لیتا تھا۔ میں ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ یہ اٹلی کا ساحلی علاقہ تھا۔ بڑا سرسبز تھا۔ ٹرک چھوٹے بڑے ہرے بھرے ٹیلوں کی شاداب وادیوں میں سفر کر رہا تھا۔ ہوا میں سبزے کی مہک تھی۔ تیسرے پہر ٹرک بلوگنا پہنچ گیا۔ یہ کافی بارونق اور بڑا شہر تھا۔ بلوگنا شہر کی تاریخ بھی وینس کی طرح بڑی پرانی ہے۔ وینس میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تھا اور بلوگنا میں چودھویں صدی عیسوی کے دانشوروں اور سائنس دانوں نے نشاۃ ثانیہ کی راہیں ہموار کی تھیں اور اندلس میں عربوں نے یونانی کلاسیکل کتابوں کے یونانی زبان سے عربی میں ترجمے کئے تھے' بلوگنا کے ان دانشوروں نے انہیں لاطینی زبان میں منتقل کیا تھا۔ یہ انہی دانشوروں کی محنت کا نتیجہ ہے کہ یورپ میں احیائے علوم کی تحریک شروع ہوئی۔ بلوگنا شہر شیشہ سازی اور فرنیچر بنانے کے فنون میں بھی بڑا مشہور تھا۔ میں شام ہونے تک بلوگنا شہر کے بازاروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اٹلی میں مشرقی تہذیب اور کلچر کے اثرات بڑے نمایاں تھے۔ کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں ماڈرن عمارتوں کے ساتھ ساتھ تنگ و تاریک اونچی نیچی گلیاں نہ ہوں۔ ان گلیوں میں اطالوی عورتیں اپنے اپنے مکان کے تھڑوں پر بیٹھی اونچی آواز میں باتیں کرتی نظر آئیں۔ گلی کے مکانوں کے درمیان تار باندھ کر کپڑے سکھانے کے لئے ڈالے ہوئے تھے۔ مکانوں کی طرز تعمیر بھی مشرقی تھی۔ گیلریوں میں پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ لکڑی کے چھجے آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔ بچے گلیوں میں کانچ کی گولیاں کھیلتے بھی نظر آئے

اور فٹ بال بھی۔۔۔۔۔۔چھوٹے چھوٹے ریستورانوں سے گرم مصالحوں کی مہک بھی آتی تھی۔ بلوگنا شہر اگرچہ بہت بڑا اور ماڈرن شہر تھا مگر یہاں تنگ و تاریک گلیوں والے علاقے بھی تھے جہاں اونچی نیچی گلیوں کے فرش ٹوٹے ہوئے تھے۔ عورتیں کھلے گریبانوں والے فراک پہنے مکانوں کے آگے بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ میں نے ان علاقوں میں خوب آوارہ گردی کی۔

اتنے میں شام کا اندھیرا پھیلنے لگا اور مکانوں میں روشنیاں ہوگئیں۔ میں ایک نیم روشن گلی سے نکل کر ایک اونچی جگہ پر آگیا۔ یہاں کسی شخص کا بہت بڑا سنگی مجسمہ لگا ہوا تھا۔ یہاں سے دائیں اور بائیں شہر کی روشنیوں کا منظر اتنا دلفریب تھا کہ میں وہیں مجسمے کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ جب بھوک نے تنگ کیا تو واپس شہر کی ایک گلی میں آکر دھوئیں اور گرم مصالحوں کی خوشبو سے بھرے ہوئے ریستوران کے باہر بیٹھ کر ایک پیزا کھایا۔ کافی پی اور رات بسر کرنے کے لئے ٹھکانے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

میں ایک گلی میں سے گذر رہا تھا کہ میں نے تین نوجوانوں کو دیکھا جو اپنے لباس اور شکل و صورت سے ہی غنڈے لگتے تھے۔ وہ دیوار کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور مجھے مسلسل اپنی طرف آتا دیکھ رہے تھے۔ جب میں ان کے قریب سے گذرا تو ایک لڑکے نے اطالوی زبان میں کچھ کہا۔ میں ان کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرایا اور آگے گذر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لڑکے میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ میں گھبرا گیا۔ مجھے بوڑھے ٹرک ڈرائیور کی نصیحت یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا:

"یہاں ہوشیار رہنا۔ تمہارے ساتھ کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش

آسکتا ہے۔"

اتنے میں تینوں غنڈے لڑکے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ایک نے میرا تھیلا پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچا اور ہنس کر دوسرے سے کچھ کہا۔ دوسرے لڑکے نے میری جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو میں نے ان دونوں کو زور سے دھکا دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ خطرہ تھا کہ پیچھے سے کہیں وہ مجھ پر فائر نہ کر دیں۔ مگر شاید ان کے پاس پستول وغیرہ نہیں تھے۔ گلیاں پیچ دار تھیں۔ مجھے ان گلیوں کا بھی پتہ نہیں تھا کہ کدھر جاتی ہیں۔ میں بھاگتا چلا گیا۔ غنڈے بھی میرے پیچھے بھاگتے آرہے تھے۔ میں ایک گلی کا موڑ گھوم کر دوسری گلی میں آیا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ گلی آگے سے بند تھی۔ آگے کوئی دس پندرہ فٹ اونچی پتھر کی دیوار تھی۔ کونے والے مکان کے باہر لیمپ پوسٹ پر روشنی ہو رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ہی کوڑے کرکٹ والا ٹرینش کین پڑا تھا۔ غنڈے اب گلی کا موڑ گھوم کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں مجھے ایک غنڈے کے ہاتھ میں چمکتا ہوا چاقو نظر آیا۔

میں جلدی سے ٹرینش کین پر چڑھا اور اچھل کر دیوار کے کنارے کو پکڑا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ میں اٹھ کر بھاگنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک مکان کے صحن میں آگیا ہوں۔ میرے چھلانگ لگاتے ہی ایک عورت کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ میں نے دیکھا ایک بھاری بدن والی عورت ہاتھ میں تام چینی کا تسلا تھامے صحن میں کھڑی تھی۔ میں نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اسے جلدی جلدی انگریزی میں بتایا کہ میں ٹورسٹ ہوں۔ میرے پیچھے غنڈے لگے ہوئے ہیں۔ اس عورت نے کمرے

کمرے کے ادھ کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا: "گو"۔ میں تیزی سے کمرے میں گھس گیا۔ اس دوران غنڈے گلی کی دیوار کے اوپر آ گئے تھے۔ مجھے اس عورت کی تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ اطالوی زبان میں انہیں گالیاں دے رہی تھی اور دہائیاں سنا رہی تھی۔ اس کے بعد باہر صحن میں خاموشی چھا گئی۔ اتنے میں وہ عورت کمرے میں آ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور مسکرا کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا:

"تم خوش قسمت ہو۔ بچ گئے۔ یہاں سے کوئی ٹورسٹ بچ کر نہیں جاتا۔ تم کہاں سے آئے ہو؟"

کمرہ چھوٹا سا تھا۔ ایک کمزور بلب روشن تھا۔ زمین پر گھسا پٹا پرانا قالین بچھا تھا۔ کونے میں چھوٹی سی گول میز کے ساتھ سٹول پڑا تھا جس کے پاس ہی تام چینی کی ایک چائے دانی اور چینی کے دو تین جگ پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر گلابی رنگ کے کاغذ منڈھے ہوئے تھے۔ ایک جانب دیوار پر کسی ایکٹریس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں عجیب قسم کی بو جھل بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ پرانا پلنگ بچھا تھا جس پر کچھ پرانے کپڑے اور کمبل بے ترتیبی سے پڑا تھا۔ میں ابھی تک کمرے میں کھڑا تھا۔ میں نے اس عورت کا شکریہ ادا کیا۔ اب میرا سانس درست ہو چکا تھا۔ میرا تھیلا ابھی تک میری کمر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ عورت نے خالی تسلا میز کے نیچے رکھ دیا اور میرے قریب آ کر مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کے جسم سے بھی وہی بو آ رہی تھی جو سارے کمرے کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے میز کے پاس رکھی لوہے کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہاں بیٹھ جاؤ۔ باہر گئے تو غنڈے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے تھیلا اتار کر کرسی کے پاس ہی رکھ دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ عورت کچھ پراسرار سی لگ رہی تھی۔ لیکن میں اسکا ممنون احسان ضرور تھا کہ اس نے مجھے غنڈوں سے بچا لیا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو مجھے ان غنڈوں کے حوالے بھی کر سکتی تھی۔ اس چھوٹے سے نیچی چھت والے کمرے میں ایک دروازہ تھا۔ عورت دروازے میں سے دوسری طرف چلی گئی۔ دروازہ آدھا کھلا تھا۔ دوسری طرف شاید کچن تھا۔ مجھے دیوار کے شیلف میں لگے چینی اور تام چینی کے کچھ برتن اور ڈبے دکھائی دے رہے تھے۔ اندر سے عورت نے انگریزی میں کہا:

"میں تمہارے لئے کافی بناتی ہوں۔ تم کچھ کھاؤ گے؟ میرے پاس تھوڑی مچھلی ہے"

میں نے آواز دے کر کہا: "شکریہ سینورا! میں نے کھانا کھالیا تھا۔"

"میں کافی بناتی ہوں۔ ٹورسٹوں کی میزبانی کرنا ہمارا فرض ہے۔ تمہارے ذریعے ہمارا ملک بہت زر مبادلہ کماتا ہے، تمہارے پاس کتنے ڈالر ہیں؟"

میں چونکا۔ میں نے سوچا کہ یہ عورت بھی مجھے لوٹنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا: "دس بارہ ڈالر ہی رہ گئے ہیں۔ تمہیں ضرورت ہے تو بے شک لے لو۔"

میں نے سوچا کہ ڈالر دے کر اس عورت سے جان بچانی چاہئے۔

کچن میں سے عورت کی آواز آئی:

"ان ڈالروں کو سنبھال کر خرچ کرنا۔ تم کافی بے وقوف ٹورسٹ

لگتے ہو۔ کیا تم انڈیا کے رہنے والے ہو؟"

میں نے جواب میں کہا:

"نہیں سینورا! میں پاکستان سے آیا ہوں۔"

اس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچن سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں دو مگ تھے جو کافی سے لبریز تھے۔ اس نے مگ میز پر رکھے اور دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ نیچے ہاتھ ڈال کر اس نے پلنگ کے نیچے رکھا ہوا بسکٹوں کا ڈبہ نکالا اور پلیٹ میں بسکٹ رکھنے لگی۔ اس عورت کی عمر چالیس پینتالیس برس کی ہوگی۔ جسم بھاری تھا۔ اس کے فراک کا گریبان بھی وہاں کے فیشن کے مطابق کافی کھلا تھا۔ وہ میز پر دونوں کہنیاں رکھے ہاتھوں میں مگ تھامے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کافی کی چسکیاں لے رہی تھی اور مجھ سے کبھی اطالوی زبان میں اور کبھی شکستہ انگریزی میں باتیں بھی کر رہی تھی۔ میں اس کی انگریزی کے شکستہ جملوں کا یہاں صاف اردو میں ترجمہ کر کے لکھ رہا ہوں۔ اب مجھے اس کے کپڑوں میں سے گوبھی کی بو آنے لگی تھی۔ اصل میں یہ اس کے جسم کی بو تھی جس نے سارے کمرے میں پھیل کر فضا کو بوجھل کیا ہوا تھا۔ میں کافی پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں مجھے رات بسر کرنے کا موقع مل جائے تو کوئی برا نہیں۔ کیونکہ وہاں زیادہ دیر بیٹھنے سے گوبھی کی بو ہلکی پڑ چکی تھی۔ میں نے رات بسر کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار ابھی اس عورت سے نہیں کیا تھا کہ اس نے مگ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا:

"اب تم کہاں جاؤ گے؟ کیا تم وائی ایم سی اے میں رہتے ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا:

"شاید مجھے رات کسی پارک میں بسر کرنی پڑے۔ میں آج ہی بلوگنا میں وارد ہوا ہوں۔ مجھے وائی ایم سی اے کا کچھ پتہ نہیں۔"

وہ مسکرائی۔ اس نے میرے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور لمباکش لے کر نتھنوں سے دھواں چھوڑتے ہوئے ایک ہاتھ سے دھواں پرے ہٹاتے ہوئے بولی:

"تم اگر چاہو تو یہاں میرے پلنگ پر رات بسر کر سکتے ہو۔ یہ کافی بڑا پلنگ ہے۔ میں بھی ایک طرف پڑ جاؤں گی۔"

مجھے گوبھی کی بو تیز تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ اپنا خالی مگ لے کر کچن میں چلی گئی۔ اندر سے اس نے آواز دی:

"تمہارے لئے اور کافی لاؤں؟"

میں نے کہا: "نہیں سینورا! تھینک یو۔"

جب وہ کچن سے باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں وائن کی بوتل تھی اور دوسرے ہاتھ میں شیشے کے دو چھوٹے چھوٹے گلاس تھے۔ اس نے وائن کی بوتل میز پر رکھ دی اور کہا:

"تم نے اطالوی وائن ضرور پی ہوگی۔ ہمارے ملک کے انگور یونان کے انگوروں کے مقابلے بڑے کھٹے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی وائن بڑی اچھی بنتی ہے۔"

میں نے کہا: "نہیں۔ میں نے اطالوی وائین ابھی تک نہیں پی۔"

دراصل میں نے اس عورت کے آگے جھوٹ بولا تھا مگر جیسا کہ میں نے سفرنامے کی شروع میں آپ سے وعدہ کیا تھا' میں آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جب سے میں اٹلی کی سرحد میں داخل ہوا تھا' میری

کوئی رات ایسی نہیں گذری تھی کہ جس رات میں نے تھوڑی سی اطالوی وائین نہ چکھی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اطالوی وائین کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ وہ عورت حیرانی کے ساتھ بڑی بڑی کالی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔

"سینور! تم بڑے بد قسمت ہو کہ تم نے ابھی تک ہمارے ملک کا مشروب مارٹینی نہیں چکھا۔ یہ تو ہمارا نیشنل مشروب ہے۔"

اور اس نے دونوں چھوٹے گلاس میز پر رکھے اور بوتل کا کاک کھول کر گلاسوں میں وائن انڈیلنے لگی۔ وائن کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ بالکل حنا کے عطر کی طرح۔ گلاسوں میں آتے ہی مارٹینی کی خوشبو میں گوبھی کی بو ملنا شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں کا فرق بھی مٹ گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ حنا کے عطر کی خوشبو کہاں سے شروع ہوتی ہے اور گوبھی کی بو کہاں جاکر ختم ہو جاتی ہے۔ میں ساری رات گوبھی کے کھیتوں میں پھرتا رہا جہاں کہیں کہیں حنا کی جھاڑیاں بھی راستے میں آجاتی تھیں۔

صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اپنا پاسپورٹ دیکھا۔ خدا کا شکر ہے پاسپورٹ بھی موجود تھا اور میرے جو ڈالر باقی رہ گئے تھے، وہ بھی موجود تھے۔ یہ عورت چور نہیں تھی۔ لیکن مجھے اس عورت سے خوف آنے لگا تھا۔ میں اس سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے گھر میں بند کر لیا تھا۔ جب میں جانے کی بات کرتا تو وہ یہ کہہ کر مجھے ڈرا دیتی کہ اس رات والے غنڈے گھر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اگر میں باہر نکلا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر وہ عورت آدم خور تھی تو مجھے بھی اس کا

شکار بننے کا شوق پڑ گیا تھا۔ آخر ایک دن تنگ آکر میں نے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ مارکیٹ میں گروسری وغیرہ خریدنے جاتی تو باہر مکان پر تالا لگا جاتی تھی۔ ایک دن وہ کسی کام سے باہر گئی تو میں کھڑکی کی جالیاں توڑ کر عقبی صحن میں سے فرار ہو گیا۔ اس وقت دن کے دس ساڑھے دس کا وقت ہو گا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ بلوگنا شہر کی سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ میں نے ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور سے اطالوی سگرٹوں کا پیکٹ خریدا۔ ایک سگریٹ سلگایا اور بارونق سڑکوں پر چلتا پھرتا ہائی وے پر آگیا۔ میرا ارادہ لفٹ لے کر وینس پہنچنے کا تھا۔

اٹلی کے مضافات اتنے خوبصورت ہیں کہ ان مضافات کی سرسبز پہاڑیوں اور اونچی نیچی وادیوں میں خواہ مخواہ پیدل سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور پھر سفر میں جگہ جگہ پرانے تاریخی کھنڈرات دیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ کئی جگہوں پر میں نے پہاڑیوں کے نشیب اور کھلے میدانوں میں ایسے ستون کھڑے دیکھے جن کی چھتیں غائب تھیں۔ سنگ مرمر کے مجسمے بھی دیکھے جن میں اپالو دیوتا اور وینس کے مجسمے بھی تھے۔ یہ مجسمے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے مگر ان کی کلاسیکل اور تاریخی شان بدستور قائم تھی۔ اس کے باوجود اٹلی میں پیدل سفر کرنا بہت ہی خطرناک ہے۔ اس وقت مجھے اسکا تجربہ نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے بوڑھے ٹرک ڈرائیور نے خبردار بھی کیا تھا کہ یہ اٹلی ہے' یہاں قدم قدم پر ہوشیار رہنا' ورنہ مارے جاؤ گے۔ میں نے اس کی نصیحت کو فراموش کر دیا تھا۔ اور اپنی رومانیت پسندی اور مہم جوئی کے جوش میں بلوگنا سے لفٹ لے کر اور کچھ پیدل چل کر وینس پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ جس قدر بھیانک نکلا اور میں موت کے منہ میں جاکر کیسے زندہ واپس نکلا؟ یہ آپ کو

آگے چل کر بتاؤں گا۔

میں ایک بار پھر ہائی وے پر تھا۔ گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ ان میں خوبصورت ماڈرن کاریں بھی تھیں۔ دیوہیکل ٹرالر بھی تھے اور ٹرک بھی تھی۔ ایک کار میرے اشارے پر رک گئی۔ یہ بلیو پوڈنیک کار تھی اور اسے ایک ادھیڑ عمر اطالوی چلا رہا تھا۔ کار گرین بیلٹ کے قریب آکر رکی تھی۔ میں دوڑ کر پہنچا تو اس آدمی نے کھڑکی میں سے اپنا سر نکال کر انگریزی میں پوچھا: "تم ٹورسٹ ہو؟" میں نے کہا:

"یس سر! میں ٹورسٹ ہوں۔ وینس جانا چاہتا ہوں۔"

وہ آدمی مسکرایا۔ چہرے کے خدوخال سے وہ کوئی خاندانی آدمی لگتا تھا۔ سر کے بال تھوڑے تھوڑے سفید تھے۔

آنکھیں نیلی تھیں اور اس نے اورنج کلر کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کہنے لگا:

"میں تمہیں پاڈوا تک پہنچا سکتا ہوں، میں وہیں رک جاؤں گا۔ آگے تم کسی اور سے لفٹ لے لینا۔ آجاؤ۔"

میں شکریہ ادا کر کے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ شخص بڑی روانی سے انگریزی بول لیتا تھا۔ کہنے لگا:

"بلوگنا سے دریائی اور جھیل کے راستے وینس تک چھوٹے جہاز بھی جاتے ہیں۔ ان کا کرایہ زیادہ نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا: "مگر مجھے تو کسی نے ان کا کرایہ بہت زیادہ بتایا تھا۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا: "ہم اطالوی لوگ بہت زیادہ مبالغہ کرتے ہیں۔ شاید یہ ہماری تہذیب میں شامل ہے۔"

راستے میں اس نے اپنا لنچ باکس کھولا اور مجھے بھی کھانے میں شامل

کر لیا۔ کھانے کے بعد تھرماس میں سے کافی نکال کر پلائی اور بڑا اعلیٰ قسم کا سگار بھی دیا۔ تھوڑی دیر ہم ہائی وے کے کنارے لنچ سپاٹ کے بنچوں پر بیٹھے سگار پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ اسے پاکستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ پھر وہ ۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کی باتیں کرنے لگا۔ سگار کا ہلکا سا کش لگا کر بولا:

"تم پاکستانی ایک مارشل قوم ہو۔ تم بہادر لوگ ہو۔ سن پینسٹھ میں تم نے اپنے سے تین گنا طاقت والے ہندوستان کا منہ پھیر دیا۔ ہم تمہاری بہادری کی عزت کرتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ اپنا سفید بالوں والا سر کھجاتے ہوئے بولا:

"کبھی ہم رومن لوگ بھی بڑے بہادر ہوا کرتے تھے' ساری دنیا میں ہماری بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ رومن ایمپائر کے دبدبے اور شان و شکوہ سے کون واقف نہیں ہے۔ مگر افسوس اب یہ ساری باتیں عہد پارینہ کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر اس نے کاغذ کے گلاس میں سے مارٹینی کا آخری گھونٹ لیا اور گلاس ٹریش باکس میں پھینک کر کہنے لگا:

"تم سیکنڈ ورلڈ وار کی مثال ہی لے لو۔ میں دوسرے اطالویوں کی طرح مبالغے سے کام نہیں لوں گا اور جھوٹ بھی نہیں بولوں گا۔ دوسری جنگ عظیم میں مسولینی نے مردہ رومن قوم میں ایک بار پھر عہد رفتہ کی بجلیاں بھرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے عظیم رومن ایمپائر کے جاہ و جلال کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر قوم نے اسے نہیں پہچانا۔ خاص طور پر کیمونسٹ اسے لے ڈوبے' اطالوی فوجیں بھی کسی محاذ پر قدیم رومن

سورماؤں کی طرح جم نہ لڑ سکیں۔ تمہیں معلوم ہے کیا ہوتا تھا؟ ہوتا یہ تھا کہ کسی محاذ پر اگر ایک مورچے کے اطالوی سپاہی ہتھیار ڈالتے تھے تو پوری کمپنی اس کے ساتھ ہی ہتھیار ڈال دیتی تھی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ ساری دنیا میں اطالوی فوج کی بدنامی ہوئی۔ لوگ اطالوی فوج کو بزدلوں کی فوج کے نام سے پکارنے لگے۔"

پھر وہ گہرا سانس بھر کر بولا:

"ہماری ساری تاریخ گواہ ہے کہ ہماری قوم کو ہماری آپس کی دشمنیاں اور خانہ جنگی لے ڈوبی۔ قدیم دور میں جب شہروں کی خود مختار ریاستیں ہوتی تھیں تو کیا ہوتا تھا؟ یہی کہ ایک ریاست دوسری ریاست سے لڑتی رہتی تھی۔ اس وقت تک یہ آپس کی چپقلش جاری رہتی تھی جب دشمن باہر سے آکر دونوں ریاستوں پر قبضہ نہیں کر لیتا تھا۔ سیزر بادشاہوں نے آکر رومن قوم کو متحد کیا اور ایک عظیم رومن سلطنت وجود میں آئی مگر کچھ دیر بعد وہ بھی عیاشیوں میں غرق ہو گئی اور ساری قوم کا شیرازہ ایک بار پھر بکھر گیا۔ ایک بات میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ ہماری قوم کو اس وقت ایک اور مسولینی کی ضرورت ہے۔"

اس کی باتیں میں بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ یہ اطالوی بڑا صاف گو اور پڑھا لکھا تھا۔ وہ اپنی قوم کی تاریخ سے آگاہ تھا۔

"چلو میرے دوست! اب اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ مجھے بھی شام ہونے سے پہلے پاڈوا تک پہنچنا ہے۔"

ہائی وے پر پوٹنک کار ایک بار پھر فراٹے بھر رہی تھی۔ میں ایک عرصے بعد ایسی آرام دہ قیمتی کار میں بیٹھا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے میں کسی تیز رفتار کشتی میں دریا میں سفر کر رہا ہوں۔

راستے میں پارما کا تاریخی شہر بھی آیا۔ یہ چھوٹا سا شہر تھا اور اٹلی اور یورپ کے دوسرے چھوٹے شہروں کی طرح بارونق اور صاف ستھرا تھا۔ یہاں ہم نے ایک فاسٹ فوڈ ریستوران میں بیٹھ کر چائے پی اور ساتھ سنیکس بھی کھائے۔ چائے لپٹن والوں کی ہی تھی۔ بڑی خوشگوار اور تازہ تھی۔ یہاں سے پھر ہم آگے روانہ ہوگئے۔ شام ہو چکی تھی' جب ہم پاڈوا پہنچے۔ اس اطالوی نے گاڑی ایک چوک میں پٹرول پمپ کے احاطے میں کھڑی کر دی اور کہنے لگا:

"یہاں سے وینس کے لئے ٹرین بھی مل جائے گی' کرایہ زیادہ نہیں ہوتا۔ ٹرین میں ہی سفر کرنا۔ آگے لفٹ مت لینا۔ کیونکہ موسم خراب ہے۔ بادل آرہے ہیں' ہو سکتا ہے بارش ہو۔ اگر تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ وہ مجھے کچھ پیسے دے دے مگر میں نے تکلف سے کام لیا اور کہا کہ شکریہ! مجھے ضرورت نہیں ہے۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "اوکے۔ بائی۔"

اور پوٹنیکا گاڑی آگے نکل گئی۔ میں ایک بار پھر بارونق شہر میں اکیلا کھڑا تھا۔ مجھے اس خوش مزاج پڑھے لکھے اور باشعور یعنی قومی شعور رکھنے والے اطالوی کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ میں پٹرول پمپ کے باہر ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے اس شخص نے بتادیا تھا کہ وینس وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اور کرایہ بھی زیادہ نہیں لگتا۔ میں نے پٹرول پمپ کے ایک آدمی سے پاڈوا کے ریلوے اسٹیشن کے بارے میں پوچھا تو اس نے اطالوی زبان میں مجھے خدا جانے کیا بتایا۔ میری

کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ایک سنیک بار میں آگیا۔ یہاں بھی سب لوگ اطالوی زبان ہی بولتے تھے۔ میں ایک کیمسٹ یعنی ڈرگ شاپ میں آگیا۔ یہاں ایک خوبصورت عورت کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ شاید وہ مجھے اپنا بیمار سمجھ رہی تھی۔ میں نے انگریزی میں بات کی تو وہ بولی:

"یس! میں انگریزی بول لیتی ہوں، تھوڑی تھوڑی۔"

میں نے پوچھا: "ریلوے اسٹیشن میں کیسے جاسکتا ہوں؟"

اس نے کاؤنٹر کے نیچے ہاتھ ڈال کر شہر کا نقشہ نکال کر میرے آگے رکھ دیا۔ پھر ایک جگہ انگلی رکھ کر بولی:

"تم اس جگہ پر ہو۔"

میں اس کی انگلی دیکھنے لگا۔ ناخن پر گلابی پالش چمک رہا تھا۔ بڑی ستواں اور نازک انگلی تھی۔ میں جلدی سے ہوش میں آگیا۔

"یس سینوریتا! میں اس جگہ پر ہوں۔"

میں نے اپنی انگلی اس کی نازک انگلی کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک جانے کا سارا راستہ سمجھادیا۔ یہ بھی بتادیا کہ اسی چوک سے فلاں نمبر بس مجھے سیدھی ریلوے اسٹیشن پہنچادے گی۔ میں نے اسکا شکریہ ادا کیا اور بس سٹاپ پر آکر بس کا انتظار کرنے لگا۔ بس آئی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ یہاں میں نے ان ڈالروں کے عوض اٹلی کی کرنسی لیرا میں نوٹ تبدیل کروالیے تھے جو ڈالر میرے پاس باقی بچے تھے۔ یہ نوٹ میں نے تہہ کرکے اپنے بٹوے میں رکھے ہوئے تھے جو میری جیکٹ کی اگلی اوپر والی جیب میں تھا۔

بس میں زیادہ رش نہیں تھا۔ مگر ساری سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ بس شہر کے مختلف جگمگاتے ہوئے بازاروں میں سے گذرتی ہوئی ایک عالی شان بلڈنگ کے آگے جاکر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ ریلوے اسٹیشن کی عمارت ہے۔ وہاں بس سٹاپ پر کافی رش تھا۔ میں بس کے نیچے بڑی مشکل سے اترا۔ اطالوی لوگ ہماری طرح بڑے جلد باز ہوتے ہیں۔ بس پر ایک دم رش پڑا تھا۔ ایک آدمی نے مجھے دھکا دیا تو میں ایک طرف گرتے گرتے بچا۔ دل میں اس شخص کو گالیاں دیتا میں نیچے اتر آیا۔ ریلوے اسٹیشن کی بلڈنگ میں آکر ٹکٹ ونڈو پر پہنچا۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک نوجوان ٹکٹ دے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وینس جانے والی گاڑی کس وقت چھوٹے گی۔ اب میں بھی ٹوٹی پھوٹی اطالوی زبان بولنے لگا تھا۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا:

"ایک گھنٹے دس منٹ بعد چھوٹے گی۔"

میں نے کرایہ پوچھا۔ اس نے کرایہ بتایا جو زیادہ نہیں تھا۔ میں نے جیکٹ پیچھے ہٹاکر اگلی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرا بٹوا غائب تھا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ جیب کو بار بار ٹٹولا۔ الٹا کر دیکھا۔ مگر بٹوہ ہوتا تو ملتا۔ میں قطار میں سے باہر نکل کر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ سخت پریشان ہوا۔ بٹوا کسی نے نکال لیا تھا۔ ضرور اسی شخص نے نکالا تھا جس نے بس میں سے اترتے وقت مجھے دھکا دیا تھا۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ کمر سے تھیلا اتار کر کھولا۔ اس کی جیب دیکھی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ میرا پاسپورٹ تھیلے میں موجود تھا۔ یہ نصیحت مجھے پوڈنیک کار والے اطالوی نے کی تھی کہ پاسپورٹ بٹوے میں نہ رکھنا۔ اسے اپنے تھیلے میں ہی رکھو۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں کہاں تمہارا بٹوا اڑا لیا

جائے۔ اب نئی مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ بٹوے میں میرے سارے پیسے تھے جو بٹوے کے ساتھ ہی مجھ سے جدا ہو گئے تھے۔ میں بالکل قلاش ہو چکا تھا۔ وینس کے کرائے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' میرے پاس رات کے کھانے تک کے پیسے نہیں تھے اور یہ یورپ کا شہر تھا۔ یہاں تو ایسا لنگر بھی نہیں تھا کہ جہاں میں مفت دال روٹی کھا سکتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ منزل کے قریب آ کر میں لٹ گیا تھا۔ یہ پاکستان نہیں تھا کہ میں ریلوے والوں کو دھوکا دے کر ٹرین میں بغیر ٹکٹ بیٹھ جاتا۔ آخر یہی ایک راستہ نظر آیا کہ ایک بار پھر ہائی وے پر چلو۔ لفٹ مانگو اور اللہ کے بھروسے پر چل پڑو۔ جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔

اب سوال یہ تھا کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اتنا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں سے ہائی وے کافی دور ہے۔ میں بس میں بیٹھ کر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور پیدل ہی مغرب کی سمت کا اندازہ لگا کر فٹ پاتھ پر چل پڑا۔ بڑی خوبصورت عورتیں میرے قریب سے خوشبوئیں اڑاتی گذر رہی تھیں مگر اس وقت وہ مجھے زہر لگ رہی تھیں۔ چوک میں آیا تو بڑی روشنیاں تھیں۔ نیون سائن مختلف رنگوں کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں اتنی روشنیاں تھیں کہ تارے کیا نظر آتے، آسمان پر بھی بدستور بادل چھائے ہوئے تھے اور کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ چوک بہت کشادہ تھا۔ موٹر گاڑیاں اور سکوٹر چل رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے زیبرا کراسنگ تلاش کر کے وہاں سے چوک کوئی پانچ منٹ میں عبور کیا۔ دوسری طرف آیا تو رک گیا۔ ایک نوجوان اطالوی میرے قریب سے گذرا تو میں نے اسے روک کر ہائی وے کا راستہ پوچھنا چاہا۔ وہ اشارے سے نو نو کرتا آگے نکل گیا۔ شاید وہ یہ سمجھا کہ میں ٹورسٹ ہوں اور اس سے پیسے مانگوں گا۔ میں فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ ایک سنیک بار میں

بڑا رش تھا۔ اندر سے گرم مصالحوں اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے بھوک لگی رہی تھی۔ مگر آہ بھر کر رہ گیا۔

ٹریفک کا ایک سپاہی مجھے نظر آ گیا۔ میں نے اس سے ہائی وے کا راستہ پوچھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور اطالوی میں جو کچھ کہا' میں یہی سمجھ سکا کہ آگے ایک چوک آئے گا' وہاں سے بائیں جانب ہو جانا۔ وہ سڑک سیدھی ہائی وے پہنچا دے گی۔ بہر حال میں کسی نہ کسی طرح ہائی وے پہنچ ہی گیا۔ یہاں پہلی بار مجھے آسمان پر بجلی کڑکتی دکھائی دی۔ کیونکہ یہاں شہر کی چکاچوند کر دینے والی روشنیاں نہیں تھیں۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔ اگر بارش شروع ہو گئی تو کہاں جاؤں گا۔ وہاں کوئی جائے پناہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہائی وے کی دونوں جانب لیمپ پوسٹ کی روشنیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ ہائی وے پر وہ ٹریفک نہیں تھی جو دن کے وقت ہوتی تھی۔ کاریں اور ٹرالر کبھی کبھی گذر جاتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ ہوا میں نمی بھی تھی۔ لگتا تھا کہ آس پاس پہاڑیوں میں بارش ہو رہی ہے۔ میں خدا کے بھروسے پر ہائی وے کی گرین بیلٹ کے کنارے کنارے شمال کی طرف چلنے لگا۔ پیچھے سے جو گاڑی آتی میں ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر آگے جانے کے لئے ہاتھ کا اشارہ کرتا۔ مگر گاڑی تیزی سے گذر جاتی۔ شاید وہاں رات کے وقت لفٹ دینے کا رواج نہیں تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ رات کو ٹورسٹ اس طرح سفر بھی نہ کرتے ہوں۔ شاید گاڑیوں والوں کو یہ شبہ تھا کہ میں ٹورسٹ کے بھیس میں کوئی چور ڈاکو ہوں۔ میں تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ بادلوں کی گرجدار آواز سنائی دی اور بارش شروع ہو گئی۔

مصیبتیں یکے بعد دیگرے مجھ پر نازل ہو رہی تھیں۔ غنیمت تھا کہ

بارش تیز نہیں تھی۔ ہلکی ہلکی ہو رہی تھی مگر بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج بتا رہی تھی کہ یہ کسی وقت بھی تیز ہو سکتی ہے۔ اب مجھے بھوک شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ کاش جب میرے پاس پیسے تھے تو میں کچھ برگر قسم کی شے بنوا کر اپنے پاس رکھ لیتا۔ مگر اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ بارش آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ سردی بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ ہوا بھی سرد تھی۔ ایک بار تو میں گھبرا گیا۔ سوچا واپس پاڈوا کے ریلوے اسٹیشن پر چلتا ہوں۔ کم از کم وہاں بارش سے تو نجات مل جائے گی۔ ریل کے کسی خالی ڈبے میں رات بسر کر لوں گا۔ پیاس بھی لگ رہی تھی مگر بھوک زیادہ لگی ہوئی تھی۔ میرے کپڑے بارش میں بھیگنے لگے۔ گرین بیلٹ پر کوئی درخت بھی نہیں تھا کہ جس کے نیچے چلا جاتا۔ ہائی وے پر تھوڑی تھوڑی دور بجلی کے کھمبے نصب تھے جن پر ٹیوب لائیٹس روشن تھیں۔ ان کی روشنی کی وجہ سے میں سڑک کنارے چلتا ہوا پیچھے سے آنے والی گاڑی کے ڈرائیور کو اچھی طرح نظر آسکتا تھا۔ دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاید کوئی گاڑی مجھ پر رحم کھا کر کھڑی ہو جائے۔ مگر گاڑی آتی، میں رک کر اشارہ کرتا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں بارش کے قطرے تیزی سے زمین پر گرتے نظر آتے اور گاڑی مجھ غریب الوطن کے قریب سے شوں کر کے آگے نکل جاتی۔ کسی کو مجھ پر ترس نہ آتا۔ کبھی میں اپنے آپ کو برا بھلا کہتا کہ میں کیوں رات کے وقت ہائی وے پر نکل پڑا۔ اور کبھی گاڑی والے کو گالیاں دیتا۔

میں اب ہاتھ کا اشارہ بھی نہیں کرتا تھا۔ گاڑی آتی اور گذر جاتی۔ ہاتھ ہلاتے ہلاتے میرا بازو درد کرنے لگا تھا۔ اب ایسا ہوا کہ پیچھے سے مجھے کسی گاڑی کی روشنیاں بارش والی گیلی سڑک پر نظر آئیں۔ میں نے دل میں اسے

گالی نکالی اور کہا: "تم بھی گذر جاؤ تمہارے....."

مگر گاڑی مجھ سے چند قدم آگے جاکر رک گئی۔ میں سمجھا اس کے انجن میں کوئی خرابی ہوگئی ہوگی۔ مگر اسکا انجن باقاعدہ چل رہا تھا۔ گاڑی بڑی قیمتی تھی۔ اسکا رنگ سرخ تھا۔ میں بارش میں بھیگتا' دونوں ہاتھ بغلوں میں دیئے گاڑی کے قریب سے گذرا تو میری طرف والی کھڑکی کا شیشہ آہستہ آہستہ نیچے ہوگیا۔ گاڑی کے اندر سے پہلے مجھے انگلش میوزک کی ہلکی ہلکی آواز آئی۔ پھر ایک نسوانی آواز سنائی دی:

"ہیلو! تمہیں لفٹ چاہیے؟"

یہ جملہ انگریزی زبان میں ادا کیا گیا تھا۔ میرے تن مردہ میں جیسے جان پڑ گئی۔ میں نے کھڑکی کے پاس منہ لے جاکر کہا:

"یس پلیز۔"

گاڑی کے اندر کی فضا نیم گرم تھی اور بڑے قیمتی پرفیوم کی خوشبو میرے چہرے کے قریب سے ہو کر گذر گئی۔ اندر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس نے گاڑی کے اندر کی دھیمی لائیٹ روشن کر دی۔ میں نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بے حد حسین لڑکی بیٹھی میری طرف قیامت خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ وہ فل میک اپ میں تھی۔ نازک اور گورے جسم پر پھولدار فراک پہن رکھا تھا۔ گلے میں سنہرا لاکٹ چمک رہا تھا۔ ایک بازو اس کا ڈرائیونگ ویل پر تھا جس کی کلائی میں سنہری زنجیر والی گھڑی تھی۔ کمر کے ساتھ بھی سنہری بیلٹ بندھی تھی اور گود میں سیاہ پرس تھا۔ اس کے بال سنہری تھے اور ایک لٹ ماتھے پر پڑی تھی۔ وہ تو اس وقت مجھے جنت کی کوئی حور لگ رہی تھی۔ شاید جنت سے کوئی حور ہی میری مدد کو آگئی تھی۔ اس

نے سامنے والا ایک بٹن دبایا اور کہا:

"پلیز اندر آجاؤ۔ بولٹ کھل گیا ہے۔"

میں دروازہ کھول کر جلدی سے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں پیرس کی کسی پرفیوم شاپ میں داخل ہو گیا ہوں۔ گاڑی ہائی وے پر چل پڑی۔ بارش بھی تیز ہو گئی تھی اور گاڑی کے وائپر دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ باہر کی بارش اور ٹھنڈ سے گاڑی میں آیا تو مجھے گہرا سکون محسوس ہوا۔ میں اس خوبصورت اطالوی لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ کون ہو سکتی ہے۔ ضرور اونچے طبقے کے کسی امیر خاندان کی لڑکی ہے۔ کیا یہ میرے خوابوں کی سنہری بالوں والی اطالوی دوشیزہ تو نہیں جس سے رومان کرنے کی آرزو میرے دل میں ہے؟ اس کے بال بھی سنہری تھے۔ پھر خیال آیا کہ کہاں میں ایک آوارہ گرد سیاح اور کہاں یہ امیر لڑکی!

"تم کس ملک سے آئے ہو؟"

میں نے پاکستان کا نام لیا تو وہ بے اختیار بولی:

"اوہ آئی لو پاکستان۔ مجھے پاکستان سے محبت ہے۔"

گاڑی چلاتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ میں بھی کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرائی۔ اس کے دانت بڑے چمکیلے تھے۔

"تم مجھے اچھے لگے ہو۔"

میں دل میں بڑا خوش ہوا۔ اگر واقعی یہ خوبصورت لڑکی مجھے پسند کرنے لگی ہے تو پھر میرے لئے رومانس لڑانے کا نادر چانس ہے۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈیش بورڈ میں سے سنہری سگریٹ کیس نکال کر مجھے دیا اور بڑے شیریں لہجے میں کہا:

"ڈیئر! کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟"

میں نے کہا:

"ہاں۔"

بولی: "گڈ! ایک سگریٹ اپنے لئے اور ایک میرے لئے سلگا کر مجھے دے دو۔"

لائیٹر سگریٹ کیس کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر اسے دیا۔ ایک اپنے لئے سلگا لیا۔ بڑا قیمتی سگریٹ تھا۔ برانڈ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ قیمتی گاڑی ہائی وے پر فراٹے بھر رہی تھی۔

اس نے پوچھا:

"تم وینس جا رہے ہو کیا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ کہنے لگی:

"مجھے افسوس ہے کہ میں وینس تک تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ دراصل میں ڈاکٹر ہوں اور میرا نام ایلس ہے۔ یہ اٹالین نام نہیں ہے۔ میری ماں انگریز تھی۔ میں نے لندن میں ہی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا۔ اس نے ایک ادائے خاص سے گردن گھما کر میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور کہا:

"مجھے تمہارا نام بھی اچھا لگا ہے۔"

میری گردن فخر سے اونچی ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس سے رومان کرنے کی حسرت لے کر میں اطالیہ میں داخل ہوا تھا۔ وہ کہنے لگی:

"یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک سینی ٹوریم ہے۔ میں وہاں جاب کرتی ہوں۔ ہفتے میں تین دن وہاں جاتی ہوں۔ میرا خاندان بڑا امیر ہے۔ مجھے نوکری کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف انسانوں کی خدمت کے لئے جاب کرتی ہوں۔"

بارش اس طرح ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گرج تو گاڑی کے اندر سنائی نہیں دیتی تھی مگر کبھی کبھی آسمان پر چمکتی بجلی ضرور دکھائی دے جاتی تھی۔ ایلس نے گانوں کا کیسٹ بند کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کئے جا رہی تھی اور میں اندر سے خوش ہو رہا تھا۔

"میں تمہیں ہسپتال والے موڑ پر اتار دوں گی۔ افسوس میں تمہیں وینس تک نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے ہر حالت میں رات کی ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔"

میرا دل بجھ سا گیا۔ اب کیا کروں' یہ لڑکی تو کچھ دیر بعد مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ کیا میرا رومان ادھورا رہ جائے گا۔ بارش کی بوچھاڑ ونڈ سکرین سے ٹکرا رہی تھیں۔ وائپر تیزی سے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ گاڑی کے اندر کی فضا ہلکی گرماہٹ اور اعلیٰ قسم کی پرفیوم سے مہک رہی تھی۔ اس خوبصورت دوشیزہ کے لباس میں سے باغ عدن کی خوشبوؤں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اب ان خوشبوؤں میں بہترین تمباکو کی خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی۔ سامنے سے ایک ٹرالر چلا آ رہا تھا۔ ایلس نے گاڑی کو تھوڑا بائیں جانب گھمایا تو اس کا جسم میرے جسم سے چھو گیا۔ وہ مسکرا دی۔ میرے سارے بدن میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ پھر یہ سوچ کر میں نے اپنے آپ کو نارمل کر لیا کہ یہ دوشیزہ تو تھوڑی دیر بعد مجھ سے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائے گی۔ لہٰذا رومان لڑانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ خواہ مخواہ دل کو جلانے والی بات ہے۔

ہائی وے کے دائیں بائیں پہاڑی علاقے میں دور دور تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہائی وے نے ایک موڑ کاٹا تو مجھے ایک پہاڑی کے دامن میں روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ ایلس نے کہا:

"یہ روشنیاں ہمارے سینی ٹوریم کی ہیں۔ میں اگلے موڑ پر تم سے جدا ہو جاؤں گی۔"

میں اداس ہو گیا۔ اچانک اس نے بایاں گرم ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور سانس بھر کر بولی:

"ایک بات کہوں؟ تم مجھے بہت یاد آؤ گے اس لئے کہ مجھے تم اچھے لگے ہو۔ محبت وغیرہ کو میں نہیں جانتی۔ لیکن تم مجھے ضرور یاد آیا کرو گے۔ کیا تم بھی مجھے یاد کرو گے؟"

اس کا نازک اور نیم گرم ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ کے اوپر تھا اور میرا سارا جسم سنسنی خیز ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا:

"تم بھی مجھے بہت یاد آؤ گی ایلس! اس لیے کہ تم بھی مجھے بڑی اچھی لگی ہو۔"

اس نے ہاتھ اٹھا لیا۔ سگریٹ کا ایک کش لگایا اور سامنے ہائی وے پر نظریں جمائے ہوئے بولی:

"مجھے معلوم ہے کہ میں خوبصورت ہوں۔ سوسائٹی میں مجھے ایک اونچا مقام بھی حاصل ہے، مجھ سے کئی نوجوان اظہار محبت کر چکے ہیں مگر تمہارے منہ سے اپنی تعریف سن کر مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ کاش تم ہمارے ملک کے رہنے والے ہوتے....."

وہ چپ ہوگئی۔ سگریٹ اس کے دائیں ہاتھ میں تھا جس میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا بایاں ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے باغ عدن کے دروازے کھل گئے ہوں۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ سینی ٹوریم کی روشنیاں قریب آرہی تھیں۔

"یہاں ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں گے۔ آسمان کی وسعتوں میں بھٹکتے ہوئے دو ستارے پل بھر کے لئے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ اب ایک بار پھر ہمیشہ کے لئے الگ ہوجائیں گے۔"

وہ ایسے جذباتی لہجے میں بول رہی تھی جیسے واقعی اسے مجھ سے محبت ہوگئی تھی۔ میں حیران بھی تھا اور مسرور بھی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا راستہ اختیار کروں۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ دوپہر کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مگر اس خوبصورت دوشیزہ کی محبت نے تھوڑی دیر کے لئے بھوک کا احساس ختم کردیا تھا۔

گاڑی ایک روشنیوں سے جگمگاتی سڑک کی طرف تھوڑی سی مڑی۔ پھر ایک جگہ کھڑی ہوگئی۔ ایلس نے میرا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیا اور میری طرف عجیب اداس نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی:

"او کے مائی ڈیئر! وہ مقام آگیا ہے جہاں ہمیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوجانا ہوگا۔"

پھر اس نے کمال کردیا۔ میری طرف جھکی اور مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں تو جیسے پھولوں کے ڈھیر میں چھپ گیا تھا۔ پھر وہ جلدی سے الگ

ہوگئی۔ اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی:

"میں بھی کیسی نادان ہوں۔ جذباتی ہو رہی ہوں' وہ سامنے ہائی وے پر چلنے والی بس کا ایمرجنسی سٹاپ ہے۔ میں تمہیں وہاں اتار دیتی ہوں' وہاں سے تمہیں وینس جانے والی بس مل جائے گی۔"

میں بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے انجن سٹارٹ کیا۔ پھر کچھ سوچ کر انجن بند کر دیا اور میری طرف دیکھ کر بولی:

"مگر تم اتنی بارش میں بس سٹاپ کی چھت تلے صبح تک کیسے بیٹھے رہو گے۔ بس تو صبح صبح آتی ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ میرے ساتھ سینی ٹوریم چلو۔ میرا وہاں الگ ریسٹ ہاؤس ہے۔ باقی رات وہاں بسر کرو۔ صبح میں تمہیں خود ایمرجنسی بس سٹاپ پر چھوڑ آؤں گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہسپتال کی کوئی گاڑی وینس جا رہی ہو۔ میں تمہیں اس میں بٹھا دوں گی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

اندھے کو آنکھیں مل جائیں تو وہ اپنی خوش نصیبی پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے جنت کے دروازے کھل گئے تھے۔ کون کافر انکار کرتا۔ پھر بھی میں نے تھوڑا سا تکلف کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے کہا:

"میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا ایلس!"

اس نے میری طرف جھکتے ہوئے مسکرا کر کہا:

"مجھے تو بڑی خوشی ہوگی۔"

اور گاڑی سینی ٹوریم کی طرف مڑ گئی۔

سینی ٹوریم کو جانے والی سڑک پر دونوں طرف کھمبوں پر بڑے بڑے

بلب روشن تھے۔ سڑک چھوٹی تھی اور چھوٹے چھوٹے موڑ گھومتی ہوئی ٹیلے پر بنے ہوئے سینی ٹوریم کی طرف جاتی تھی۔ ایلس نے بڑے محبت لہجے میں مجھ سے پوچھا:

"تم نے کھانا کھالیا ہے کیا؟"

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا:

"خیال تھا کہ ینس جاکر کچھ کھالوں گا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ ٹورسٹ لوگوں کا کوئی کھانے کا ٹائم نہیں ہوتا۔"

ایلس نے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔

"گڈ! میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ ہم دونوں اکٹھے ڈنر کریں گے۔ اصل میں جب میں یہاں رات کی ڈیوٹی پر آتی ہوں تو ڈنر سینی ٹوریم میں ہی کرتی ہوں۔ ہمارا شیف مرغابی بڑی کمال کی بناتا ہے۔"

سینی ٹوریم کی عمارت تین منزلہ تھی اور جگمگا رہی تھی۔ پارکنگ ایریا میں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بارش کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ ایلس گاڑی کو سینی ٹوریم کے پورچ کے آگے سے نکال کر عقبی سڑک پر لے آئی۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہاڑی کی ڈھلان پر بنگلے بنے ہوئے تھے۔ جن میں روشنی ہو رہی تھی۔

"ریسٹ ہاؤس زیادہ دور نہیں ہے۔ میں نے اس لئے اس ریسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا ہے کہ یہ ہسپتال کی خاص فضا سے دور ہے۔"

گاڑی ڈھلان والے بنگلوں کے سامنے سے بھی گذر گئی۔ ان بنگلوں کے عقب میں ٹیلے پر ایک جانب بارش والی رات کے اندھیرے میں ایک بنگلے کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ ایلس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا:

"یہ ہمارا ریسٹ ہاؤس ہے۔ میں نے کونے والا ایک کمرہ لے رکھا ہے۔ اس کی کھڑکیاں وادی کی طرف کھلتی ہیں۔ وہاں صبح کے وقت بڑا خوبصورت نظارہ ہوتا ہے۔ صبح ہم وہیں لان میں بیٹھ کر کافی پیئں گے۔"

مجھے یہ سب کچھ الف لیلیٰ والا سوتے جاگتے کا قصہ معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے میں ایک دن ایک رات کے لئے کسی ملک کا بادشاہ بنایا جا رہا ہوں۔ اس خیال سے میرے دل میں غم کی لہر سی اٹھنے لگتی تھی کہ کل صبح میں اس جنت گم گشتہ سے جدا ہو جاؤں گا۔ ایلس نے گاڑی ریسٹ ہاؤس کی ایک منزلہ عمارت کے پارکنگ میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

"آؤ ڈیئر! ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

میں گاڑی سے باہر نکلا تو سرد ہوا کے جھونکے نے میرا خیر مقدم کیا۔ ایلس گاڑی کو لاک کر رہی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ کے کالر اٹھا رکھے تھے۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دوڑتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے پورچ میں آ گئے۔ سامنے شیشے کے دروازوں والا ایک دروازہ تھا۔ وہاں کوئی چوکیدار وغیرہ نظر نہ آیا۔ ایلس دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اندر کی فضا نیم گرم تھی۔ میں ایلس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم ایک کوریڈور میں سے گذر رہے تھے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کمزور روشنی والے بلب روشن تھے۔ ہم ایک لفٹ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ایلس نے لفٹ کا بٹن دبایا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی اور مجھ پر اپنی مسکراہٹوں کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ لفٹ ہمیں اوپر والی منزل پر لے گئی۔ یہاں بھی تنگ راہداری تھی جہاں روشنی بہت ہی کم تھی۔ ایلس کہنے لگی:

"یہاں ڈاکٹروں کے اپنے اپنے کمرے ہیں جہاں وہ آرام کرنے

آجاتے ہیں۔ اسی لئے یہاں روشنیاں مدہم رکھی گئی ہیں۔ سینی ٹوریم تمہیں دکھادوں گی۔ وہاں تو چکاچوند کرنے والی روشنیاں ہوتی ہیں رات کو۔۔۔۔"

کاریڈور میں چلتے ہوئے ایلس کی اونچی ایڑی کی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔ ایلس ایک بند دروازے کے سامنے رک گئی۔ اس نے پرس میں سے چابی نکال کر تالا کھولا اور ہم کمرے میں داخل ہوگئے۔ ایلس نے بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرہ روشن ہوگیا۔ کمرہ بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ فرش سرخ قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ بڑا قیمتی فرنیچر تھا۔ دیوار کے ساتھ کیبنٹ پر وینس کا سنگ مرمر کا چھوٹا سا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا بار کاؤنٹر بنا تھا جس کے پیچھے شیلف میں مارٹینی کی بوتلیں صاف نظر آرہی تھیں۔ ایلس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے سامنے والے دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی:

"آؤ تمہیں اپنا بیڈ روم دکھاؤں۔"

بیڈ روم چھوٹا سا تھا مگر خواب کی طرح پراسرار اور حسین تھا۔ ڈبل بیڈ پر صاف ستھری پھولدار چادر بچھی تھی۔ شیر کی کھال کی طرح کا کمبل پائینتی کی جانب تہہ کر کے رکھا تھا۔ ایلس کہنے لگی:

"تم رات کو یہاں سوؤ گے۔ آؤ پہلے کھانا کھالیں۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔"

ہم لیونگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ ایلس نے انٹرکوم پر کسی کو کہا کہ دو آدمیوں کا کھانا لے آؤ۔ میری بھوک چمک اٹھی تھی۔ ایلس اٹھ کر صوفے پر میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے کھیلنے لگی۔

"تمہیں ہمارا ملک اٹلی کیسا لگا ہے؟"

میں نے کہا: "بہت خوبصورت ۔ مگر تم سارے ملک سے بڑھ کر خوبصورت ہو۔"

میں بھی جوش میں آگیا تھا اور کھل کر ایلس سے محبت کا اظہار کرنے لگا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی:

"آہ! تم مشرقی لوگ بھرپور جذبات کے ساتھ محبت کرتے ہو۔" پھر آنکھیں کھول کر کہنے لگی "مجھے بس تم لوگوں کا محبت کا یہی انداز پسند ہے۔"

وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ میرے کندھے پر رکھ دیا ہے۔ ایک بات مجھے ایلس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی خاص طور پر محسوس ہوئی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ ڈرائنگ روم کی فضا میں کسی دوائی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بو ایلس کے بیڈ روم میں زیادہ تیز محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ چونکہ یہ ہسپتال کا ریسٹ ہاؤس ہے' یہاں دوائیوں کی بو کا موجود ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہم محبت کی باتوں میں محو تھے کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر آہستہ سے کسی نے دستک دی۔ ایلس جلدی سے مجھ سے الگ ہو کر بولی:

"چلو ڈیئر' کھانا آگیا ہے۔"

ہم ڈرائنگ روم میں آگئے۔ یہاں ایک جانب کھانے کی چھوٹی گول میز لگی تھی جسے ڈائننگ ٹیبل کہتے ہیں۔ ٹیبل کے وسط میں پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ ایلس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اطالوی زبان میں آواز دے کر کہا:

"اندر آجاؤ۔"

اتنی اطالوی زبان اب میں بھی سمجھنے لگا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک

درمیانے قد کی ذرا بھاری جسم والی نوکرانی داخل ہوئی۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ سر پر نرسوں والی ٹوپی تھی۔ کمر کے ساتھ سفید ایپرن بندھا تھا۔ وہ ہاتھ میں کھانے کا طشت لئے آرہی تھی۔ اس نے بڑے سکون کے ساتھ طشت میز کے کنارے کے ساتھ ٹکادیا اور ایک ہاتھ سے کھانے کے برتن میز پر لگانے لگی۔ ایلس نے ایک قاب کا ڈھکن اٹھایا۔ اس میں مرغابی کا سالن تھا۔ ایلس خوش ہوکر بولی:

"میں نے کہا تھا نا ہمارا شیف مرغابی بڑی اچھی بناتا ہے۔ اب تم خود کھاکر دیکھ لینا۔"

ایلس اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف گئی۔ وہاں شیلف میں سے شیشے کے دو بڑے گلاس اور مارٹینی کی بوتل لے کر آگئی۔ اس نے دونوں گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی مارٹینی ڈالی۔ ایک گلاس مجھے دیا۔ پھر اپنا گلاس میرے گلاس کے ساتھ ٹکرا کر انگریزی میں کہا:

"TO,OUR,LOVE"

میں نے گلاس منہ کے ساتھ لگا کر چہرہ ذرا سا اونچا کیا تو میری نگاہ کھانا لانے والی ویٹرس پر پڑ گئی۔ جو میز کے درمیان مخروطی موم بتی روشن کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے جلدی سے نظریں نیچی کرلیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ کھانا واقعی بڑا مزیدار تھا۔ مجھے بڑی زبردست بھوک لگی ہوئی تھی۔ خوب سیر ہوکر کھایا۔ کھانے کے بعد وہی خادمہ کافی لے آئی۔ ہم صوفے پر بیٹھ گئے اور کافی پینے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ ایلس صوفے پر میرے قریب ہوکر نہیں بیٹھی بلکہ تھوڑا فاصلہ ڈال کر بیٹھی تھی۔ میں نے اسکا ہاتھ

اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور آنکھوں سے خادمہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی خادمہ کے سامنے مجھ سے بے تکلف نہیں ہونا چاہتی۔ لیکن مجھے فوراً یاد آگیا کہ جس وقت خادمہ کھانا لے کر اندر آئی تھی تو ایلس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور اس وقت اس نے خادمہ کو دیکھ کر ہاتھ نہیں چھڑایا تھا۔ مگر یہ خیال فوراً ہی میرے ذہن سے نکل گیا۔ کیونکہ ایلس برابر کافی پیتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کافی کی پیالی میز پر رکھ ایلس نے گولڈن سگریٹ کیس میں سے سگریٹ سلگایا۔ خادمہ کافی کی پیالی اٹھانے لگی تو ایلس نے خادمہ سے کہا:

"فاطمہ! تم بھی مسلمان ہو۔ اور میرا دوست بھی مسلمان ہے۔ یہ پاکستان سے آیا ہے۔"

پھر اس نے فاطمہ سے میرا تعارف کرایا۔

"یہ ہماری بڑی وفادار خادمہ ہے' اس کو میرے پاس ملازمت کرتے پندرہ سال گذر گئے ہیں۔ یہ الجزائر کی رہنے والی ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ جب ایلس نے اسے بتایا کہ میں بھی اسی کی طرح مسلمان ہوں تو خادمہ نے ذرا سا چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں تھا کہ میں خادمہ کے چونک جانے پر حیران ہوتا۔ میں نے سیر ہو کر بہترین قسم کی غذا کھائی تھی۔ تھوڑی سی مارٹینی بھی چکھی تھی۔ اوپر سے ایلس کی محبت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ میں بڑے سکون کے ساتھ صوفے پر دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ لیکن اس بات پر ضرور تھوڑا سا حیران تھا کہ ایلس مجھ سے فاصلے پر کیوں بیٹھی تھی۔

ایلس نے کافی کی خالی پیالی میز پر رکھی اور میری طرف دیکھ کر

مسکراتے ہوئے کہا:

"میں ابھی آئی۔"

سامنے باتھ روم کا دروازہ تھا جس پر انگریزی کا B کا حرف لکھا تھا۔ جب ایلس نے باتھ روم کا دروازہ اندر سے بولٹ لگا کر بند کر لیا تو خادمہ نے میرے قریب آکر جھک کر کہا:

"یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ابھی وقت ہے۔"

میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ یہ عورت مجھے اچانک بھاگ جانے کے لئے کیوں کہہ رہی ہے۔ میں ابھی اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو کہ باتھ روم کے بولٹ کھلنے کی آواز آئی۔ خادمہ جلدی سے پیچھے ہٹی اور میز پر خالی پیالیاں اٹھا کر خالی ٹرے میں رکھنے لگی۔ ایلس مسکراتی ہوئی باتھ روم سے نکل کر میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم سے پرفیوم کی تازہ سپرے کی قیامت خیز خوشبو آرہی تھی۔ خادمہ نے مجھے ایک نظر دیکھا اور ٹرے لے کر کمرے سے نکل گئی۔

ایلس میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے محبت بھری باتیں کرنے لگی۔ میرے ذہن میں خادمہ کا جملہ گھوم رہا تھا۔

"یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ابھی وقت ہے۔"

میں اس جملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر خادمہ نے یہ بات کیوں کہی تھی؟ میں نے سوچا ہو سکتا ہے الجزائر کی یہ مسلمان عورت نہ چاہتی ہو کہ میں وہاں کوئی گناہ کر بیٹھوں' یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایلس کے خلاف اس کے دل میں رقابت کا جذبہ ہو۔ میرا ذہن اس گتھی کو سلجھانے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا کہ ایلس نے اپنے نازک قرمزی ہونٹ میرے کان کے

قریب لاتے ہوئے کہا:

"اب ہمیں بیڈ روم میں چل کر آرام کرنا چاہیے' رات بہت گذر چکی ہے۔ لیکن۔۔۔۔"

میں نے اسکی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا منہ پیچھے ہٹالیا اور جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی:

"لیکن بیڈ روم میں جانے سے پہلے مارٹینی کی ایک ایک ڈرنک ضرور ہو جانی چاہیے۔"

میرا ذہن خادمہ کے مبہم سے انتباہ کو بالکل ہی بھول گیا۔ میں نے ایلس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"ضرور' ضرور"

وہ تیز قدموں سے اپنے بار کاؤنٹر کے پیچھے چلی گئی اور گلاسوں میں مارٹینی کا مشروب ڈالنے لگی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ کمرے کی روشنی میں مجھے اس کے سنہری بال سونے کی آبشار کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ایلس نے مشروب ڈالتے ہوئے تھوڑی دیر لگادی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا:

"ڈارلنگ! اتنی دیر نہ کرو۔"

ایلس کاؤنٹر سے پلٹ کر میری طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھوں میں مشروب کے نئے دو گلاس تھے۔ ان میں سرخ مشروب صاف نظر آرہا تھا۔

"تمہاری اور میری محبت کے نام۔"

اس نے ایک گلاس میرے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسرا گلاس خود لے کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی جانب سے تھوڑی دیر پہلے جو ہلکی

سی بے اعتنائی کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی مشروب کے پہلے گھونٹ کے ساتھ اڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مشروب کا ذائقہ پہلے کی نسبت کچھ کڑوا تھا۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ مشروبات میں تھوڑا تھوڑا فرق تو ہوتا ہی ہے۔ ایلس مجھ سے پیار بھری باتیں بھی کر رہی تھی اور مشروب کے ہلکے ہلکے گھونٹ بھی لے رہی تھی۔ میں نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا تھا۔ ایلس نے گھڑی دیکھی اور میرا گلاس میز پر سے اٹھا کر میرے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا اور بولی:

"ڈیئر! جلدی ختم کرو۔ باقی باتیں بیڈ روم میں چل کر ہوں گی۔"

بیڈ روم کا نام سن کر جیسے میرے اندر ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ میں نے گلاس لے کر باقی کا مشروب بھی ختم کر دیا۔ ایلس کے گلاس میں ابھی مارٹینی باقی تھی۔ اس نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور صوفے پر مجھ سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا:

"میرے قریب ہی رہو۔ ایلس۔"

مجھے اپنی آواز پر کسی دوسرے مرد کی آواز کا گمان ہوا۔ میں نے اپنی ناک سکیڑ کر غور کیا کہ یہ آواز کس کی تھی؟ پھر خود ہی ہنس پڑا کہ یہ میں کس قسم کی باتیں سوچنے لگا ہوں۔ اس دوران ایلس نے کافی ٹیبل کے نیچے جو ٹیلی فون پڑا تھا۔ وہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور کوئی نمبر ملا رہی تھی۔ میں نے ایلس کے بازو کر پکڑ کر یہ کہنے کی کوشش کی کہ ڈارلنگ اس وقت کس کو فون کر رہی ہو۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ میرا بازو اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہل رہا۔ میں گھبرا سا گیا۔ ایلس کسی کو فون پر اطالوی زبان میں کچھ بتا رہی تھی اور تھوڑا تھوڑا مسکرا بھی رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی

ہے۔ پھر اس کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ اب مجھے صرف اس کے ہونٹ ہی ہلتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ مجھے زبردست چکر آیا اور میرا سر اپنے آپ صوفے کی پشت سے جا لگا۔

ایلس نے فون بند کر کے میری طرف دیکھا۔

اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی طرح میری نبض پر ہاتھ کر دیکھا۔ وہ ایکدم سے ایک اجنبی عورت بن گئی تھی۔ مجھے اپنی کلائی پر ایلس کا ہاتھ بہت ہلکا سا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرا سارا جسم پتھر بن گیا ہے۔ سر بھاری ہو گیا تھا۔ کمرے کی ہر شے گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے دماغ میں مسلمان خادمہ کا فقرہ گونج رہا تھا:

"یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ابھی وقت ہے۔"

مگر اب وہاں سے بھاگنے کا وقت گذر چکا تھا۔ میری ٹانگیں بھی سن ہو رہی تھیں۔ میں نے آخری منظر یہ دیکھا کہ وہ اطالوی حسینہ میرے گالوں پر دائیں بائیں زور زور سے طمانچے مار رہی ہے اور مجھے محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ میں اپنی آنکھوں کے بوجھل پپوٹے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر پپوٹے اتنے بھاری ہو گئے ہیں کہ اوپر نہیں اٹھ رہے۔

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو سب سے پہلے مجھے آئیڈوفارم کی ہسپتالوں والی تیز بو محسوس ہوئی۔ میرا سر ابھی چکرا رہا تھا۔ پپوٹے بھاری تھے۔ میں نے کوشش کر کے پپوٹے الگ کئے تو مجھے اپنے اوپر چھت کے ساتھ لگا ہوا وہ بیضوی بڑا سا گلوب نظر پڑا جو آپریشن تھیٹروں میں آپریشن کرنے والی میز کے اوپر لگا ہوتا ہے۔ اس گلوب کی صرف ایک بتی روشن تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ

پاؤں ہلانے چاہے تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرا جسم آپریشن ٹیبل پر بندھا ہوا تھا۔ دہشت کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ خدا جانے یہاں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میرے حلق سے عجیب ڈراؤنی مگر بے حد کمزور آواز نکلی تو دو آدمی سٹریچر کے پاس آکر مجھ پر جھک گئے۔ انہوں نے ڈاکٹروں والے سفید کوٹ پہن رکھے تھے۔ سرخ و سفید چہرے ساکت اور پتھر کی طرح سخت لگ رہے تھے۔ ان کے سروں پر بھی سفید ٹوپیاں تھیں۔ ایک چہرہ میری آنکھوں کے بالکل قریب جھک کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے انگلی سے میرے پپوٹوں کو اوپر نیچے کر کے دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے ڈاکٹر نے شیشے کی ٹرالی میں سے سرنج اٹھایا۔ اور میرے بازو پر سے سفید چادر ہٹا کر انجکشن لگا دیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

دوسری بار مجھے ہوش آیا تو میرے سر کے چکر ختم ہو چکے تھے۔ میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا مگر بے حد نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی آپریشن تھیٹر میں ہی ہوں۔ میرے دونوں ہاتھ اور پاؤں چمڑے کی بیلٹ کے ساتھ سٹریچر کے کناروں پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ایک بیلٹ نے میرے سر کو بھی اپنے شکنجے میں لے رکھا ہے۔ میں نے نگاہیں ادھر ادھر پھرا کر آپریشن تھیٹر کا جائزہ لیا۔ آپریشن تھیٹر کی اوپر والی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ صرف دیوار والا بلب روشن تھا۔ سامنے دیوار کے ساتھ الماری لگی تھی جس میں دوائیوں کی بوتلیں اور آپریشن کرنے والے اوزار نظر آ رہے تھے۔ الماری کے ساتھ ہی شیشے کی ٹرالی پر بھی آپریشن کے کچھ آلات اور تام چینی کا ایک بیضوی برتن پڑا

تھا۔ یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ یہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میرے گناہ بخش دے' میرے خدا! میری غلطیوں کو معاف فرمادے اور مجھے اس مشکل سے نکال دے۔ خدا جانے یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔

ایلس کا تو کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ مجھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں جھکا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ دونوں میرے سٹریچر کے پاس آئے۔ انہوں نے بھی ڈاکٹروں والے سفید کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک نے میرے سینے پر سے سفید چادر میری ناف تک ہٹادی۔ دوسرے نے میرے پیٹ اور سینے پر کوئی کریم لگائی اور پہلے والے نے استرے سے میرے سینے اور پیٹ کی شیو کرنی شروع کر دی۔ میں نے آواز نکالنی چاہی۔ لیکن معلوم ہوا کہ میرے بدن میں تو پوری جان واپس آگئی ہے لیکن آواز نہیں نکل رہی' جیسے گلا بیٹھا ہوا ہو۔ میں نے پورا زور لگا کر بولنے کی کوشش کی مگر آواز حلق میں ہی دب کر رہ گئی۔ مجھ پر خوف طاری ہو رہا تھا۔ یہ لوگ میرے آپریشن کی تیاریاں کر رہے تھے مگر میرا کس چیز کا آپریشن کیا جا رہا تھا؟ مجھے تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ معاملہ مزید الجھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ روبوٹ مشینوں کی طرح اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے سینے اور پیٹ کو استرے سے بالکل صاف کر کے وہاں گلابی رنگ کی دوائی لگائی۔ مجھ پر چادر ڈالی اور کمرے سے نکل گئے۔ جتنی دیر وہ میرے سٹریچر کے پاس رہے' انہوں نے آپس میں بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے دروازہ باہر سے لاک کرنے کی آواز آئی۔

اب میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرے سامنے لاہور شہر کا'

اپنے محلے کا اور اپنے بھائی بہنوں کا نقشہ پھر گیا۔ ان سب کی شکلیں میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ اب مجھ پر الجزائری مسلمان خادمہ کی بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ اس نے مجھے کس لئے متنبہ کیا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ابھی وقت ہے۔ واقعی اگر اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ میرے ساتھ کیا حشر ہونے والا ہے تو میں ایلس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دیتا۔ اگر ایلس تھوڑی دیر مزید باتھ روم میں رکتی تو ہو سکتا تھا کہ مسلمان خادمہ مجھے سب کچھ بتا دیتی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور ایلس مجھے پھنسا کر وہاں کس لئے لائی ہے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میری قسمت خراب تھی کہ ایلس بہت جلد باتھ روم سے باہر آگئی۔ اور مسلمان خادمہ کو مزید تفصیل بتانے کی مہلت نہ مل سکی۔

وہاں مجھے وقت کا بھی کوئی احساس نہ تھا۔ کمرے میں کوئی گھڑی نہیں لگی تھی۔ صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو چکا تھا کہ میں سفید چادر کے نیچے سر سے پاؤں تک ننگا ہوں۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات ہے کہ دن اور میں وہاں کب سے پڑا ہوں۔ اور یہ کونسی جگہ ہے۔ اگر ہسپتال ہے تو کونسا ہسپتال ہے اور مجھے وہاں کیوں لایا گیا ہے۔ یہ تلخ حقیقت مجھ پر واضح ہو چکی تھی کہ ایلس ایک مکار عورت تھی جو مجھے ورغلا کر اپنے دام میں پھنسا کر یہاں چھوڑ گئی تھی۔ وہ کس مقصد کے لئے مجھے یہاں چھوڑ گئی تھی اور کیوں چھوڑ گئی تھی اور میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ یہ سوال ایک ایسا معمہ تھا کہ جس کی گتھیاں سلجھنے کی بجائے مزید الجھتی جا رہی تھیں۔ اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ جب اس نے مارٹینی کے آخری گلاس میں کچھ ملا کر مجھے مشروب پلایا تھا اور میرا جسم سن ہونا شروع ہو گیا تھا تو وہ فون کیوں کر رہی تھی۔ جس شخص کی طرف سے وہ مجھے یا کسی بھی ٹورسٹ کو پھنسا کر وہاں لانے اور کمرے میں لا کر

مجھے یا کسی بھی ٹورسٹ کو پھنسا کر وہاں لانے اور کمرے میں لاکر بے ہوشی کی دوائی پلانے کے کام پر لگائی گئی تھی، وہ اس کو ٹیلی فون پر اطلاع دے رہی تھی کہ میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے، یہاں آکر اپنا شکار لے جاؤ۔ ایلس کے لئے میرے دل میں نفرت اور انتقام کے جذبات کا ایک طوفان بار بار اٹھ رہا تھا مگر اب اسکا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پانی سر سے گذر چکا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ مجھے اپنے بدن میں طاقت واپس آتی ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر حلق میں جیسے دھوڑ سی اڑ رہی تھی۔ آواز کوشش کے باوجود نہیں نکلتی تھی۔ سر بھاری تھا اور چونکہ چمڑے کی پٹی میں جکڑا ہوا تھا، اس لئے میں اسے ہلا جلا بھی نہیں سکتا تھا۔ بس آنکھیں کھلی تھیں اور خالی کمرے میں بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں چھت اور سامنے دیوار کی طرف ہی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں، دل ہی دل میں پڑھنی شروع کر دیں۔ میں گڑگڑا کر اللہ تعالی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور جذبات کی شدت سے میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ یہ کیفیت نہ جانے کب تک مجھ پر طاری رہی۔ پھر مجھے نیند آگئی یا میں نیم بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ اس وقت کھلی جب کمرے میں مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ میرے پپوٹے اب بھاری نہیں تھے۔ میں نے تین آدمیوں کو اپنے اسٹریچر کے پاس کھڑے دیکھا۔ ان میں سے دو آدمیوں نے ڈاکٹروں والا لمبا سا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ تیسرا آدمی ایک بوڑھا شخص تھا۔ جسکی فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی۔ آنکھوں پر سنہری فریم والا چشمہ لگا تھا۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ وہ بہترین تھری پیس سوٹ میں تھا اور

اس کے ایک ہاتھ میں چھڑی بھی تھی۔ وہ چھڑی کے سہارے ایک طرف کو ذرا سا جھکا ڈاکٹروں سے اطالوی زبان میں کچھ باتیں کر رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے میری آنکھیں کھلی دیکھیں تو میری طرف اشارہ کیا۔ دونوں ڈاکٹر اور تیسرا آدمی میری طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی۔ بوڑھا آدمی بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ مجھے جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی اور مجھے اس کے نقلی دانت نظر آرہے تھے۔ میں نے سارا زور لگا کر کچھ بولنا چاہا۔ مگر آواز نے میرا ساتھ نہ دیا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن لگا دیا جس سے میرے پپوٹے بھاری ہونا شروع ہوگئے۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہوگئیں۔ میں نے آخری آواز جو سنی وہ کسی کے ہلکے سے ہنسنے کی آواز تھی۔ یہ وہ بوڑھا اطالوی ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد میری سماعت اور بینائی معطل ہوگئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے میرے بازو میں کوئی شے چبھی ہے۔ میں نے کوشش کی تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے اسٹریچر کے بائیں جانب ایلس کی نرس خادمہ فاطمہ کھڑی تھی اور میرے بازو میں کوئی انجکشن لگا رہی ہے۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ یہ عورت نہ جانے کس دوائی کا انجکشن لگا رہی تھی۔ یہاں سب میرے دشمن تھے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ انجکشن کی دوائی میرے خون میں حل ہو کر میرے حواس کو کچھ توانائی دے رہی تھی۔ میں نے بولنا چاہا مگر مجھ سے بولا نہ گیا۔ فاطمہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں دل میں حیران ہوا کہ یہ ایسا اشارہ کیوں کر رہی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ فاطمہ بڑے تیز تیز قدموں سے آپریشن کے آلات والی الماری کے پاس گئی۔ الماری میں انجکشن کی سرنج رکھی۔ شیشے کا دروازہ بند کیا۔ تیز تیز قدموں سے میرے اسٹریچر کے پاس آئی اور جلدی جلدی چمڑے کی پیٹیاں جس کے ساتھ میں اسٹریچر پر بندھا ہوا تھا، کھولنے لگی۔ اس نے سہارا دے کر مجھے اسٹریچر پر بٹھا دیا اور آہستہ سے انگریزی میں کہا:

"کیا تم چل سکتے ہو؟"

میں نے اشارے سے کہا کہ ہاں۔ میں فاطمہ کے سہارے اسٹریچر سے اترا۔ میرے پاؤں ڈگمگا گئے۔ اس نے مجھے تھام لیا اور آہستہ سے کہا:

"اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے پاؤں پر جتنی جلدی چل سکو، چلنا ہو گا۔"

میرے اندر یہ جملہ سن کر جیسے ایک نئی طاقت آگئی۔ میرے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ میرے اوپر جو چادر پڑی تھی، وہی میں نے جسم کے گرد لپیٹ لی اور فاطمہ کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹانگوں میں مجھے کمزوری ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر میں چل سکتا تھا۔ فاطمہ نے آہستہ سے دروازے کو کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا، پھر مجھے لے کر باہر کوریڈور میں آگئی۔ یہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کونے میں صرف ایک کمزور سا بلب روشن تھا۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی اور مجھے بھی اپنے ساتھ تیز تیز چلا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ فاطمہ میری ہمدرد ہے اور مجھے موت کے منہ سے نکالنے آئی ہے۔ زندہ بچ جانے کے احساس نے میرے اندر توانائی بھر دی تھی۔ میں اس کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ کوریڈور دائیں جانب مڑ گیا تھا۔ یہاں ایک دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا جو بند تھا۔ فاطمہ نے اپنے ایپرن کی جیب میں سے ایک کنجی نکال کر تالے میں گھمائی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی دروازے کے اندر لے گئی اور اندر جاتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کا تالہ اپنے آپ لگ گیا تھا۔ میں ایک نیم روشن چھوٹے سے سٹور میں کھڑا تھا۔ فاطمہ لکڑی کی الماریوں کی جانب آئی۔ یہاں ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ زینے کے آخر میں نیچے ایک بلب جل رہا تھا۔

وہ مجھے ساتھ لے کر زینے سے اترنے لگی۔ وہ کوئی بات نہیں

کر رہی تھی۔ میں تو ویسے بھی بول نہیں سکتا تھا۔ مجھے نیچے کمرے میں آکر ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ یہ دیکھ کر مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا کہ اس کمرے میں دیواروں کے ساتھ مردہ لاشیں اسٹریچروں پر پڑی تھیں۔ فضا میں عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ فاطمہ مجھے یہاں سے نکال کر ایک لمبی سی راہ داری میں سے گذارنے لگی۔ یہاں بھی زیادہ روشنی نہیں تھی۔ راہداری کے کونے میں جاکر فاطمہ رک گئی۔ یہاں ایک بند دروازہ تھا۔ فاطمہ نے مجھے آہستہ سے کہا:

"ٹھہرو۔"

اس دروازے کو بھی آٹو میٹک لاک لگا ہوا تھا اور صرف چابی سے ہی کھل سکتا تھا۔ فاطمہ اس کی چابی بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے کھولا تو پہلی بار مجھے تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ باہر اندھیرا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ سردی تھی اور میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ فاطمہ نے جھک کر دھیمی آواز میں کہا:

"سامنے درختوں کے جھنڈ میں ایک گاڑی کھڑی ہے' اس کی پچھلی سیٹ کھول کر بیٹھ جانا۔ وہاں دو کمبل پڑے ہیں۔ ڈرائیور تمہیں ایک مکان میں پہنچا دے گا' میں تمہیں وہاں ملوں گی۔ جتنی تیز چل سکتے ہو' چل کر گاڑی تک پہنچو۔"

فاطمہ نے مجھے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ میں ہسپتالوں والی سفید چادر جسم پر لپیٹے ٹھٹھر رہا تھا۔ باہر اندھیرے میں اب مجھے کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے آسمان پر تارے چمکتے دیکھے۔ میں تقریباً دوڑ کر سامنے والے درختوں کے پاس چلا گیا۔ وہاں ایک طرف کار کھڑی تھی۔ کار میں اندھیرا تھا۔ فاطمہ نے مجھے جیسے کہا تھا' اس کے مطابق میں نے جاتے ہی پچھلی

سیٹ کا دروازہ کھولا اور کار میں گھس گیا۔ سیٹ پر کمبل تھے۔ میں نے ایک کمبل اوپر لے لیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی کار کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ درختوں میں سے نکل کر ایک طرف کو روانہ ہوگئی۔ مجھے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کا ہیولا سا نظر آیا۔ میں کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر سیٹ پر لیٹ گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے فاطمہ کو رحمت کا فرشتہ بنا کر میری مدد کو بھیج دیا۔

گاڑی کسی سڑک پر کافی تیز چلی جا رہی تھی۔ پھر اسکی رفتار ہلکی ہوگئی اور ایک طرف مڑ گئی۔ جس سڑک پر وہ مڑی تھی، وہ ناہموار تھی۔ گاڑی کو وہاں ہلکے ہلکے دھچکے لگ رہے تھے۔ اس طرح چلتے ہوئے گاڑی نے کئی موڑ کاٹے۔ پھر وہ سڑک کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ میں نے کھڑکی کے بند شیشے میں سے باہر دیکھا۔ باہر کسی طرف سے کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے اپنا سر سیٹ کے ساتھ لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ڈرائیور بالکل خاموش تھا۔ اس نے اب تک مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں ذرا سا کھانسا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری آواز واپس آ رہی ہے۔ میں نے حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے کوئی درد سے ہائے کرتا ہے۔

یہ دیکھ کر میری جان میں جان آگئی کہ میں بول سکتا تھا۔ میری آواز واپس آگئی تھی۔ میری ہائے کی آواز پر بھی ڈرائیور نے گھوم کر پیچھے نہ دیکھا۔ یہ کسی ٹیلے کی چڑھائی تھی۔ چڑھائی ختم ہوئی تو ڈھلان آگئی۔ گاڑی اب نشیب پر اتر رہی تھی۔ پھر سڑک سیدھی ہوگئی۔ مگر سڑک غیر ہموار تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے دھچکا لگتا تھا۔ دونوں کمبلوں نے مجھے گرم کر دیا تھا۔

اچانک گاڑی نے ایک موڑ کاٹا۔ اس کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ پھر وہ

ایک طرف گھوم کر کھڑی ہوگئی۔ میں پچھلی سیٹ پر ہی پڑا رہا۔ ڈرائیور اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ وہ میری طرف آنے کی بجائے ایک طرف چل دیا۔ میں نے سر اٹھا کر منہ شیشے کے ساتھ لگا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ یہاں بھی باہر کہیں کوئی روشنی نہیں تھی۔ رات کے اندھیرے میں مجھے آس پاس درختوں کے سیاہ ہیولے ہی نظر آرہے تھے۔ ان درختوں میں ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا جس کا دھندلا سا خاکہ دکھائی دے رہا تھا۔ ڈرائیور اس کاٹیج کے پاس جاکر اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ میں نے سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔ مجھے بھوک اور پیاس محسوس ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور گاڑی کی طرف آیا۔ اس نے دروازہ کھول کر انگریزی میں صرف اتنا کہا: "کم" اور کاٹیج کی طرف چل پڑا۔ میں گاڑی سے نکلا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کاٹیج کا پرانا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ڈرائیور نے ایک موم بتی جلا کر میز کے کونے سے لگا دی اور دروازے کے پاس جاکر بولا:

"میں دروازے کو باہر سے تالا لگا کر جارہا ہوں۔ میری بہن فاطمہ تھوڑی دیر میں آئے گی۔ اس کے پاس دوسری چابی ہے' کھڑکی کو بند ہی رکھنا۔"

یہ کہہ کر وہ دروازہ باہر سے لاک کر کے چلا گیا۔

میں نے موم بتی کی دھیمی روشنی میں کاٹیج کے کمرے کا جائزہ لیا۔ میں ابھی تک میز کے پاس کھڑا تھا۔ چھوٹا سا شکستہ کمرہ تھا۔ دیواروں کا پلستر اکھڑ رہا تھا۔ کونے میں ایک لوہے کا پلنگ بچھا تھا' اس قسم کے پلنگ ہسپتالوں میں ہوتے ہیں۔ پلنگ پر خاکی گدیلا اور دو کمبل تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔

صاف لگ رہا تھا کہ یہ کمبل آج ہی کسی نے یہاں لگائے ہیں۔ ایک لکڑی کی پرانی کرسی میز کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ نہیں تھا۔ عقبی دیوار میں مجھے ایک دروازہ نظر آیا۔ میں نے اسے آہستہ سے کھولا۔ یہ باتھ روم تھا۔ میں دروازہ بند کر کے پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں گاڑی سے بھی ایک کمبل جسم کے گرد لپیٹ کر یہاں آیا تھا۔ فضا میں نمی اور ٹھنڈک تھی۔ میں نے پلنگ پر سے اور کمبل جسم کے گرد لپیٹا اور سمٹ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے سخت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ پیاس لگی تو میں جلدی سے اٹھ کر باتھ روم گیا۔ سنک کا نلکا کھولا۔ پانی آرہا تھا۔ میں نے تھوڑا سا پانی پیا۔ اور واپس پلنگ پر آکر لیٹ گیا۔

موم بتی کی دھیمی روشنی میں کمرے کی فضا آسیب زدہ لگ رہی تھی۔ باہر وحشت ناک خاموشی تھی۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ رات کتنی گذر گئی ہے۔ نقاہت کی وجہ سے ڈرائیور سے بھی میں نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ فاطمہ کا بھائی تھا۔ اب میں فاطمہ کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ ہسپتال میں موت کے اسٹریچر پر پڑے پڑے میرا جسم پتھر کی طرح سخت ہو گیا ہوا تھا۔ اب جی چاہتا تھا کہ بیٹھا رہوں۔ چنانچہ میں پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ کمبلوں میں مجھے بڑا سکون مل رہا تھا۔ سردی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد جلدی سے دوبارہ آنکھیں کھول لیتا اور کان لگا کر باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگتا۔ باہر کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ مگر یہ میرا خوف تھا۔ میں اپنے خیال میں ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھا۔ میری جان ابھی تک خطرے میں تھی۔ میں موت کے

ہسپتال سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اگر فاطمہ کو وہاں کے ڈاکٹروں نے پکڑ کر اس پر تشدد کیا اور انہیں میرے ٹھکانے کا پتہ چل گیا تو وہ ضرور یہاں آکر مجھے پکڑ لیں گے۔ میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ میرا کس چیز کا آپریشن کرنا چاہتے تھے۔ کیا وہ میرے جسم کے سارے اعضائے رئیسہ اندر سے نکال کر بوتلوں میں بند کر کے ہسپتال کی زینت بنانا چاہتے تھے؟ میں نے اکثر ہسپتالوں میں ایسے شیشے کے مرتبان دیکھے ہوئے تھے جن میں انسانی دل، گردے اور جگر رکھے ہوتے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ یہ تپ دق کا ہسپتال تھا۔ ہو سکتا ہے یہ ڈاکٹر میرے صحت مند پھیپھڑے نکال کر مرتبان میں ڈال کر نمائش کے لئے رکھنا چاہتے ہوں کہ ڈاکٹری کے طالب علموں کو دکھائیں کہ دیکھو، صحت مند پھیپھڑے ایسے ہوتے ہیں۔

یہی سوچتے سوچتے ایک بار پھر مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ لیکن مجھے باہر کی فضا کا بھی احساس تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گذر چکا تھا کہ مجھے باہر گاڑی کے رکنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے پلنگ پر سے اٹھا اور دروازے کے سوراخ میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ دروازے میں کوئی سوراخ نہیں مل رہا تھا۔ میں نے جہاں تالا لگا تھا، اس کے سوراخ میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر باہر اندھیرا تھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ پھر انسانی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ قدم دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں دوڑ کر پلنگ کے پیچھے چھپ گیا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا کہ اگر کوئی ہسپتال کا ڈاکٹر اندر داخل ہو تو اس کے سر پر ضرب لگا سکوں۔

تالے میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ یہ میری محسن فاطمہ ہی ہو سکتی

تھی۔ میں جلدی سے پلنگ پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا اور جلدی سے بند ہو گیا۔ فاطمہ اندر آچکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک تھیلا تھا۔ وہ میز کے پاس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ موم بتی کی روشنی میں اسکا چہرہ مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ تھیلے میں سے اس نے ایک پیکٹ نکال کر میز پر رکھا۔ پھر ایک لفافہ نکالا اور کہنے لگی:

"اس میں کچھ سینڈو چز ہیں۔ تھرماس میں کافی بھی ہے۔ تمہیں ہم تین دن سے لیکوئڈ خوراک دے رہے تھے، اسی لئے تمہیں زیادہ بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہوگی۔"

اس نے لفافے میں سے سینڈو چز نکال کر کاغذ کی تھالی پر رکھ کر میری طرف بڑھائے۔ میں سینڈو چز کھانے لگا۔ میں نے پوچھا:

"فاطمہ! میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ مگر مجھے ایک بات تو بتاؤ۔ یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے؟"

فاطمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھرماس میں سے اس نے کافی، کاغذ کے گلاس میں ڈالی اور میرے پاس رکھ دی۔ پھر پیکٹ کھولا۔ اس میں سے میرا بٹوہ نکالا۔ کہنے لگی:

"اس میں تمہارا پاسپورٹ بھی ہے اور کچھ اطالوی لیرے بھی۔ تمہارے کپڑے میں نہیں لا سکی، کیونکہ اس قسم کے کیس میں ڈاکٹر سب سے پہلے مریض کے کپڑے جلا ڈالتے ہیں۔"

میں نے فوراً پوچھا:

"مگر مجھے کونسا مرض تھا، میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس مکار ایلس نے مجھے ڈرنک میں نہ جانے کیا پلا دیا کہ میں تو بالکل پتھر بن گیا تھا۔"

فاطمہ نے تھرماس کے ڈھکنے میں اپنے لئے تھرماس میں سے کافی ڈالی اور اس کے دو تین گھونٹ بڑے اطمینان سے پی کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی طمانیت تھی۔ چہرے پر ایسی معصوم روشنی اور محبت تھی جو کسی بہن کے چہرے پر اس وقت آجاتی ہے جب وہ اپنے بھائی کو کسی مصیبت سے بچالے۔

میں نے کہا:

"فاطمہ بہن! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ یہ لوگ میرا کونسا آپریشن کرنے والے تھے؟"

فاطمہ نے بلیک کافی کا گھونٹ بھرا اور بولی:

"تم جلدی جلدی کھانا ختم کرو۔ تمہیں دن نکلنے سے پہلے پہلے میرے بھائی کے ساتھ ایک دوسری جگہ پر نکل جانا ہے۔"

"کیا تمہارا بھائی تمہارے ساتھ آیا ہے؟"

"ہاں۔ مگر وہ واپس ہسپتال چلا گیا ہے' میں نے خود اسے بھیجا ہے۔ تمہیں ابھی معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا۔ میں نے وہ کام کیا ہے جو آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ جانتے ہو کہ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں نے ہی تمہیں ہسپتال سے بھگا دیا ہے تو وہ میرے ساتھ اور میرے ڈرائیور بھائی کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ نہیں۔۔ تم اسکا اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

میں نے جلدی جلدی سینڈوچز کھالئے۔ کافی بھی ساری ختم کر دی۔ فاطمہ نے اپنی جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کر مجھے دی۔

"یہ سگریٹ اور ماچس بھی تمہاری پتلون کی جیب سے نکلی تھی۔ مگر

یہاں سگریٹ مت پینا۔ تمباکو کی خوشبو باہر جنگل میں چلی جائے گی۔"

سگریٹ پینے کو میرا بری طرح دل چاہ رہا تھا مگر یہ میری اور فاطمہ بہن کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں نے سگریٹ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ میں نے کہا:

"میرے پاس کپڑے نہیں ہیں فاطمہ بہن۔"

اس نے خالی لنچ باکس اور کاغذوں کو لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا:

"میرا بھائی آتے ہوئے تمہارے لئے کپڑے بھی لیتا آئے گا۔ میرا خیال ہے تمہیں اس کے کپڑے پورے آجائیں گے۔ تم دونوں کا جسم اور قد ایک جیسا ہی ہے۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے فاطمہ سے پھر وہی سوال کر دیا جس کا جواب دینے سے وہ گریز کر رہی تھی اور جس کا جواب سننے کے لئے میں بے تاب تھا۔

"فاطمہ بہن! یہ ڈاکٹر لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے؟"

فاطمہ اٹھ کر دروازے تک گئی۔

اس نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھا۔ پھر دیوار میں جو کھڑکی بند تھی، اس کے پاس جا کر کھڑکی کو ذرا سا کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کو بند کر دیا اور میرے پلنگ کے پاس کرسی پر آکر اپنی گرم جیکٹ کو سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ جیسی بھی ہمیں انگریزی آتی تھی، ہم اس میں بات کر رہے تھے۔ کیونکہ فاطمہ بہن کو عربی، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے علاوہ انگریزی بھی تھوڑی تھوڑی آتی تھی۔ میں اس کی باتوں کو وسیع اور پورے مفہوم کے

ساتھ اردو میں یہاں آپ کے لئے لکھ رہا ہوں۔

فاطمہ نے کہا:

"برادر! یہ ہسپتال ایک بڑے مشہور ٹرسٹ کا ہسپتال ہے۔ یہاں ایسے مریضوں کو لاکر رکھا جاتا ہے جن کی بیماری تیسرے درجے تک پہنچ گئی ہوتی ہے۔ سینی ٹوریم کے ڈاکٹر بڑے شفیق اور مریضوں کے ہمدرد ڈاکٹر ہیں۔ مگر پچھلے تین برسوں سے یہاں خفیہ طور پر ایک بڑا ہی گھناؤنا کاروبار ہو رہا ہے۔ یہ گھناؤنا کاروبار سینی ٹوریم کے ایک لالچی اور بدکردار ڈاکٹر نے شروع کیا جو شہر کے ہسپتال سے تبدیل ہو کر یہاں آیا تھا۔ ضرور وہ شہر والے ہسپتال میں بھی یہی مکروہ دھندا کرتا رہا ہو گا۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا:

"وہ کاروبار کیا تھا؟"

فاطمہ کا چہرہ موم بتی کی روشنی میں بڑا پراسرار لگنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دے رکھے تھے۔ اور کرسی پر سمٹ کر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی:

"اس بدکردار ڈاکٹر کا شہر کے ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق ہے۔ اس گروہ کے آدمی اٹلی اور یورپ کے ایسے ارب پتی بوڑھوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں جو دل کے مریض ہوتے ہیں اور جنہیں ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہوتا ہے کہ ان کے دل کے مرض کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ ان کا دل تبدیل کر دیا جائے مگر اس کے لئے کسی ایسے شخص کا دل لگایا جا سکتا ہے جسے مرے تھوڑی دیر ہوئی ہو۔ اس میں بھی گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ مردہ دل

ان کی بوڑھی شریانوں کے ساتھ جڑ کر دوبارہ دھڑکنے لگے گا یا نہیں۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور میں ہمہ تن گوش ہو کر فاطمہ کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دل کا آپریشن ہونے والا ہے۔ فاطمہ کہہ رہی تھی:

"یہ بدکردار ڈاکٹران ارب پتی بوڑھے، دل کے مریضوں سے رابطہ کر کے ان سے بیس لاکھ امریکی ڈالروں میں سودا طے کرتا ہے کہ ہم کسی نوجوان کا زندہ صحت مند دھڑکتا ہوا دل نکال کر تمہارے بوڑھے بیمار دل کی جگہ لگا دیں گے اور یوں تم باقی زندگی ہارٹ اٹیک سے بے خوف ہو کر مزے سے بسر کر سکو گے۔"

"میرے خدا!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ میں فاطمہ کے چہرے کو تک رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی:

"یورپ اور خاص طور پر اٹلی میں ایسے ارب پتی بوڑھے صنعت کاروں کی کمی نہیں ہے جن کے بیمار دل ناکارہ ہو چکے ہیں اور جو کسی وقت بھی مر سکتے ہیں۔ ان بیمار ارب پتی بوڑھوں کے لئے بیس لاکھ ڈالر کی رقم کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ وہ اپنے ناکارہ، بیمار اور ناقابل اعتبار دل کی جگہ کسی صحت مند نوجوان کا دل لگوانے پر فوراً راضی ہو جاتے ہیں اور دس لاکھ ڈالر ایڈوانس ادا کر دیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا:

"ایسے نوجوان کہاں سے پکڑے جاتے ہیں؟ کیا پولیس کو پتہ نہیں چلتا؟"

فاطمہ نے کہا:

"جیسے تم پکڑے گئے ہو۔ باقی پولیس کیا کر سکتی ہے جب کہ جس نوجوان کا دل نکالا گیا ہوتا ہے' اس کی لاش بھی نہیں ملتی۔ اس مقصد کے لئے عام طور پر اٹلی میں وارد ہونے والے غیر ملکی سیاح نوجوانوں کو پھانسا جاتا ہے۔ ایلس اس مکروہ گروہ کی آلہ کار ہے۔ وہ رات کے وقت کسی نوجوان سیاح کو دیکھتی ہے اور پھر اسے لفٹ دے کر اس سے محبت کا اظہار کر کے ہسپتال کے ریسٹ ہاؤس میں لاتی ہے اور اس کے ساتھ وہی کچھ ہوتا ہے جو تمہارے ساتھ ہوا اور ہونے والا تھا۔"

میں نے پوچھا:

"کیا سینی ٹوریم میں بھی کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ یہاں اس قدر گھناؤنا کاروبار ہو رہا ہے۔"

"یہ کام بڑی رازداری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔" فاطمہ کہنے لگی "ہسپتال کے صرف تین ڈاکٹر اس مکروہ دھندے میں شامل ہیں۔"

"اور تم بھی اسی گروہ میں شامل ہو گئی؟"

میرے سوال پر فاطمہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ پھر کہنے لگی:

"اس گروہ کے بدکردار ڈاکٹر کو' جو سرغنہ ہے' ہم سب کی کمزوریوں کا علم ہے' دوسرے ڈاکٹروں کو وہ بیس لاکھ میں سے مناسب حصہ دیتا ہے۔ میں نے اس کام میں آلہ کار بننے سے انکار کیا تو سنگ دل ڈاکٹر نے کہا کہ وہ میری اکلوتی بیٹی کو جو الجزائر میں ہے' قتل کروا کر اس کی لاش میرے کمرے میں پھنکوا دے گا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس کے قاتل ساتھی یورپ کے ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہسپتال میں ایک دوسری نرس نے اس مکروہ کاروبار میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس شیطان صفت

ڈاکٹر نے پہلے اس کے ماں باپ کو قتل کروا دیا۔ نرس نے پولیس میں رپورٹ کرنے کی دھمکی دی تو دوسرے روز اس کی لاش اس کے کمرے میں خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس کا قاتل آج تک نہیں مل سکا۔ برادر! میں ایک کمزور دل عورت ہوں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے جو الجزائر میں رہ رہی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ قتل ہو جائے۔ چنانچہ میں شیطان ڈاکٹر کے ساتھ مل گئی ہوں مگر میں نے آج تک اس سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا کہ شاید خدا اس کے بدلے میرے گناہوں کو معاف کر دے۔"

"آج تک اس ہسپتال میں کتنے سیاحوں کے دل نکال کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے؟"

میرے سوال پر فاطمہ نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا:

"تین برس میں صرف تین کیس اب تک ہوئے ہیں۔ تمہارا نمبر چوتھا تھا۔"

"اور ان تینوں نوجوانوں کی لاشوں کا کیا بنا؟"

"ڈاکٹروں اور خاص طور پر سرجن ڈاکٹروں کے لئے کسی لاش کو ٹھکانے لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ان تینوں نوجوان سیاحوں کی لاشوں کو تیزاب کے ٹب میں ڈال کر تحلیل کر دیا گیا تھا۔ سیاحوں کو یہ لوگ اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ ان کا کوئی یہاں والی وارث نہیں ہوتا۔ ویسے شہر کے دوسرے آوارہ گرد عیاشی پسند نوجوانوں کو بھی پھانس لیا جاتا ہے۔"

میں نے فاطمہ سے پوچھا کہ اس نے مجھے کس لئے بچا لیا۔ بلکہ اپنی اور اکلوتی بیٹی کی زندگی خطرے میں ڈال کر مجھے بچانے کی کوشش کیوں کی۔

اس کے جواب میں فاطمہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا:

"کیونکہ تم مسلمان ہو۔ جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک مسلمان ملک کے مسلمان نوجوان سیاح کو قتل کرنے والے ہیں اور ایلس نے تمہارے سامنے مجھے بتایا کہ تم بھی مسلمان ہو تو میں نے اسی وقت تمہاری جان بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ خداوند کریم میرے اس عمل کے بدلے میرے گناہوں کو معاف کر دے گا۔"

فاطمہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی۔ کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھول کر اس نے باہر دیکھا۔ جلدی سے پٹ بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی:

"یہ ویران جگہ ہے۔ یہاں کوئی نہیں آتا، پھر بھی مجھے بے حد احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ صبح صبح تمہارا آپریشن ہو گا۔"

اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا:

"اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد تمہیں اس کمرے سے نکال کر جہاں سے میں تمہیں اٹھا کر لائی ہوں، آپریشن تھیٹر میں لے جایا جائے گا۔ نیپلز کا ارب پتی تاجر کل رات سے ہسپتال میں ہی ہے۔۔۔۔ ۔ آپریشن ایک خفیہ آپریشن تھیٹر میں ہوتا ہے جو ریسٹ ہاؤس کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانے میں بنایا گیا ہے۔"

میں نے کہا:

"میں نے آج دو ڈاکٹروں کے ساتھ ایک سنہری چشمے والے بوڑھے کو دیکھا تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔"

فاطمہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"تمہارا دل اس کے سینے میں ٹرانس پلانٹ کیا جانا تھا۔"

میرے جسم میں دہشت کے مارے سنسنی سی دوڑ گئی۔ اگر فاطمہ مجھے بچا کر نہ لے آتی تو یہ رات میری زندگی کی آخری رات تھی اور صبح میری لاش تیزاب کے ٹب میں تحلیل ہو چکی ہوتی۔ فاطمہ نے ایک بار پھر گھڑی پر وقت دیکھا اور اٹھ کر دروازے کے پاس چلی گئی۔ دروازے میں چابی لگائی۔ پٹ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ پھر اسے بند کر دیا اور واپس آ کر بولی:

"بھائی کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ مجھے واپس اپنے کوارٹر میں بھی جانا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ میں کوارٹر سے رات کو غیر حاضر تھی۔ میں پکا بندوبست کر کے آئی ہوں اور غسل خانے کی کھڑکی سے باہر نکلی تھی۔"

میں نے کہا:

"فاطمہ بہن! مجھے کسی طرح یہاں سے نکال کر اگلے شہر پہنچا دو۔"

فاطمہ نے کہا:

"قاتلوں کے اس گروہ کے آدمی ہر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ایک بار تم وینس پہنچ گئے تو وہ اتنا بڑا شہر ہے کہ تم آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آؤ گے۔ ویسے بھی ان کے پاس تمہاری تصویر وغیرہ نہیں ہے اور پھر انہیں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بد خصلت ایلس بہت جلد کسی دوسرے شکار کو پھانس لے گی۔ یہ بہار کا موسم ہے۔ اس موسم میں اٹلی میں بڑے سیاح آتے ہیں لیکن آج کی رات اور کل کا دن تمہیں اسی جگہ چھپے رہنا ہو گا۔"

وینس یہاں سے کتنی دور ہے؟ کیا میں کسی ٹرین میں نہیں جا سکتا؟ مگر میرے پاس تو وینس تک کا کرایہ بھی نہیں ہے؟"

فاطمہ کہنے لگی:

"اسکی تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں کچھ رقم دے دوں گی۔ میرا بھائی تمہیں ایسے مقام پر چھوڑ آئے گا۔ جہاں سے تم آسانی سے وینس پہنچ سکو گے۔"

وہ باتیں کر رہی تھی کہ باہر گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ فاطمہ نے جلدی سے کہا:

"بھائی آگیا ہے۔"

میں اٹھنے لگا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا اور خود دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ باہر سے ایک مخصوص سیٹی کی آواز سنائی دی۔ فاطمہ نے آدھا دروازہ کھول دیا۔ فاطمہ کا بھائی اندر آگیا تو دروازہ بند کر دیا گیا۔ وہ میرے لئے کپڑے لایا تھا۔ ان میں ایک فلالین کی پتلون، ایک قمیص اور ایک سویڈن کی گرم جیکٹ، بوٹ، جرابیں وغیرہ تھیں۔ کپڑے مجھے پورے آگئے تھے۔ بوٹ اور جیکٹ کے سوا سارے کپڑے پہن لئے اور پلنگ پر بیٹھا فاطمہ کو عربی زبان میں اپنے بھائی سے باتیں کرتا سنتا اور دیکھتا رہا۔ فاطمہ نے اپنی بات ختم کر کے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی:

"میرے بھائی سعد نے بتایا ہے کہ ریسٹ ہاؤس کی عمارت میں اس نے دو ڈاکٹر داخل ہوتے دیکھے ہیں۔ اسکا مطلب ہے آپریشن کی تیاریاں شروع ہو رہی ہیں۔ اب مجھے جلدی اپنے کوارٹر میں واپس پہنچنا ہو گا۔ کیونکہ مجھے کسی وقت بھی بلایا جا سکتا ہے۔ اور ہاں تم ہمارے جانے کے بعد اندر سے دروازے کی چٹخنی لگا دینا۔ مگر پلیز سگریٹ سلگانے کی غلطی مت کرنا۔ تمباکو کی بو جنگل کے کسی بھی چوکیدار کو اس کاٹج کی طرف لا سکتی ہے، دوپہر کو تمہیں

میرا بھائی کھانا لاکر دے جائے گا۔ اگلا پروگرام تمہیں میرا بھائی سعد بتادے گا۔ اوکے۔ فی امان اللہ!"

فاطمہ نے عربی میں مجھے خدا حافظ کہا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اللہ کے پاک نام نے مجھے بچایا تھا اور فاطمہ کو میری زندگی بچانے کا ایک سبب بنا کر میرے پاس بھیجا تھا۔ جب فاطمہ اور اسکا بھائی کاٹج کے کمرے سے نکل گئے تو میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگادی اور پلنگ پر سجدے میں گر گیا۔ میں خداوند کریم کا شکر ادا کر رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے اللہ کے حضور وعدہ کیا کہ آئندہ کسی لڑکی کے بارے میں دل میں برا خیال نہیں لاؤں گا۔ یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دینا۔ یا اللہ میرے گناہ معاف کر دینا۔

سجدے میں سے سر اٹھانے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ میں وہیں ایک طرف پہلو میں ہو کر لیٹ گیا اور پھر مجھے نیند آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو بند کھڑکی کی درزوں میں سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ موم بتی لوہے کی میز پر لگی لگی نہ جانے رات کے کس سمے پگھل کر بجھ گئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ اسے ذرا سا کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔

باہر موسم بہار کی چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سائپرس اور یوکلپٹس کے درختوں کے جھنڈ اوپر پہاڑیوں کی ڈھلانوں تک چلے گئے تھے۔ بہار کی تازہ ہوا نے مجھے تازہ دم کر دیا۔ غسل خانے میں جا کر میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ فاطمہ کے بھائی سعد کے کپڑے میں رات کو پہن کر ہی سویا تھا۔ اب میں نے اس کے جوتے بھی پہن لئے تھے۔ یہ اٹالین جوگر شوز تھے جو کافی آرام دہ تھے۔ مجھے وہاں کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ میرا دل سگریٹ پینے کو بے

تاب ہو رہا تھا مگر میں یہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ کھڑکی بند کر کے میں پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور حالات پر غور کرنے لگا۔ میں ابھی تک خطرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ایک دھڑکا سا دل کو لگا ہوا تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا اور اس وقت تک میرے فرار کا علم متعلقہ ڈاکٹروں کو ہو چکا ہو گا اور ہو سکتا تھا کہ ان کے آدمی میری تلاش میں نکل بھی چکے ہوں۔ مجھے اٹلی میں داخل ہونے سے پہلے اور بعد میں بہت سے لوگوں نے خبردار کیا تھا کہ میں چوکس رہوں اور خاص طور پر رات کو سفر نہ کروں۔ مگر میں نے اس پر عمل نہ کیا اور جوانی کے جوش میں ان لوگوں کی ہدایات اور نصیحتوں کو فراموش کر دیا۔

میں ان نوجوانوں کو جو اٹلی کی سیاحت کرنے کے خواہشمند ہیں، نصیحت کروں گا کہ وہ یورپ کے کسی ملک میں بھی اور خاص طور پر اٹلی میں رات کو سفر کرنے کی غلطی ہرگز نہ کریں۔ میرے ساتھ جو خوفناک واقعہ گذرا ہے، اس سے سبق حاصل کریں۔ میری قسمت اچھی تھی اور اللہ نے مجھے بچانا تھا، سو میں بچ گیا ورنہ بظاہر میرے زندہ بچ جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔

دوپہر کے وقت فاطمہ کا بھائی میرے لئے لنچ باکس میں بھنی ہوئی مچھلی اور ڈبل روٹی لے کر آیا۔ اس نے مجھے ایک لفافہ دیا۔ اور کہنے لگا:

"یہ میری بہن فاطمہ نے دیا ہے۔"

میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دو ہزار لیرا کے نوٹ تھے۔ اس کا بھائی کہنے لگا:

"یہ رقم تمہارے لئے ہے۔ تمہیں آگے اس کی ضرورت ہو گی۔"

میری آنکھوں میں ایک بہن کے اس ایثار پر آنسو آ گئے۔ سعد کہنے

لگا:

"اب میں جاتا ہوں۔ شام کو تم تیار رہنا۔ میں اندھیرا ہوتے ہی آجاؤں گا۔"

میں نے اس سے پوچھا:

"پیچھے فاطمہ بہن پر تو کسی نے شک و شبہ نہیں کیا؟"

سعد نے نفی میں سرہلایا اور دروازہ اندر سے بند رکھنے کی ہدایت کر کے چلا گیا۔ اس وقت اٹلی میں تین لیرے کی روٹی ملتی تھی جو ایک جوان آدمی مشکل سے کھا سکتا تھا۔ اس حساب سے آپ اندازہ لگالیں کہ دو ہزار لیرے کی رقم جو فاطمہ بہن نے میرے لئے بھیجی تھی' اس کی مالیت کتنی ہوگی۔ میں نے نوٹوں کے لفافے کو بٹوے میں رکھنے کی بجائے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ کھانا کھا کر میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ دروازے کی چٹخنی میں نے لگادی تھی۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ دل میں ڈر سا لگا تھا کہ کیا معلوم اس شیطانی گروہ کا کوئی آدمی میری تلاش میں اس کاٹج کی طرف آنکلے اور میں سوتے میں پکڑا جاؤں۔ مگر کھانا کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے نیند کا کافی مقابلہ کیا لیکن آخر ہار گیا اور نیند نے میری آنکھیں بند کر دیں۔

مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کب تک سویا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو اٹھ کر کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا۔ باہر سورج غروب ہو چکا تھا اور اٹلی کی پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر شام کے سائے اترنا شروع ہو گئے تھے۔ اب میں بے چینی سے فاطمہ کے بھائی کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ شیطانی گروہ کا کوئی آدمی اس طرف نہیں آیا تھا۔ آہستہ آہستہ شام گہری ہوتی گئی۔ پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایک موم بتی مجھے سعد دے گیا تھا۔ میں نے

اسے روشن کر کے میز پر لگادیا۔ باہر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے پرندوں کی جو ایک آدھ آواز آجاتی تھی، اب وہ بھی نہیں آتی تھی۔ رات گذرتی چلی گئی۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ آخر مجھے دور سے گاڑی کے انجن کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی۔ میں نے لپک کر کھڑکی تھوڑی سی کھول دی اور باہر دیکھنے لگا۔

گاڑی کی آواز آہستہ آہستہ قریب آرہی تھی۔ پھر ایک گاڑی کچھ فاصلے پر آکر رک گئی۔ انجن کی آواز آنا بند ہوگئی۔ میں آنکھیں پھاڑے باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک خوف یہ بھی تھا کہ کہیں یہ کوئی دشمن کا آدمی نہ ہو۔ اندھیرے میں مجھے ایک انسانی ہیولا کاٹج کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب ہیولا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔

وہ فاطمہ کا بھائی سعد تھا۔

میں کھڑکی بند کر کے جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سعد نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور میرے پاس آتے ہی بولا:

"جلدی سے میرے ساتھ آجاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ کمرے میں میرا کچھ نہیں تھا۔ اسی وقت سعد کے ساتھ ہولیا۔ گاڑی وہی تھی جس پر پہلے بھی وہ میرا کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے آگے اپنے ساتھ والے سیٹ پر بیٹھنے سے روک دیا اور کہا:

"پچھلی سیٹ پر بیٹھو۔ وہاں کمبل پڑے ہیں، راستے میں کہیں روشنیاں آئیں تو کمبل اوپر کر کے سیٹ پر لیٹ جانا۔ جلدی کرو۔"

اس نے انجن سٹارٹ کر رکھا تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی

گاڑی نے چھوٹا سا چکر کاٹا اور واپس روانہ ہوگئی۔ گاڑی کی بتیاں اس وقت بجھی ہوئی تھیں۔ جب گاڑی پہاڑی جنگل سے نکل کر چھوٹی سڑک پر آئی تو سعد نے ہیڈ لائیٹس روشن کر دیں اور گردن ذرا سی موڑ کر مجھے کہا:

"آگے جہاں روشنی آئے، کمبل اوپر کر لینا۔"

میں نے سوچا کہ بار بار کمبل کون اوڑھے۔ بہتر ہے کہ میں سیٹ پر لیٹ جاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ سیٹ پر دراز ہو کر میں نے کمبل گردن تک کر لیا۔ میں نے سعد سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اتنا ضرور پتہ تھا کہ وہ مجھے آگے وینس شہر کی طرف لے جا رہا ہے۔ گاڑی پہاڑی سڑکوں پر مختلف چکر کاٹتی بڑی سڑک پر نکل آئی۔ اب مجھے دوسری گاڑیوں کی بھی آوازیں سنائی دیں جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد گذر جاتی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہائی وے ہے۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنیاں بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑی کے اندر چمک جاتی تھیں۔ سعد گاڑی کافی تیز چلا رہا تھا۔ ویسے بھی یورپ کی ہائی ویز پر گاڑی تیز ہی چلانی پڑتی ہے۔ میں کبھی سو جاتا اور کبھی جاگ پڑتا۔ کافی لمبے سفر کے بعد گاڑی کو سعد نے ایک دوسری سڑک پر موڑ دیا۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر باہر دیکھا۔ سامنے کافی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سعد نے ان روشنیوں سے دور گاڑی کھڑی کر دی۔ اور میری طرف گردن موڑ کر بولا:

"سامنے ریستوران ہے۔ میں کافی لینے جا رہا ہوں۔ تمہیں اگر باتھ روم جانا ہو تو میرے ساتھ آجاؤ۔"

میں نے کہا:

"اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو میں بھی ذرا ہاتھ پیر کھولنا چاہوں گا۔"

سعد نے جھک کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ پھر کھڑکی کھولتے ہوئے بولا:

"آجاؤ۔ میرا خیال ہے ہم خطرے کے مقام سے کافی دور نکل آئے ہیں۔"

ہم ریستوران میں آکر بیٹھ گئے۔ کچھ گاہک بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ کافی پی رہے تھے۔ سنہری بالوں والی عورتیں بھی بیٹھی اپنے ساتھیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ مگر میں نے ان کو صرف ایک نظر ہی دیکھنے پر اکتفا کیا۔

اب میں سنہری بالوں والی عورتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کام سے توبہ کرلی تھی۔ ہم نے وہاں کافی پی۔ تھوڑے سے دیفر اور فرینچ فرائیز بھی کھائی۔

میں نے اوپر تلے دو سگریٹیں پی لئے۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہم گاڑی میں آگئے۔ سعد نے مجھے بتادیا تھا کہ وینس یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور ہم ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وینس پہنچ جائیں گے۔ وینس کا نام سنتے ہی میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں اپنے خوابوں کے شہر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

جب ہماری گاڑی وینس شہر کے مضافات میں داخل ہوئی تو میں نے کمبل پرے رکھ دیا تھا اور کھڑکی کے شیشے سے لگا آس پاس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر جگمگاتی نیلی پیلی روشنیوں کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ سعد نے ایک طرف گاڑی روک دی اور کہا:

"اب تم بے شک اگلی سیٹ پر آجاؤ۔"

میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ جلدی سے اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی ابھی تک بڑی سڑک پر ہی تھی جس پر رات کے وقت بھی گاڑیاں ایک دوسری کے پیچھے آجارہی تھیں۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اتار دیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرائے تو میں نے وینس شہر کی خوشبو کو محسوس کیا۔ ہوا میں سمندر کی نمی بھی تھی۔ راستے میں کئی جگہوں پر دریاؤں کے پل بھی آئے۔ سعد نے بتایا کہ یہ دریا نہیں ہیں بلکہ سمندر کی کھاڑیاں اور چھوٹی چھوٹی جھیلیں ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وینس کا وہ علاقہ کہاں ہے جہاں

گلیوں میں نہریں بہتی ہیں۔ سعد نے مسکرا کر کہا:

"یہ علاقہ شہر کے مشرق اور جنوب میں ہے۔ ہم اس وقت شمال مغربی علاقے میں سے گذر رہے ہیں۔"

وینس کا شہر چھوٹے چھوٹے جزیروں پر آباد ہے جن کے درمیان ایڈریاٹک سمندر کا پانی بہتا ہے۔ اس شہر کی تاریخ تقریباً ایک ہزار برس پرانی ہے۔ اٹلی کے تاریک دور میں جب وحشی صفت قبائل نے یورپ پر یلغار کی تو انہوں نے اٹلی میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اٹلی کے شہر پاڈوا اور دوسرے قریبی شہروں کے لوگ اپنی جانیں بچا کر مشرق کی جانب سمندری جھیلوں کے درمیان بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدرتی جزیروں کے جھرمٹ کی طرف بھاگ کر آ گئے۔ ان جزیروں میں وہ وحشی قبائل کے قتل عام سے محفوظ تھے۔ کیونکہ جزیروں کے ارد گرد پانی گہرا تھا اور کچھ جزیرے ایسے تھے کہ جہاں پانی کم گہرا ہونے کی وجہ سے جہاز داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ پاڈوا اور دوسرے قریبی شہروں اور پہاڑی قصبوں سے بھاگ کر آئے ہوئے لوگوں نے یہاں پناہ حاصل کی اور وحشیوں سے جانیں بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان جزیروں میں تاریخ کے ابتدائی دور ہی سے ماہی گیر آباد تھے۔ نئے شہریوں نے ان کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے کا کام شروع کر دیا۔ شروع شروع میں یہ لوگ سمندری نمک بناتے۔ مچھلیاں پکڑ کر دوسرے شہروں میں کشتیوں پر جا کر فروخت کرتے۔ ان کا کاروبار سمندری راستے سے ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ ضرورت نے انہیں کامیاب ملاح بنا دیا۔ ان جزیروں پر جو زمین تھی، انہوں نے اس پر کھیتی باڑی بھی شروع کر دی۔ ان مہاجروں نے اپنے کاروبار کو مزید وسعت دی اور لمبے لمبے بحری سفر کرنے شروع کر دیئے۔ قسطنطنیہ کی

بندر گاہوں پر انہوں نے جہاز سازی کا ہنر سیکھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ ایڈریاٹک سمندر میں جو بحری قزاق لوٹ مار کرتے تھے' انہوں نے ان پر بھی قابو پالیا۔ اب یہ وینس شہر کے باشندے تھے۔ انہوں نے شام' مصر اور سپین کے تاجروں سے کاروباری روابط بڑھائے۔ شروع شروع میں اہل وینس غلاموں اور ٹمبر کی لکڑی کے عوض ان ممالک سے ریشمی کپڑا اور مصالحے خریدتے تھے۔ اس کے بعد وینس کے ان باشندوں نے فرنیچر سازی' شیشے کی صنعت' زرہ بکتر اور اونی کپڑے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ وینس شہر کی شہرت سارے یورپ اور مشرق وسطی میں پھیل گئی۔ یورپ اور مشرق وسطی کے عیسائی پوپ اور اپنے دوسرے مرحوم راہبوں کے مزاروں پر حاضری دینے ہر سال ہجوم کی شکل میں آیا کرتے تھے۔ وینس والوں نے سینٹ مارک کے مقدس مزار کا میلہ شروع کر دیا۔ وینس کے تجارتی بحری بیڑے سارے یورپ کے سمندروں میں دیکھے جانے لگے۔ وقتوں کے بعد اہل وینس کی تجارتی اعتبار سے تمام سمندری تجارتی راستوں پر اجارہ داری قائم ہوگئی۔ وینس کے سوداگروں نے یورپ کے تقریباً ہر شہر میں اپنی تجارتی منڈیاں قائم کرلیں۔ اسی طرح وینس تاریخ کے صفحات پر ایک خوش حال ترقی یافتہ اور حسین ترین شہر بن کر نمودار ہوا۔ مشہور سیاح مارکو پولو بھی اسی شہر کا رہنے والا تھا جس نے وینس کے اس زمانے کے ملک چین سے تجارتی روابط قائم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ چنانچہ آج وینس کو بجا طور پر اٹلی کا عروس البلاد کہا جاتا ہے۔ مجھے وینس کی پراسرار گلیاں جن میں نہریں بہتی ہیں اور لاہور سے کھینچ کر یہاں لے آئی تھیں۔

ہماری گاڑی اب وینس شہر کی جگ مگ جگ مگ کرتی سڑکوں پر آگئی

تھی۔ اس وقت رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ مگر شہر کی سڑکوں پر اسی طرح رونق تھی جیسے ابھی شام ہی ہوئی ہو۔ میں وینس کی روشنیاں اور رونق دیکھ کر واقعی ایک بار تو دنگ رہ گیا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں مشرق بعید اور یورپ کے کئی ایک ممالک کی سیاحت کر چکا تھا۔ باروں، ریستورانوں اور کنیسوں میں زبردست چہل پہل تھی۔ اونچی اونچی عمارتوں پر رنگ برنگی نیون سائن کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

سعد نے ایک اطالوی ریستوران کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر دی اور انجن بند کر کے مجھ سے کہنے لگا:

"یہاں کچھ تھوڑا بہت کھاتے پیتے ہیں اور باتیں بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ مجھے صبح ہونے تک واپس سینی ٹوریم بھی پہنچنا ہے۔"

ریستوران میں بڑی رونق تھی۔ کافی کوکو اور سگار وغیرہ کی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔ ہم ایک زرد رنگ کی گول میز کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سعد نے برگر اور کافی کا آرڈر دیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا:

"یہاں تم اجنبی ہو۔ ویسے تو تمام سیاح جو پہلی بار وینس آتے ہیں، اجنبی ہی ہوتے ہیں مگر تمہارے ساتھ ایک ایسا خطرناک واقعہ ہو گذرا ہے کہ جس کی وجہ سے تمہیں اس شہر میں کچھ روز محتاط ہو کر رہنا ہو گا۔"

میں نے کہا:

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں اپنا حلیہ تو نہیں بدل سکتا۔"

سعد بولا:

تم چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھ سکتے ہو، تمہارے بال چھوٹے ہیں، ان کو بڑھا کر لمبا کر لو۔ میں صرف احتیاط کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ ویسے تمہیں اتنے بڑے شہر میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگایا اور سعد سے پوچھا:

"کیا یہاں کوئی وائی ایم سی اے ہے۔ میرا خیال ہے میں وہاں کوئی کمرہ لینے کی کوشش کروں گا۔ ان جگہوں پر کمرے سستے مل جاتے ہیں۔"

سعد کافی پی رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر پیالی میز کی شفاف سطح پر رکھتے ہوئے بولا:

"تمہارا وینس میں کب تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا:

"میں تو اٹلی آیا ہی وینس شہر دیکھنے کے لئے ہوں۔ ظاہر ہے اسی شہر کے لئے اتنی مصیبت اٹھائی ہے تو اب چھ ایک ماہ تو ضرور ٹھہروں گا۔"

سعد نے ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ویٹرس کو اشارہ کیا۔ ویٹرس بڑی خوش جمال اطالوی حسینہ تھی جو ریستوران کی نیم عریاں وردی میں تھی اور اس کے چہرے پر قیامت خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ قریب آکر ہماری میز پر جھک گئی۔ اس نے اطالوی میں پوچھا کہ میں کیا خدمت کر سکتی ہوں۔ میں نے اس پر بھی اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنی چاہی کیونکہ میں پردیس میں عشق و عاشقی سے توبہ کر چکا تھا مگر میری گناہ گار نگاہ اس کے ہونٹوں سے پھسل کر اس کی گردن پر آکر رک گئی۔

سعد نے ویٹرس سے مزید کافی لانے کو کہا۔ اطالوی حسینہ جاتے

ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے جلدی سے نگاہیں دوسری طرف کرلیں۔ سعد کہنے لگا:

"یہاں وینس میں الجزائر کی ایک تبلیغی جماعت کام کرتی ہے۔ سان مراکو کے علاقے میں ان کا ہیڈ آفس ہے۔ اس جماعت کے ایک رکن سے میری اچھی خاصی واقفیت ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے لئے وہاں ٹھہرنے کا انتظام کرا سکتا ہوں۔"

مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں نے جلدی سے کہا:

"ضرور کرا دو۔ وہ جتنا کرایہ کہیں گے، میں ادا کر دوں گا۔"

سعد نے کہا:

"وہ تم سے کرایہ شاید نہیں لیں گے، اگر لیا بھی تو واجبی سا ہو گا۔ مگر تمہیں وہاں ہوٹل ایسی سہولیات میسر نہیں ہوں گی۔"

میں نے کہا:

"مجھے اس کی پروا نہیں سعد بھائی، مجھے تو صرف فرش پر تھوڑی سی جگہ رات بسر کرنے کے لئے چاہیے۔ دن کے وقت تو میں شہر کی سیاحت میں مصروف رہوں گا۔"

"تو پھر میرے ساتھ آؤ۔"

سعد نے ویٹرس کو بلا کر بل ادا کیا اور مجھے گاڑی میں ساتھ لے کر وینس کے علاقے سان مراکو کی طرف چل پڑا۔ سان مراکو کا علاقہ وینس کے ڈاؤن ٹاؤن میں واقع ہے اور یہاں چھوٹی بڑی بے شمار دکانوں پر دنیا بھر کی چیزیں اور اٹلی کے نوادرات کی نقلیں فروخت ہوتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سڑکیں گلیوں کی طرف نکل جاتی ہیں اور گلیاں ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی

گذرتی ہیں۔ اس علاقے میں قدیم رومن عہد کی سنگ مرمر کے ستونوں والی بڑی بڑی عمارتیں بھی ہیں اور گیلریوں والے مکان بھی ہیں جن میں رنگ برنگ پھولوں والے گملے رکھے ہوتے ہیں۔ یہ علاقے اطالوی نوادرات کی خرید و فروخت کا مرکز ہے۔ اتنی رات گئے بھی وہاں بڑی رونق تھی۔ بڑی دکانیں بند ہو چکی تھیں مگر چھوٹی چھوٹی دکانیں، ریستوران، بار، کیفے اور شراب خانے کھلے تھے۔ گاڑی ہم نے ایک جگہ پیچھے کھڑی کر دی تھی۔ ہم ایک شراب خانے کے قریب سے گذرے تو اندر سے بلند قہقہوں اور اطالوی گانے کی تیز آوازیں آئیں۔ سعد مجھے ایک نشیبی گلی میں سے گذار کر گلی کے آخر میں ایک پرانے حویلی نما دروازے پر لے آیا۔ صدر محرابی دروازے کے اوپر عربی رسم الخط میں تبلیغی جماعت کا نام لکھا تھا۔ یہ الجزائر کے مسلمانوں کی تبلیغی جماعت تھی جو وینس میں اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔

چونکہ رات زیادہ گذر چکی تھی، اس لئے حویلی کا دروازہ بند تھا۔ لگتا تھا کہ سعد پہلے بھی وہاں کئی بار آچکا تھا۔ اس نے دیوار میں لگا ایک بٹن دبایا۔ بٹن کے ساتھ چھوٹا سا اسپیکر لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی مائیکروفون بھی تھا۔ سپیکر میں سے کسی نے عربی میں کچھ پوچھا۔

سعد نے عربی زبان میں ہی کچھ جواب دیا۔ پھر اپنا نام بتایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کوئی لفظ کہا اور خاموشی چھاگئی۔ سعد نے میری طرف دیکھا اور بولا:

"میرا دوست یہیں رات کو سوتا ہے۔ میں نے اس کو بلانے کے لئے کہا ہے۔"

تھوڑی دیر میں مین دروازے کا چھوٹا دروازہ جو نیچے بنا ہوا تھا، کھل گیا اور ایک خوش شکل ادھیڑ عمر کا آدمی نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر سفید اور سیاہ بالوں والی چھوٹی سی ڈاڑھی تھی۔ اس نے سعد کی طرف بازو پھیلا دیئے۔ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ سعد نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ اس الجزائری کا نام قدومی تھا۔ وہ ہمیں اندر لے گیا۔ اندر ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ سعد نے عربی میں ساری بات اسے بیان کر دی۔ قدومی نے میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔ وہ انگریزی میں بولا:

"میرے مسلم بھائی تم جب تک چاہو ہمارے ہاں ٹھہر سکتے ہو۔ ہال کمرے میں تمہیں ایک بستر مل جائے گا۔ ہم پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ الحمد للہ مسلمان ہو۔ ہم دونوں اسلامی بھائی ہیں۔"

سعد کو جانے کی جلدی تھی۔ وہ مجھے قدومی کے حوالے کر کے مجھ سے بغل گیر ہو کر اور عربوں کے خاص انداز میں میرے دونوں رخساروں کے ساتھ اپنے رخسار ملا کر واپس چلا گیا۔

میں نے قدومی سے تکلفاً پوچھا کہ مجھے کتنے لیرے کرایہ ادا کرنا ہو گا۔ قدومی نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا:

"تم ہمارے پاکستانی مسلمان بھائی ہو۔ تم سے کچھ نہیں لیں گے۔ تمہاری میزبانی ہمارا فرض ہے۔"

قدومی مجھے ایک چھوٹے سے ہال نما کمرے میں لے گیا۔ جہاں فرش پر پہلے ہی سے دس پندرہ آدمی بستر بچھائے سو رہے تھے۔ چھت کے ساتھ مدھم سا بلب روشن تھا۔ قدومی نے میری طرف جھک کر شرارت آمیز لہجے

میں کہا:

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں یہ جگہ پسند نہیں آئی۔ تم ابھی نوجوان ہو۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دوسری جگہ دکھاتا ہوں، وہ تمہیں ضرور پسند آئے گی۔"

ہال کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو کتابوں کی الماریوں سے تقریباً لبریز تھا۔ ایک جانب اونچی کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی ہسپتال کے اسٹریچر ٹائپ کی ایک کیمپ کارٹ بچھی ہوئی تھی۔ قدومی نے کیمپ کارٹ کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"آج سے یہ کیمپ کارٹ تمہاری ہے۔ میں تمہیں بستر بھجوائے دیتا ہوں۔ غسل خانہ کمرے کے باہر کاریڈور کے کونے میں ہے۔ اگر تم پسند کرو تو یہاں صبح شام کھانا بھی کھا سکتے ہو۔ نہ... نہ... کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کھانے کا کچھ نہیں لیتے۔ یہاں تو لنگر کا کھانا ہوتا ہے۔ اب تم آرام کرو۔ میرا نوکر بستر لے کر ابھی آجائے گا۔"

قدومی سلام علیک کر کے چلا گیا۔ میں کیمپ کارٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ دوسری طرف گردن آگے کر کے دیکھا۔ دوسری طرف ایک تنگ و تاریک گلی تھی۔ گلی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک مکان کے باہر روشنی ہو رہی تھی۔ گلی میں اونچے اونچے اطالوی طرز کے چھجوں والے مکان تھے۔ کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ میں سگریٹ سلگا کر گلی میں دیکھنے لگا۔

اتنے میں قدومی کا الجزائری ملازم لڑکا بستر لے کر آگیا۔ اس نے کیمپ کارٹ پر بستر بچھا دیا۔ میں نے سگریٹ گلی میں پھینکا۔ جوتے اور جیکٹ

اتار کر سرہانے رکھی۔ جیکٹ کی جیب میں سے پاسپورٹ والا بٹوہ اور نقدی کا لفافہ نکال کر سرہانے کے نیچے رکھ دیا اور بتی بجھا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میری بند آنکھوں کے سامنے گذرے ہوئے سارے واقعات فلم کی طرح چلنے لگے۔ کتنی بڑی مصیبت تھی جس میں سے خدا نے مجھے زندہ سلامت نکال لیا تھا۔ اگر فاطمہ اور اس کا بھائی میری مدد نہ کرتے تو اس وقت میری لاش کا بھی کسی کو علم نہ ہوتا۔ اس قسم کی باتیں سوچتے اور گذرے ہوئے مناظر کی فلم دیکھتے ہوئے مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو ساتھ والی گلی میں ایک کتا زور زور سے بھونک رہا تھا اور کوئی عورت بڑی تیز اور کرخت آواز میں اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ عورت کے لہجے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کتے کو گالیاں دے رہی ہے۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی میں سے دن کی روشنی اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان لے کر کمرے سے نکل کر کاریڈور میں سے ہوتا ہوا غسل خانے میں بلکہ غسل خانوں میں پہنچ گیا۔ یہ بڑے صاف ستھرے یورپی سٹائل کے غسل خانے تھے۔ میں نے ایک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر شیو بنائی۔ مونچھوں پر ریزر چلانے لگا تو سعد کی بات یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ تم مونچھیں بڑھا لو۔ اس طرح تمہارا تھوڑا سا حلیہ بدل جائے گا۔ میرا ہاتھ رکا ہوا تھا۔ مگر وینس کی صبح نے اور اپنے الجزائری مسلمان بھائیوں کے درمیان آجانے سے میرے سارے خوف دور ہو گئے تھے۔ میں نے مونچھوں پر بھی ریزر چلا دیا۔

ایک الجزائری نوجوان میرے قریب سے گذرتے ہوئے رک گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے عربی میں میرے وطن کے بارے میں

پوچھا۔ میں نے انگریزی میں کہا۔ "میں سمجھ نہیں سکا۔"

وہ ہنس پڑا۔ پھر انگریزی میں اپنا سوال دہرایا۔ میں نے کہا:

"میں پاکستان سے آیا ہوں اور مسلمان ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگالیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلاتے ہوئے انگریزی میں کہنے لگا:

"تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ پاکستان ہمارا بھی وطن ہے۔ تم مسلمانوں نے کافر ہندوؤں سے جنگ کر کے ایک اسلامی ملک بنایا ہے۔ تم بہادر مسلمان ہو۔"

وہ اصرار کرنے لگا کہ ناشتہ میرے ساتھ کرنا۔ معلوم ہوا کہ ہال میں ناشتے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ اور ناشتہ جماعت کے اراکین باہر ایک ہسپانوی مسلمان کے ریستوران میں کرتے ہیں۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ میں ناشتہ اسی کے ساتھ کروں گا۔ غسل خانے سے نہا دھو کر میں نے اپنے لائبریری والے کمرے میں آکر بال اچھی طرح سے بنائے۔ میں نے چھوٹا سا آئینہ کھڑکی میں رکھ لیا تھا۔ جیکٹ پہن کر نقدی والا لفافہ اور پاسپورٹ والا بٹوہ جیبوں میں سنبھال کر رکھا اور تبلیغی مشن کی عمارت سے نکل کر گلی میں آگیا۔ یہاں میرا الجزائری دوست موجود تھا۔ ہم دونوں نے گلی کے باہر چھوٹی سڑک کے چوک میں ہسپانوی ریستوران میں جاکر ناشتہ کیا اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھ سے پاکستان کے بارے میں پوچھتا رہا۔ کہنے لگا:

"مجھے پاکستان دیکھنے کا بڑا شوق ہے مگر تبلیغی کام میں اس قدر مصروف ہوں کہ وقت ہی نہیں مل رہا۔"

میرا ارادہ وہاں سے وینس کی نہروں والی گلیوں کی طرف نکل جانے

کا تھا۔ میں نے اپنے الجزائری دوست سے ان گلیوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے ایک خاص نمبر کی ٹرام پکڑنے کے لئے کہا۔ یہ ٹرام تمہیں جب ٹرمینل تک لے جائے تو تم بھی اتر جانا' وہاں سے پندرہ نمبر کی بس تمہیں بس سٹاپ پر ہی ملے گی۔ یہ بس سیدھی وینس کے اس علاقے میں جاتی ہے جہاں گلیوں میں نہریں بہتی ہیں۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے لگا تو اس نے کہا:

"وینس کے جزیروں میں سب سے بڑا جزیرہ ریالٹو ہے۔ نہریں اسی جزیرے کی گلیوں میں بہتی ہیں۔ مگر بہتر ہوتا کہ تم شام کے وقت وہاں جاتے۔ اس وقت بلڈنگوں کی روشنیوں کا عکس پانی میں بڑا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔"

یہ بات میرے دل کو لگی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ دن کے وقت میں شہر کے دوسرے علاقوں کی سیاحت کروں گا۔ جب شام ہو جائے گی تب گلیوں میں بہتی نہریں دیکھنے جاؤں گا۔ میں نے ٹرام پر بیٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور فٹ پاتھ پر پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔

میری کوئی خاص منزل تو تھی نہیں۔ شہر کی آوارہ گردی کے لئے میں آیا تھا۔ اس شہر کی محبت مجھے اتنی دور یعنی لاہور سے کھینچ کر یہاں لے آئی تھی بلکہ اس شہر کے لئے تو میں نے جان کی بازی بھی لگا دی تھی بلکہ لگانی پڑ گئی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ وینس شہر کی سڑکیں بڑی پر رونق تھیں۔ یہ ایک تاریخی اور عالمی شہرت یافتہ شہر تھا۔ تاریخ کی بات ابھی تک سوائے تنگ و تاریک گلیوں کی پرانی رومن طرز کی حویلیوں کے' مجھے اس شہر میں اور کہیں نظر نہیں

آئی تھی۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ میں جس زمین پر چل رہا ہوں' اسی زمین پر کبھی مارکو پولو کا سیاح باپ' اسکا سیاح چچا اور خود مارکو پولو چلا پھرا کرتا تھا۔ مجھے سینکڑوں برس پہلے کے وہ آباد کار یاد آگئے جو وحشی ھن قوم کے حملوں سے جانیں بچاکر دوسرے شہروں سے بھاگ کر یہاں آئے تھے اور پھر انہوں نے اپنی جفاکشی' شبانہ روز محنت اور دلسوز لگن سے اس شہر کو اس وقت کی دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بنادیا۔ یہاں تک کہ وینس کے آئینے' فرنیچر اور زرگری اور تانبے پر نقش کاری کا آج بھی دنیا میں کہیں جواب نہیں ہی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جو قومیں مصائب کی چکی میں پستی ہیں' وہی زمانے میں سرخ رو ہوتی ہیں۔ مگر اس کے لئے شرط صرف یہ ہے کہ وہ قوم غلام نہ ہو۔ آزاد اور زندہ قوم ہو۔ ذہنی' جسمانی ہر لحاظ سے آزاد۔

میں ایک بہت بڑی فرنیچر کی دکان کے قریب سے گذرتے ہوئے رک گیا۔ قد آدم شیشے کے پیچھے نہایت اعلی قسم کا فرنیچر نمائش کے لئے رکھا ہوا تھا۔ میں دکان میں داخل ہو گیا۔ ایک سنہرے بالوں والی لڑکی نے آگے بڑھ کر میرا خیر مقدم کیا۔ اس وقت میرے کاندھوں پر سیاحوں والا تھیلا نہیں تھا۔ اگر تھیلا ہوتا تو شاید وہ لڑکی میری طرف رجوع نہ کرتی۔ میں جیکٹ اور پتلون میں تھا۔ اس نے اطالوی میں مجھ سے کہا کہ میرے دیکھنے کے لئے دکان میں بہترین چیزیں موجود ہیں۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کیا چاہیے؟ جیسا کہ ہمارے ملک میں لوگ پوچھتے ہیں۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ سونے کے رنگ کی طرح ہلکا اور زرد تھا۔ بال بالکل سیدھے آبشار کی طرح اس کے شانوں پر گرتے تھے۔ شکل سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نیلاہٹ کی جھلک تھی مگر اس کی ناک رومن

ناک رومن ناک یعنی ستواں نہیں تھی بلکہ نتھنے ذرا سے فراخ تھے۔ ایسی ناک کو انگریزی میں فلاوری نوز یعنی پھول ایسی ناک کہتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اس قسم کی ناک میری بڑی کمزوری ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میں نے بچپن میں جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کی بہت سیر و سیاحت کی ہے اور وہاں عورتوں کی ناک فلاوری ہی ہوتی ہے۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔ میں اب تھوڑی تھوڑی اطالوی بولنے بھی لگا تھا۔ میں نے اطالوی زبان میں کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ وہ کس ملک کی رہنے والی ہے۔ اس نے مسکراہٹ کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا:

"میں وینس کی رہنے والی ہوں۔ یہیں پیدا ہوئی تھی۔"

میں نے کہا:

"مگر تمہارا ناک اطالوی نہیں ہے' اسکی وجہ کیا ہے؟"

وہ کچھ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید اسے اس قسم کے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ ہنس پڑی:

"تمہارا قیافہ بالکل درست ہے۔ میرے پڑدادا فلپائن سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ شاید تمہیں میری ناک میں فلپینو کٹ دکھائی دے رہا ہے۔"

پھر اس نے فورا موضوع بدلا اور دکان کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطالوی زبان میں تیز تیز بولنے لگی۔ میں نے اسے انگریزی میں کہا:

"سینوریتا! اتنی زیادہ اطالوی زبان ابھی مجھے نہیں آتی۔"

وہ برابر مسکرا رہی تھی۔ اس کے دانت بڑے خوبصورت

سفید موتیوں کی طرح تھے۔ میری تباہی کے سارے آثار موجود تھے۔ مگر میں نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہاں کسی بھی لڑکی کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوں گا خواہ وہ مونالیزا ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے انگریزی میں کہا:

"اس سیکشن میں کیبنٹ، لکھنے کی میزیں اور اس قسم کا دوسرا فرنیچر بھی ہے جو تمہیں یقیناً پسند آئے گا۔ بس صرف ایک نظر اسے دیکھ لو۔"

میں اس لڑکی کے ساتھ لکڑی کے کام کی چھوٹی چیزوں والے سیکشن کی طرف بڑھا۔ میرا ارادہ کوئی چیز خریدنے کا نہیں تھا۔ میں تو محض وینس کے ہنرمندوں کے ہنر کی داد دینے اور خوبصورت نفیس اور اعلیٰ قسم کے فرنیچر کے دیدار کے لئے وہاں آگیا تھا۔ اس لڑکی نے موسم بہار کا پھولدار فراک پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ فراک کے اوپر کریم کلر کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی جس کے کناروں پر سبز رنگ کی مغزی لگی تھی۔ شاید یہ فرنیچر کے اسٹور کے ملازموں کی وردی تھی۔ کیونکہ میں نے قد آدم شیشے کے پیچھے ایک دوسری سیلز گرل کو اسی لباس میں دیکھا جو کسی گاہک کو صوفہ سیٹ دکھا رہی تھی۔

میں وہاں لگا ہوا لکڑی کا منقش سامان دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی میرے قریب ہی کھڑی تھی اور جس چیز کو میں دیکھتا، وہ اس کے بارے میں مجھے بتاتی جاتی کہ یہ ڈیزائن انہوں نے کس رومن بادشاہ یا کس رومن فلسفی کے قلمدان کو دیکھ کر نقل کیا ہے۔ اس سیلز گرل کے کپڑوں سے بہار کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک آرہی تھی۔ جو میری توبہ کو توڑ ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی اپنی جگہ پر چٹان کی طرح قائم تھا اور لڑکی کی طرف زیادہ نہیں دیکھتا تھا۔ جب لڑکی نے محسوس کیا کہ دکان کی چیزوں میں میری دلچسپی صرف چیزوں کے

دیکھنے کی حد تک ہی ہے تو اسکا ذوق و شوق ماند پڑ گیا۔ ایک بار جو میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہی سیلز گرل ایک دوسرے گاہک کو لے کر دوسرے سیکشن میں داخل ہو رہی تھی۔

مجھے ہنسی آگئی۔

میں دکان سے باہر نکلا اور آگے روانہ ہو گیا۔ سڑک کے درمیان میں سائپرس کے درخت سرو کے درختوں کی طرح سر اوپر کو اٹھائے کھڑے تھے۔ یہ درخت بحیرہ روم کے بازنطینی علاقے کی خاص علامت سمجھے جاتے ہیں۔ یہیں سے یہ درخت فوجیوں کے ساتھ جنوبی فرانس میں گئے جنہیں انیسویں صدی میں ہالینڈ کے ماسٹر پینٹر وان گوگ نے پینٹ کر کے کینوس پر لازوال بنا دیا۔

چلتے چلتے ایک چوراہا آگیا۔ یہاں ایک اطالوی ریستوران میں سے مصالحے دار کھانوں کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ میں ریستوران میں داخل ہو کر ایک میز کے سامنے بیٹھ گیا اور کافی کا آرڈر دیا۔ بھوک ابھی مجھے نہیں لگی تھی۔ میں سگریٹ سلگا کر ریستوران کا جائزہ لینے لگا۔ اطالوی ملازم تیز آوازوں سے بول رہے تھے۔ اطالوی لوگ خاص طور پر یہاں کی عورتیں بڑا شور مچاتی ہیں۔ بڑی تیز تیز باتیں کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ کندھے اور ہاتھ بھی ہلاتی جاتی ہیں۔ اونچے طبقے کی خواتین بڑی باوقار اور سنجیدہ بننے کی کوشش کرتی ہیں مگر جونہی انہیں موقع ملتا ہے، وہ بھی ایسی ہی حرکتیں کرنے لگتی ہیں۔ نچلے طبقے کے گھروں میں اطالوی عورتوں نے چیزیں ادھر ادھر بکھیری ہوتی ہیں۔ کچن تو خاص طور پر بڑا گندا رکھتی ہیں۔ کوئی کوئی نچلے طبقے کی اطالوی عورت گھر کا کچن صاف رکھتی ہے۔ بناؤ سنگھار کا ان عورتوں کو بڑا شوق ہے۔

ہے۔ یہ شوق انہیں رومن ایمپائر کے زمانے کی خوش حال عورتوں سے وراثت میں ملا ہے۔ اٹالین کھانے جیسا کہ سب جانتے ہیں بڑے مزیدار اور مصالحے دار ہوتے ہیں۔ یہ کھانے ہمارے مزاج کے لئے بڑے موزوں ہیں۔

میں کچھ دیر ریستوران میں بیٹھا شیشوں میں سے باہر سڑک پر آتے جاتے لوگوں اور چمکیلی کاروں اور بسوں کو گذرتے دیکھتا رہا۔ واشنگٹن میں سڑکوں پر دن کے وقت بھی بڑی خاموشی ہوتی ہے مگر اطالوی شہروں کی سڑکوں پر سوائے دور افتادہ سڑکوں اور ہائی وے کے 'ٹریفک کا بڑا شور ہوتا ہے۔ چھوٹے ریستورانوں میں بھی یہ لوگ بڑا شور مچاتے ہیں۔ جب ریستوران کا بیرا بار بار میری طرف دیکھنے لگا تو میں نے کافی کا بل ادا کیا اور ریستوران سے نکل آیا۔ یہاں ریستورانوں میں خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے کیوں نہ ہوں' گاہک ہمارے ہوٹلوں کی طرح زیادہ دیر نہیں بیٹھتے۔ ایک تو ان لوگوں کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا' دوسرے ریستوران کے مالک بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھنے دیتے۔ میں نے کسی طرح دن گذارنا تھا' کیا کرتا۔ کیونکہ میں وینس کی نہروں والی گلیوں کو رات کی روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سوائے سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے مجھے اور کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو وینس شہر کی بارونق زندگی اور سنہری دھوپ میں چمکتی سڑکوں کے حوالے کر دیا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں جس سڑک پر چلا جا رہا ہوں' یہ کہاں جاتی ہے۔ ایک سڑک ختم ہوتی تو میں چوک کراس کر کے دوسری سڑک پر آجاتا۔ درمیان میں کوئی چھوٹی سڑک کسی گلی کی طرف جاتی نظر آتی تو اس گلی میں نکل جاتا۔ اسی طرح کچھوے کی چال چلتے چلتے اور شہر کی سیر کرتے کرتے

دوپہر ہوگئی۔ میں نے ایک ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد پھر آوارہ گردی کرنے نکل کھڑا ہوا۔

اب میں جس علاقے سے گذر رہا تھا' وہاں مجھے کچھ سائین بورڈ لگے ہوئے نظر آئے جن پر فلم ایکٹرسوں اور فلموں کے مناظر کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں کچھ سینما گھر ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ کسی سینما ہاؤس میں بیٹھ کر اطالوی فلم دیکھی جائے۔ میں نے سائن بورڈ کو غور سے دیکھا۔ یہاں امریکی اور برطانوی فلمیں دکھائی جارہی تھیں۔ اطالوی فلم کا بورڈ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ جس سڑک پر میں چل رہا تھا' وہ تھوڑی سی ڈھلان اتر کر ایک چھوٹی سڑک کے ساتھ جاملتی تھی۔ یہاں میں ایک بلڈنگ کے قریب سے گذر رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ بلڈنگ کی لابی کے اندر لگے ایک بورڈ پر پڑی جس پر اطالوی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اوپر کسی عورت کی نیم عریاں تصویر بنی ہوئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ضرور یہاں اطالوی فلمیں دکھائی جاتی ہوں گی۔ اطالوی فلموں میں حقیقت نگاری کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور ایک زمانے میں لاہور میں اٹلی کی ایک فلم "سائیکل تھیف" یعنی سائیکل چور بڑی چلی تھی۔ میں لابی میں آگیا اور بورڈ کے اطالوی سائن کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں ایک نوجوان میرے پاس آیا اور انگریزی میں مجھ سے کہنے لگا:

"سینور! ٹکٹ اس طرف ملتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ چلو اطالوی فلم ہی دیکھتے ہیں۔ جب تک شام بھی ہوجائے گی' میں اس طرف گیا جس طرف نوجوان نے اشارہ کیا تھا۔ ٹکٹ ونڈو کے اندر شیشے کے پیچھے ایک

موٹی عورت بیٹھی تھی۔ میں نے ٹکٹ خریدا جو پانچ لیرے کا تھا۔ عورت نے اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر ایک دروازے پر سرخ مخمل کا بھاری پردہ گرا ہوا تھا اور ایک باوردی آدمی کھڑا تھا۔ میں نے اسے ٹکٹ دیا۔ اس نے ٹکٹ کو پنچ کیا اور ذرا سا پردہ اٹھادیا۔ میں سینماہال میں داخل ہو گیا۔ ہال میں کوئی فلم پہلے ہی سے چل رہی تھی۔ میں نے فلم کی کوئی توجہ نہ دی اور سکرین پر جو روشنی تھی' اس کی دھیمی چمک میں سیٹوں پر نگاہ ڈالی۔ اکثر سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ یہ گیلری تھی۔ اگلی سیٹوں پر ادھرادھر لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ میں ایک خالی قطار کی مخملیں آرام دہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے اطمینان سے سکرین کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ سکرین پر بالکل عریاں اور انتہائی فحش فلم چل رہی تھی۔ مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں دوسری طرف کرلیں۔ جی میں آیا کہ اٹھ کر چلا جاؤں۔ مگر میں خواہش اور کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ میں نے شروع میں ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ میں یہ سفرنامہ لکھتے وقت جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا اور ہر بات سچ سچ بیان کردوں گا۔ تو سچی بات یہ ہے کہ میرے اندر جو ایک واہیات آدمی چھپا ہوا ہے' اس نے مجھے سینماہال سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ شروع شروع میں میرے اندر کے شریف آدمی اور واہیات آدمی کی آپس میں تھوڑی دیر کے لئے تو تو میں میں ہوئی۔ پھر شریف آدمی ایک طرف منہ چھپا کر بیٹھ گیا اور واہیات آدمی میرے ساتھ فلم دیکھنے لگا۔ فلم واقعی بے حد واہیات تھی۔ یعنی میرے اندر کے واہیات آدمی سے بھی زیادہ واہیات تھی۔

سینماہال میں بیٹھے ہوئے لوگ اب مجھے نظر آنے لگے تھے۔ وہاں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھیں۔ میں نے ایک طرف جاکر گیلری سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ آدھا ہال بھرا ہوا تھا۔ ہال میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں واپس اپنی سیٹ کی طرف آیا تو ایک قطار میں مجھے ایک جوڑا ایک دوسرے کے بالکل ساتھ لگا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بڑی واہیات حرکتیں کر رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا:

"جو کچھ سکرین پر ہو رہا ہے' اس کی گرد کو بھی تم لوگ نہیں پہنچ سکتے!"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سینماہال جہاں فحش فلمیں دکھائی جاتی ہیں' سارا دن ساری رات چلتے رہتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن صرف ہال کی مشین کی صفائی کے لئے سینما بند ہوتا ہے۔ لوگ جب اور جس وقت چاہیں ٹکٹ لے کر آتے ہیں اور ہال میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جتنا دل چاہتا ہے' فلم دیکھتے ہیں اور جب دل چاہتا ہے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں عورتوں کو ٹکٹ میں خاص رعائت دی جاتی تھی۔ میں نے واشنگٹن میں بھی اسی قسم کے ایک سینماہال میں ایک واہیات فلم دیکھی تھی۔ وہاں ٹکٹ پانچ ڈالر تھا۔ لیکن ایک خاص رعائت یہ تھی کہ اگر آپ کسی عورت کو ساتھ لاتے ہیں تو عورت بغیر ٹکٹ کے آپ کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی۔ اس کی مجھے آج تک وجہ سمجھ نہیں آسکی۔

بہرحال میں گیلری میں بیٹھا بڑی توجہ اور مزے سے واہیات فلم دیکھتا رہا۔ وہاں بیٹھنے کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔ جتنی دیر چاہے' آپ بیٹھے رہیں۔ لیکن وہ لوگ اس معاملے میں بھی وقت کے بڑے پابند تھے۔ جتنا جس

کسی نے وہاں بیٹھنا ہوتا' وہ اتنی دیر ہی بیٹھتا۔ اس کے بعد اٹھ کر باہر نکل جاتا۔ یوں اس قسم کے سینما گھروں میں عورتوں اور مردوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ میں کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ جب فلم دیکھتے دیکھتے میرے اندر کا واہیات آدمی بھی بیزار ہو گیا تو میں اٹھ کر چلا آیا۔ باہر آیا تو واقعی شام ہو چکی تھی اور سڑکیں سٹریٹ لیمپوں اور نیون سائنز کی روشنیوں میں جگمگانے لگی تھیں۔

اب وینس کی نہروں والی گلیوں کی سیر کا وقت ہو گیا تھا۔ بڑی سڑک پر آ کر میں نے ٹریفک کے ایک سپاہی سے ان گلیوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے سارا راستہ ذہن نشین کرا دیا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق پہلے ایک بس میں سوار ہوا۔ اس کے بعد ایک خاص مقام پر پہنچ کر دوسری بس پکڑی اور اس بس نے مجھے شہر کے سب سے بڑے جزیرے ریالٹو کے سٹاپ پر پہنچا دیا۔ یہیں مجھے اترنے کے لئے کہا گیا تھا۔ نیچے اترتے ہی مجھے ہوا میں سمندر کے پانی کی مرطوب بو محسوس ہوئی۔ میں بڑا خوش ہوا۔ پوچھتا پوچھتا آخر میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں مجھے اونچی اونچی روشن عمارتوں کے درمیان پانی جھلملاتا نظر آیا۔

ایک جگہ چھوٹا سا ڈاک یارڈ تھا۔ یہاں مور کے شکل کی کشتیاں جنہیں گنڈولا کہا جاتا تھا' پانی میں کھڑی اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ سیاح اور سیرو تفریح کے شوقین مرد اور عورتیں ٹکٹ لے کر ان کشتیوں میں سوار ہو رہے تھے۔ میں بھی ایک کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی کا ملاح سانولے رنگ کا گھنگھریالے بالوں والا آدمی تھا۔ جب کشتی بھر گئی تو وہ چپو چلاتا کشتی کو جیٹی سے نکال کر وینس کی نہروں والی گلیوں کی طرف چل پڑا۔ میں زندگی میں پہلی بار ایسی گلیاں دیکھ رہا تھا جن میں نہریں بہہ رہی تھیں۔ پانی کا رنگ رات کے وقت سنہری

مائل گہرا گہرا تھا۔ ان میں ارد گرد کی عمارتوں کی روشنیوں کا عکس بڑا ہی دلفریب لگ رہا تھا۔ گنڈولا آبی گلیوں میں بڑی ہلکی رفتار کے ساتھ گذر رہا تھا۔ مجھے مکانوں کے اندر بیٹھے لوگ اور پہلی منزلوں کے دالان اور پرانی حویلیوں کی ڈیوڑھیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ ایک عورت ڈیوڑھی میں سے باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا تسلا تھا۔ اس نے سیڑھی کے پاس آکر تسلے کا پانی گلی کی نہر میں انڈیلا اور ہماری طرف نگاہ اٹھائے بغیر واپس مکان میں چلی گئی۔

ہماری کشتی جس گلی میں سے گذرتی اس کے اوپر پل ضرور بنا ہوا ہوتا تھا۔ یہ پل پیدل چلنے والوں کے لئے تھا اور ایک گلی کو دوسری گلی بلکہ ایک علاقے کے مکانوں کو دوسرے علاقے کے مکانوں سے ملاتا تھا۔ سمندر کا پانی مکانوں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آجاتا تھا۔ اصل میں یہ مکان سمندر میں نہیں بنے تھے بلکہ سمندر کے نیچے سے جو پہاڑیاں اوپر ابھری ہوئی تھیں، یہ عمارتیں ان پہاڑیوں پر بنائی گئی تھیں۔ چنانچہ گلیوں کا پانی انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ ایک گائیڈ بھی کشتی میں بیٹھا تھا جو کبھی فرانسیسی، کبھی اطالوی اور کبھی شکستہ انگریزی میں ساتھ ساتھ کمنٹری کرتا جارہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وینس میں اس قسم کی ایک سو ستتر (۱۷۷) نہریں بہتی ہیں اور ان پر چار سو پچاس پل بنے ہوئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ نہریں ایک دوسری کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ اگر کوئی سیاح گائیڈ کی مدد کے بغیر اکیلا نہروں کی سیر کو نکلے تو وہ راستہ بھول بھی سکتا ہے۔ آس پاس کے مکانوں میں سے عورتوں، بچوں، مردوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کئی مکانوں میں سے تیز میوزک کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ دو ایک فرلانگ کے بعد نہر

کے اوپر بنا ہوا رنگین پل آجاتا تھا جس پر روشنی ہو رہی ہوتی تھی۔ میں نے لاہور میں پڑھ رکھا تھا کہ وینس کی ان آبی گلیوں میں ایک بہت بڑی قدیم حویلی ہے جس کے درمیان میں نہر بہتی ہے اور حویلی کے دونوں حصوں کو ایک پل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے۔ یہ پل دونوں طرف سے اوپر سے ڈھکا ہوا ہے اور ایک روایت کے مطابق جب راتیں اندھیری ہوتی ہیں تو کسی ایک رات کو جب فضا میں گہرا سکوت طاری ہوتا ہے' اس پل کی لکڑی کی جالیوں کے پیچھے کسی عورت کی آہیں بھرنے کی آواز آتی ہے۔ چنانچہ اس مناسبت سے اس پل کا نام ہی "آہوں والا پل" پڑ گیا ہے۔ جب میں نے گائیڈ سے اس بارے میں بات کی تو اس نے خالص کمرشل انداز میں کندھے جھٹکاتے ہوئے کہا:

"نو سینور نو۔ ادھر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ کسی اندھیری رات کو میں اکیلا یہاں آؤں گا اور "آہوں والا پل" کی پراسرار آہوں کا راز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں چونکہ کشتی میں دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھا تھا' اس لئے گائیڈ کو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے کم از کم آہوں والا پل دکھادے۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے مسافروں اور سیاحوں نے بھی اس پراسرار پل کے متعلق کسی قسم کے اشتیاق کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کشتی یعنی گنڈولا گلیوں کی نہروں پر ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتی چلتی رہی۔ یہ خالص کمرشل قسم کا سفر تھا۔ میری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی جگہ رک کر کنارے کے فرش پر یا پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ارد گرد کے مکانوں اور دن کی روشنیوں کو دیکھوں۔ کچھ حویلیاں ایسی بھی گزریں کہ جن کے دالان ویران پڑے تھے۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ بے آباد حویلیاں ہیں۔ اور یہاں کسی زمانے میں روم کے سرداروں کی رہائش تھی۔ سرداروں سے مراد کاؤنٹ تھی۔ میں ان ویران بے آباد حویلیوں کو اندر سے دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر کشتی لگی بندھی رفتار سے آبی گلیوں میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کسی گلی میں کسی بھی جگہ نہیں رکی تھی۔ ایک سائیڈ کیفے بھی آیا جہاں لوگ دالان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے کافی اور مارٹینی وائن وغیرہ پی رہے تھے۔ کشتی

وہاں بھی نہ رکی۔ اس طرح میں نے وینس کی آبی گلیوں کی ساری سیر کی اور کشتی کے دوسروں مسافروں کے ساتھ چھوٹی سی جیٹی یا گھاٹ پر آکر اتر گیا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میں پتہ کرنا چاہتا تھا کہ آسمان پر کہیں چاند تو نہیں نکلا ہوا۔ چاند کیا مجھے تارے بھی نظر نہ آئے۔ وہاں اتنی روشنیاں ہو رہی تھیں کہ آسمان کسی مٹیالے گرد آلود صحرا کی طرح لگ رہا تھا۔ حالانکہ اٹلی میں یہ بہار کا موسم تھا اور اٹلی کے مضافات میں آسمان بڑا شفاف ہوتا ہے اور تارے بھی چمکتے نظر آجاتے ہیں۔ لیکن شہر میں روشنیوں اور دھوئیں کی آلودگی کی وجہ سے رات کو آسمان پر کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ بہرحال چاند آسمان پر نہیں تھا۔ کیونکہ اگر چاند ہوتا تو وہ ضرور نظر آجاتا۔ میں اصل میں اندھیری رات کا منتظر تھا تاکہ میں آہوں والے پل کا دیدار کر سکوں اور اگر وہاں واقعی آدھی رات کو کسی لڑکی کے آہیں بھرنے کی آواز آتی ہے تو معلوم کروں کہ یہ معمہ کیا ہے۔ لیکن اس رات میں اس مہم پر روانہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ مجھے صبح کو صحیح طور پر علم نہیں تھا کہ یہ راتیں اماوس کی ہیں یا آدھی رات کے بعد چاند نظر آجائے گا۔

میرا دل خوش بھی تھا کیونکہ بہرحال میں نے وینس کی آبی گلیوں کی کافی سیر کر لی تھی۔ وہاں بے شمار ہوٹل، کیفے اور ریستوران تھے۔ ایک کیفے میں میں نے کھانا کھایا۔ کافی پی اور واپس شہر کے اندرونی علاقے یعنی ڈاؤن ٹاؤن میں اپنے تبلیغی جماعت والے ٹھکانے پر آگیا۔ مجھے قدومی دروازے پر ہی مل گیا۔ وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر رک گیا۔ انگریزی میں پوچھا:

"برادر! لگتا ہے تم بڑی لمبی سیر کر کے آرہے ہو۔ کیونکہ میں نے صبح

صبح سے تمہیں نہیں دیکھا۔"

میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"میں وہ گلیاں دیکھنے گیا ہوا تھا جہاں نہریں بہتی ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولا:

"بہت خوب۔ وینس میں یہ بھی ایک عجوبہ چیز ہے۔ بڑی دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔"

وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے میرے ساتھ ہی ہال کمرے میں آگیا۔

"تم نے کھانا کھالیا ہے کہ نہیں۔؟"

میں نے کہا:

"میں نے کھانا کھالیا ہے برادر۔"

وہ ناراض ہو گیا:

"کھانے کا تو یہاں لنگر چلتا ہے۔ تم نے پیسے کیوں خرچ کئے؟ سیاح کو تو پیسے بچا بچا کر رکھنے چاہیے؟"

میں مسکرانے لگا۔

"اچھا آؤ میرے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھو۔"

وہ مجھے ہال کے آفس میں لے گیا۔ یہاں ایک اور عالم دین بیٹھے تھے۔ قدومی نے میرا ان سے تعارف کرایا اور کہا کہ یہ صاحب پاکستان سے آئے ہیں۔ اس عالم دین نے میرے ساتھ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پاکستان کے ساتھ اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے لگا۔ وہ صاحب چلے گئے تو قدومی مجھے عربی کتابوں کے کچھ تراجم دکھانے لگا۔ ان کتابوں کی چھپائی

نہائیت اعلی تھی۔ یہ انگریزی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ ان میں کچھ حدیث پاک کی کتابیں تھیں اور کچھ ابتدائی دینی علوم کے بارے میں تھیں۔ وہ مجھ سے رہائش کے بارے میں پوچھنے لگا کہ لائبریری میں مجھے رات کو سونے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ میں نے کہا:

"نہیں، بلکہ میں تو بڑے مزے سے سوتا ہوں، قدومی برادر اور پھر میں تو حالت سفر میں ہوں۔ اتنے بڑے شہر میں اتنی اچھی اور پھر مفت جگہ مل گئی ہے، میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں، کم ہے۔"

وہ بڑے اخلاق کے ساتھ کہنے لگا:

"تم ہمارے پاکستانی مسلم بھائی ہو۔ تمہاری میزبانی ہمارا فرض ہے۔

اس کے بعد وہ کھانا کھانے ہال کمرے کے لنگر خانے کی طرف چل دیا اور میں اپنی لائبریری والی چھوٹی سی خواب گاہ میں آگیا۔ اس وقت وینس میں رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ لائبریری کی جو چھوٹی کھڑکی عقبی گلی کی طرف کھلتی تھی، وہ بند تھی مگر بند کھڑکی میں سے بھی دوسری طرف کے مکانوں میں سے ٹیلی ویژن پر خبروں اور گانے وغیرہ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بتی بجھادی اور کمبل اوپر لے کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سارے دن کا تھکا ہوا تھا۔ مجھے فورا نیند آگئی۔

معلوم نہیں رات کتنی گذر چکی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے خواب کی طرح احساس ہو رہا تھا کہ عقبی گلی میں سے کوئی تیز تیز دوڑتا ہوا گذر گیا ہے۔ اس کے قدموں کی دھمک سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اب گلی میں سناٹا تھا۔ رات ضرور آدھی سے زیادہ گذر گئی تھی۔ کیونکہ گلی کے مکانوں میں

سے کسی مکان میں سے کسی مکان میں سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کوئی آدمی بھاگتا ہوا گذرا ہو۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ میں نے پہلو بدلا اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی میں نیند کی آغوش میں واپس جا ہی رہا تھا کہ گلی میں اچانک کسی عورت کی چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ پھر ساتھ ہی دور سے کوئی انسان بھاگتا ہوا آیا اور زور زور سے گلی کے فرش پر پاؤں مارتا ہوا میری کھڑکی کے نیچے سے گذر گیا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ دیکھنا چاہیے گلی میں کیا ہو رہا ہے۔ شاید کسی عورت پر کوئی تشدد کر رہا ہے۔ میں نے کھڑکی کی چٹخنی کھول کر گلی میں دیکھا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ پیچھے گلی کے موڑ پر سٹریٹ لیمپ کی دھیمی روشنی میں گلی خالی نظر آرہی تھی۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ دائیں جانب پھر اس عورت کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے جوتے پہنے اور کھڑکی میں سے گلی میں اتر گیا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ اس طرف چلنے لگا جدھر سے عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ گلی سنسان تھی۔ مکانوں کی روشنیاں بجھی بجھی ہوئی تھیں۔ گلی آگے جا کر ایک طرف مڑ گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد سامنے ایک ویران جگہ آگئی جہاں ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں اونچے اونچے درختوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔ میں نے آگے جانے کا خیال ترک کر دیا۔ کیونکہ وہاں جا کر گلی اور گلی کے پرانے طرز کے مکانوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ ابھی میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ وہی چیخ پھر سنائی دی۔ اس بار عورت نے اطالوی زبان میں مدد کے لئے بھی پکارا تھا۔

میں بے اختیار ہو کر درختوں کی طرف دوڑ پڑا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں جوانی کے جوش میں یہ کیا حماقت کر رہا ہوں۔ اس ملک میں تو ایسے جرائم ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کہیں کوئی مصیبت نہ پڑ جائے۔ مگر اس دوران میں دوڑتے ہوئے ویران جگہ پر درختوں کے قریب آچکا تھا۔ میں وہیں رک گیا اور اندھیرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا کہ یہ جگہ کونسی ہے اور وہ عورت کہاں چلی گئی جس نے تیسری بار چیخ کر مدد کے لئے آواز دی تھی۔ بہت جلد مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ میں ایک ویران سے قبرستان میں آگیا ہوں۔ میں نے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں بڑے بڑے خوبصورت کرسچین قبرستان دیکھے ہیں۔ جہاں بڑے سلیقے اور قرینے سے قبریں ساتھ ساتھ بنی ہوتی ہیں اور وہاں رات کو خوب روشنی بھی ہوا کرتی ہے مگر یہاں بالکل اندھیرا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں قبروں کے ٹیڑھے میڑھے کتبے نظر آرہے تھے۔ صلیب کے نشان بھی ایک طرف کو جھک گئے تھے۔ کئی قبروں کے ارد گرد گھاس اگی ہوئی تھی۔ ایک بات میرے اندر شروع ہی سے ہے کہ قبرستان سے مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔ قبرستان مجھے بڑی رومانٹک جگہ لگتی ہے۔ مجھے قبرستان میں آکر ہمیشہ یہی احساس ہوا ہے کہ یہاں روحیں زندگی کے جھمیلوں اور پریشانیوں سے آزاد ہونے کے بعد آرام کر رہی ہیں۔ اور عیسائیوں کے قبرستان تو مجھے اپنے سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے گلدانوں، فرشتوں کے مجسّموں اور بچوں کی قبروں پر جھکے ہوئے معصوم پریوں کے مجسّموں کی وجہ سے ہمیشہ بڑے پیارے لگتے ہیں۔ ان قبرستانوں سے گذرتے ہوئے مجھے ایک عجیب قسم کی بے ضرر اور پاکیزہ افسردگی کا احساس ہوتا ہے۔

چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ میں مسیحیوں کے قبرستان میں

کھڑا ہوں تو مجھے ذرا بھی ڈر نہ لگا۔ بلکہ میں نے دل میں اللہ تعالی سے وہاں آلودہ روحوں کی مغفرت کے لئے دعا بھی کی۔ مگر میں اس بات پر ضرور حیران تھا کہ وہ عورت مجھے کہیں نظر نہیں آرہی تھی جس کے چیخنے کی آواز میں نے تین دفعہ سنی تھی اور تیسری بار تو اس نے کسی کو مدد کے لئے بھی پکارا تھا۔ میں نے اس عورت کے خیال کو دل سے نکال دیا اور واپس جانے کے ارادے سے مڑنے لگا تو اچانک مجھے کسی کے تیز دوڑنے کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قبرستان کے دھندلے اندھیرے میں ایک عورت میری طرف دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔ تب میں واقعی ڈر گیا کہ ضرور یہ کوئی چڑیل یا بھوت پریت ہے۔ میں بھاگنے ہی لگا تھا کہ اس عورت نے ہاتھ بلند کر کے کہا:

"میں بھوت نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں۔"

میں ہکا بکا سا ہو کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سب سے زیادہ حیرانی مجھے اس بات کی تھی، یہ جملہ اس عورت نے اردو زبان میں کہا تھا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ وہ میرے پاس آکر میرے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی:

"وہ میرے پیچھے لگا ہے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔"

یہ ایک گوری چٹی لڑکی تھی۔ اس کے بال سنہری تھے اور عمر زیادہ سے زیادہ بیس اکیس برس کی ہوگی۔ میں نے قبروں کے پیچھے جو درخت تھے۔ اس طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"مجھے تو وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔"

وہ لڑکی میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ اور ٹھنڈا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"تم کون ہو؟ تم اردو بولتی ہو۔ تم ہندوستان کی رہنے والی ہو یا پاکستان کی؟"

لڑکی نے اپنا سانس اور بال ٹھیک کرتے ہوئے کہا:

"یہ باتیں میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پلیز مجھے اس ظالم سے بچالو۔"

میں نے کہا:

"تم کس کی بات کر رہی ہو ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے؟"

لڑکی نے میرے پیچھے درختوں کی طرف دیکھا اور پھر گہرا سانس بھر کر بولی:

"وہ بھاگ گیا ہو گا۔ خدا کا شکر ہے۔"

"کیا تم مسلمان ہو۔"

"ہاں۔" اس نے اپنے لباس کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں آدھی رات کو اس قبرستان میں کیسے آگئی ہو؟ تم کہاں رہتی ہو؟ کیا اس سے پہلے بھی تم گلی میں سے چیخ مارتی ہوئی گذری تھیں؟"

"ہاں۔ کیا کروں۔ میں گھر میں اکیلی تھی۔ میرے ماں باپ پاکستان میں رہتے ہیں' میں یہاں اپنی خالہ کے پاس آئی ہوئی ہوں' آج گھر پر اکیلی تھی۔ خالہ نہ پلز گئی ہوئی ہیں۔ یہ آدمی مجھے اکیلا دیکھ کر گھر میں گھس آیا۔ اس نے میری عزت پر حملہ کرنا چاہا' میں نے مزاحمت کی تو اس نے خنجر نکال لیا' میں نے کھڑکی میں سے گلی میں چھلانگ لگا دی اور قبرستان کی طرف بھاگ اٹھی۔"

اس نے جلدی جلدی مجھے ساری داستان سنادی۔ ستاروں کی دھندلی روشنی میں اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے کسی نے ہیرے کوٹ

کر بھر دیئے ہوں۔ ایسی طلسم خیز آنکھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ بڑی روانی سے اردو بول رہی تھی اور بار بار ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھتی اور خدا کا شکر ادا کرتی۔ مجھے اس پر شک پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے کہا:

"چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ کیا تم ان گلیوں میں کسی مکان میں رہتی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے اپنے فراک کو نیچے کرتے ہوئے کہا۔

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے ابھی تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ ظاہر ہے وہ سخت خوف زدہ تھی اور خوف کی وجہ سے ہی اسکا ہاتھ بھی ٹھنڈا تھا۔ ہم قبرستان سے نکل کر گلی میں آئے تو اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا:

"تم بھی بڑی اچھی اردو بولتے ہو۔ تم مسلمان ہو؟ کیا تم بھی پاکستان کے رہنے والے ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا:

"ہاں میں بھی پاکستان سے آیا ہوں۔ میں ٹورسٹ ہوں۔ وینس شہر کی سیاحت کرنے یہاں آیا ہوں اور مسلمان ہوں۔"

پھر میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ چلتے چلتے میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک پراسراریت تھی۔ میں نے اسے کہا:

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

وہ بولی:

"میرا نام گلنار ہے۔ یہ نام میری نانی نے رکھا ہے۔ میری پیدائش راول پنڈی کی ہے' میری نانی کو اناروں کے پھولوں سے بڑا پیار تھا۔ ماں کہتی ہے کہ اسی لئے نانی نے میرا نام گلنار رکھا۔"

تب میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں زمرد ایسی چمک کیوں تھی۔ پوٹھوہار کے علاقے میں اکثر لوگوں کی آنکھوں کا رنگ ایسا ہوتا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

"تم یہاں کہاں رہتے ہو؟"

میں نے گلی میں گذرتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا:

"وہ سامنے جو کھڑکی تمہیں نظر آرہی ہے' اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی پرانی لائبریری ہے۔ اس لائبریری میں کھڑکی کے ساتھ ایک کیمپ کارٹ بچھی ہے۔ میں اس پر سوتا ہوں اور اسی پر رہتا بھی ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ اس بار اس کی ہنسی کی کھنک سی بھی سنائی دی تھی۔

"تم نے میری آواز کہاں سنی تھی؟"

"جس وقت گلی میں سے گذرتے ہوئے چیخی تھیں تو میں جاگ رہا تھا۔ پھر میں نے کسی کی بھاری قدموں کی آواز سنی۔ اس کے بعد دوبارہ تمہاری چیخ کی آواز آئی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور میں تمہاری مدد کرنے کھڑکی سے کود کر اسی طرف دوڑا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میں ایک قبرستان میں آگیا ہوں۔"

گلنار نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور میرے ساتھ لگ گئی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ درندہ ضرور میرے پیچھے پیچھے آرہا ہو گا۔

پھر میرا ہاتھ دونوں ہاتھ میں تھام کر التجا کے انداز میں بولی:

"کیا تم مجھے رات کی رات اپنے پاس نہیں رکھ سکتے؟ میں صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔ میں گھر میں اکیلی ہوں' اس درندے کو میرے گھر کا علم ہے۔ وہ ضرور وہاں آئے گا اور مجھے قتل کر دے گا۔"

میں نے کہا:

"چلو میں تمہیں پولیس اسٹیشن لئے چلتا ہوں۔"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"نہیں' نہیں' پولیس کا نام نہ لو۔ میں یہاں کی پولیس کو جانتی ہوں۔ اس طرح میری خالہ کی بدنامی بھی ہوگی۔ پلیز تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تھوڑی سی رات باقی رہ گئی ہے۔ میں زمین پر بیٹھ کر گذار دونگی۔"

اس کے لہجے میں بے حد عاجزی تھی مگر میں اسے اپنے ساتھ لائبریری میں کیسے لے جاتا۔ اس قسم کی حماقت میں بھول کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو میں تبلیغی جماعت کے اپنے دوست قدومی کے پاس لے جاتا ہوں' اس کی فیملی بھی وہیں رہتی ہے۔ میں نے اسے کہا:

"اگر تم واقعی اپنے گھر واپس جانے سے ڈرتی ہو تو چلو میں تمہیں اپنے دوست کے گھر لئے چلتا ہوں۔"

جب میں نے اسے تبلیغی جماعت کے سربراہ قدومی اور اس کی فیملی کے بارے میں بتایا تو وہ گھبرا گئی۔

"خدا کے لئے انہیں میرا نہ بتانا۔ انہیں پتہ چل گیا تو میرے خالو

اور خالہ کی محلے میں بڑی بدنامی ہوگی۔ تبلیغی جماعت والے میرے خالو سے واقف ہیں۔"

میں نے کہا:

"اس میں بدنامی کی کونسی بات ہے۔ تم کہہ دینا رات کو میں گھر میں اکیلی تھی، کوئی بدمعاش گھس آیا۔ میں کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگی اور تبلیغی جماعت کے ہال میں پناہ لینے آگئی۔"

گلنار سرہلاتے ہوئے بولی:

"نہیں، نہیں۔ پلیز مجھے ان لوگوں کے پاس نہ لے جاؤ۔ تم نہیں سمجھتے۔ کوئی میرے بیان پر اعتبار نہیں کرے گا۔ سب کہیں گے کہ میں ہی بدمعاش لڑکی ہوں۔"

میں عجیب کش مکش میں پڑ گیا تھا۔ اگر میں اسی لائبریری والے اپنے کمرے میں لے بھی جاؤں تو اگر قدومی کو کسی طرح پتہ چل گیا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا کہ میں آدھی رات کو ان کی لائبریری میں ایک لڑکی کو لے کر آگیا تھا۔ دوسری طرف گلنار گلی میں کھڑی کھڑی زیادہ پریشان ہو رہی تھی۔ پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔

"پلیز! تھوڑی سی رات رہ گئی ہے۔ مجھے اپنے کمرے میں لے چلو۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ صبح ہوتے ہی میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ رات کے وقت مجھے اپنے اکیلے گھر میں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ وہ ضرور آکر مجھے قتل کر دے گا۔ تم یہاں کے غنڈوں کو نہیں جانتے، یہ ایک منٹ میں قتل کر دیتے ہیں۔"

میں بے بس ہو گیا۔ میں نے ہتھیار پھینک دیئے اور گلنار سے کہا:

"اچھا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

یہ میری حماقت تھی۔ مجھے اس اجنبی لڑکی کو رات کے وقت اپنے کمرے میں نہیں لانا چاہیے تھا۔ کیونکہ میں کسی ہوٹل میں نہیں رہ رہا تھا۔ ایک باوقار تبلیغی جماعت کی عمارت میں رہ رہا تھا۔ میں گلنار کو کھڑکی کے ذریعے لائبریری میں لے آیا۔ اسے اپنی کیمپ کارٹ پر سونے کو کہا اور خود اپنی جیکٹ میں سمٹ کر وہیں کمرے میں ایک طرف پڑ رہا۔ گلنار نے مجھے بہت کہا کہ تم بھی چارپائی پر ایک طرف لیٹ جاؤ۔ لیکن میں یہ خطرناک غلطی کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اٹلی میں داخل ہونے کے بعد ایلس کا جو تلخ تجربہ ہو چکا تھا' میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑی سی رات باقی رہ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ باقی رات میں جاگ کر گذار لوں گا۔ مگر مجھے نیند آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میں نے چارپائی کی طرف دیکھا۔ چارپائی خالی تھی۔ گلنار جا چکی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ چارپائی پر میرا کمبل پڑا تھا۔ میں کمبل میں گھس گیا۔ کمبل کی گرماہٹ نے مجھے بڑی جلدی نیند کی آغوش میں دے دیا۔

دوسری بار میری آنکھ اس وقت کھلی جب دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے میرا دوست قدومی کھڑا تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا:

"کیا آج سارا دن سونے کا پروگرام ہے؟"

میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"رات دیر سے سویا تھا۔"

قدومی میرے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ

کچھ خاموش خاموش ہے۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"رات تمہارے پاس کوئی لڑکی آئی ہوئی تھی۔"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔ میں شرمندہ تھا۔ قدومی کے آگے اب میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اسے کسی ذریعے سے معلوم ہو چکا تھا کہ گلنار رات میرے کمرے میں تھی۔ میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان سنادی اور اسے بتایا کہ کس طرح رات کو مجھے باہر گلی میں کسی کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں اور پھر کسی لڑکی کی چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر کس طرح میں اس کی مدد کے لئے گلی میں اتر گیا اور پھر قبرستان میں گلنار کو دیکھا جو سخت گھبرائی ہوئی تھی اور ایک غنڈا اسے قتل کرنے کے لئے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا:

"گلنار پاکستانی لڑکی ہے۔ اس کے ماں باپ پاکستان سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے اور وہ وینس میں ہی پیدا ہوئی تھی۔"

قدومی بڑے غور سے میرا بیان سن رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ گلنار کا گلی میں ذرا آگے جاکر مکان ہے اور اس کے ماں باپ گھر میں نہیں تھے، اس لئے اس کے اصرار پر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ میں نے قدومی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"میں خدا کو گواہ بناکر کہتا ہوں کہ میں نے لڑکی کے ساتھ کوئی گناہ نہیں کیا۔"

قدومی بولا:

"پہلی بات تو یہ ہے کہ پچھلی گلی میں شروع سے آخر تک کوئی پاکستانی

فیملی نہیں رہتی۔ یہاں سب اطالوی خاندان آباد ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جماعت خانے کے چوکیدار نے لڑکی کو تمہارے اس کمرے سے باہر نکلتے دیکھ لیا ہے۔ اگرچہ میں نے اسے منع کر دیا ہے کہ وہ اس بات کا ذکر کسی تیسرے آدمی سے نہ کرے لیکن مجھے اس پر اعتبار نہیں ہے۔"

میں نے قدومی سے کہا:

"میرے دوست! یقین کرو میں بے گناہ ہوں۔ ہاں مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوگئی تھی کہ میں لڑکی پر ترس کھاکر اس کی زندگی بچانے کے واسطے اسے اس کمرے میں لے آیا۔"

قدومی کچھ دیر خاموش رہا۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر کہنے لگا:

"دوست! میرا خیال ہے کہ اب تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ چوکیدار کے منہ سے ضرور بات نکل جائے گی اور اس طرح میری بدنامی ہونے کا ڈر ہے۔ کیونکہ میں ہی تمہیں یہاں لایا تھا۔"

میرے لئے قدومی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ میں کسی حالت میں بھی اپنے دوست اور محسن قدومی کے لئے بدنامی کا باعث نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں تو ایک سیلانی تھا۔ وہاں نہیں تو کسی دوسری جگہ بسیرا کر سکتا تھا۔ میں نے قدومی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا:

"قدومی بھائی! میں آج ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں، مجھے تمہاری عزت بے حد عزیز ہے۔"

قدومی جذباتی ہو گیا۔ کہنے لگا:

"میں مجبور ہوں دوست! اگرچہ ہم لوگ یورپ کے ایک مادر پدر آزاد معاشرے میں رہ رہے ہیں مگر ہماری تبلیغی جماعت کا ایک ضابطہ اخلاق

ہے۔ یہ یہاں اسلام کی تبلیغ کے مقدس مشن پر آئے ہوئے ہیں۔ ہم دوسروں کے لئے اعلیٰ کردار کا نمونہ بن کر یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے تم معاف کر دینا۔ میں جانتا ہوں تم سچ کہہ رہے ہو۔ لیکن آدھی رات کو کسی لڑکی کا تمہارے کمرے میں آجانا ہمارے مشن کو بدنام کرنے کے لئے کافی ہے۔"

میں نے اٹھ کر جیکٹ پہننے اور اپنے تھیلے کو ٹھیک کرنے لگا۔ قدومی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"لیکن میں تمہیں ناشتہ کروائے بغیر یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ آؤ میرے کمرے میں آؤ۔"

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میں نے غسل کیا۔ قدومی نے کمرے میں ہی میرے اور اپنے لئے ناشتہ منگوا رکھا تھا۔ ناشتے پر وہ کہنے لگا:

"میں جانتا ہوں تم اس شہر میں اجنبی ہو، تمہارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ تم کسی ہوٹل کے اخراجات برداشت کر سکو۔"

میں نے کہا:

"میں وائی ایم سی اے ہوسٹل میں کوئی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

قدومی کچھ سوچ رہا تھا۔ میری پیالی میں کافی انڈیلتے ہوئے بولا:

"ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے قدومی کی طرف پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ سینٹ پال کے علاقے میں میرا ایک مراکشی مسلمان دوست سلیمان رہتا ہے۔ وہ شہر میں ٹیکسی چلاتا ہے۔ اس کے پاس ایک کمرے

کافلیٹ ہے۔ میں اسے فون کرتا ہوں۔ اس وقت وہ گھر پر ہی ہو گا۔ اگر وہ راضی ہو جائے تو تم اس کے فلیٹ میں جتنے روز چاہو' رہ سکتے ہو مگر دو ایک دن بعد اپنے کھانے پینے کا تمہیں خود انتظام کرنا ہو گا۔ مطلب یہ کہ تم کسی جگہ جاب کر لینا اور گروسری کی کچھ رقم سلیمان کو ادا کر دینا۔"

قدومی نے ٹیلی فون اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف سے اسے آواز آئی تو قدومی نے مسکرا کر عربی زبان میں اپنے مراکشی دوست سلیمان سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر ٹیلی فون بند کر کے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولا:

"دوست! تمہارا کام بن گیا ہے۔ سلیمان تمہیں اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہو گیا ہے۔ وہ تمہیں کسی جگہ چھوٹی موٹی نوکری بھی دلوا دے گا۔"

ناشتے کے بعد قدومی نے مجھے سلیمان کا ایڈریس لکھ کر دیا اور مجھے چھوڑنے باہر تک آیا۔ وہ مجھ سے گلے لگ کر ملا اور بولا:

"مجھے معاف کر دینا دوست! میں مجبور تھا"

میں نے قدومی کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور جہاں سے اس نے بس پکڑنے کے لئے کہا تھا' وہاں سے بس پکڑی اور سینٹ پال کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ سارا راستہ میں یہی سوچتا رہا کہ قدومی نے یہ کیسے کہہ دیا کہ تبلیغی جماعت کی پچھلی گلی میں کوئی پاکستانی فیملی نہیں رہتی تو پھر گلنار کہاں سے آگئی تھی؟ کیا وہ کوئی چھلاوہ تھا؟ کیا وہ کوئی بھوت تھا؟ مگر وہ تو زندہ لڑکی تھی۔ میں عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

بس وینس کی دھوپ میں چمکتے ہوئے کشادہ بازاروں میں سے گذر

رہی تھی۔ اس علاقے میں میں پہلے بھی آچکا تھا۔ یعنی اس علاقے سے گذر چکا تھا۔ بس نے مجھے سینٹ پال کے مین بس سٹاپ پر اتار دیا۔ میں قدومی کے دیئے ہوئے ایڈریس پر پوچھتا پوچھاتا سلیمان کے فلیٹ والی عمارت کے سامنے آگیا۔ یہ ایک بوسیدہ سی پرانے رومن طرز کی بڑے بڑے ستونوں والی عمارت تھی۔ پہلی منزل رومن طرز کی تھی جبکہ اس کی دوسری اور تیسری منزل پر بعد میں چھوٹے چھوٹے کمرشل فلیٹ بنا دیئے گئے تھے۔ میں بوسیدہ سیڑھیاں چڑھ کر قدومی کے مراکشی دوست سلیمان کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔

فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ ایک اطالوی دوشیزہ اوپر سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گریبان کافی کھلا تھا۔ ٹویڈ کا پرانا لیڈیز کوٹ اس نے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ وہ میرے قریب سے گذرتے ہوئے رک گئی۔ میری طرف ایک عاشقانہ سی نگاہ ڈالی اور اطالوی زبان میں کہا:

"تم انڈین..؟"

میں نے مسکرا کر اطالوی زبان میں ہی کہا:

"نہیں، میں پاکستانی ہوں۔"

اب مجھے اتنی اطالوی زبان آگئی تھی۔ اس نے اپنے سرخ ہونٹوں کو اس طرح سکیڑا جیسے بوسہ لے رہی ہو اور پھر ہاتھ اوپر کر کے پھونک مار کر اطالوی میں کہا:

"خدا حافظ! یہ میری طرف سے تمہیں ایک تحفہ ہے۔"

اور وہ مسکراتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

سلیمان کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ میں نے کال بیل کا بٹن پہلے ہی

دبادیا تھا۔ وہ خوش مزاج اطالوی دوشیزہ مجھے ہوائی بوسہ دے کر جاچکی تھی اور میں ابھی تک سیڑھیوں میں اسے جاتا دیکھ رہا تھا کہ فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک گہرے سانولے رنگ اور گھنگھریالے سیاہ بالوں والے نوجوان نے دروازہ کھول کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر میرا نام لیا۔ میں نے انگریزی میں کہا:

"ہاں۔ مجھے قدومی نے بھیجا ہے۔"

اس نوجوان نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے انگریزی میں ہی کہا:

"میرا نام سلیمان ہے۔ اندر آجاؤ۔"

اندر ایک چھوٹا سا کابک نما کمرہ تھا جو دنیا جہان کی الم غلم چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ سلیمان نے ایک کرسی پر پڑے ہوئے کپڑے کو ہٹاتے ہوئے کہا:

"بیٹھ جاؤ۔ تم کافی پیو گے؟"

میں نے کہا کہ ناشتہ کر کے آرہا ہوں۔ گیس کا چولہا کمرے کے اندر ہی کونے میں لگا ہوا تھا۔ سلیمان کافی بنانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

"تم پاکستانی ٹورسٹ ہو۔ مجھے خوشی ہوئی ہے' پاکستان سے ہم مراکشی لوگ بڑی محبت کرتے ہیں۔ میں یہاں پانچ سال سے ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ قدومی نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں وینس دیکھنے کا شوق یہاں لے آیا ہے۔ وینس بڑا خطرناک شہر ہے۔ اٹلی کے سارے شہر خطرناک ہیں۔ یہاں کے لوگ جیب کترے' اٹھائی گیر اور غنڈے ہیں۔ تم بچ کر رہنا۔"

"پھر میری طرف اس نے پلٹ کر پوچھا:

"ابھی تک تمہاری جیب نہیں کٹی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ حیران ہو کر کہنے لگا:

"بڑے تعجب کی بات ہے۔"

وہ کافی کا مگ لے کر لوہے کے پرانے پلنگ پر کپڑے ایک طرف ہٹا کر بیٹھ گیا۔

"بس میں ٹیکسی لے کر نکلنے ہی والا ہوں۔ آج میں ایئر پورٹ پر جا رہا ہوں۔ میلان سے جو فلائیٹ آ رہی ہے' اس کی سواریاں لوں گا۔ دن کی فلائیٹ میں میلان سے کاروباری لوگ آتے ہیں۔ وہ بیس لیرے تک ٹپ دے جاتے ہیں۔"

اس نے سگریٹ سلگایا اور کمرے کی فضا میں گھٹیا تمباکو کی بو پھیل گئی۔ "تم ہمارے پاکستانی مسلمان بھائی ہو۔ تم جب تک چاہو' میرے فلیٹ میں رہو۔ میں تم سے ایک لیرا بھی کرائے کا نہیں لوں گا۔ تم وہ سامنے والے صوفے پر سو سکتے ہو۔ دو گرم کمبل میرے پاس فالتو ہیں۔ وہ تم رات کو لے لیا کرنا۔"

پھر اس نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ جلدی سے کافی کا مگ میز پر رکھا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میلان کی فلائیٹ میں تھوڑی دیر رہ گئی۔ میں جاتا ہوں۔ تم اگر کہیں جانا چاہو تو میں راستے میں تمہیں اتار دیتا ہوں۔"

میرا ارادہ رات کو وینس کی نہروں والی گلیوں کی سیر کرنے کا تھا۔ میں نے کہا:

"نہیں دوست! میں یہاں آرام کروں گا۔"

سلیمان نے اپنی میلی کچیلی جینز کی جیب میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر

اس کے چھلے میں سے ایک چابی نکال کر مجھے دی اور کہا:

"تم میرے دینی پاکستانی بھائی ہو۔ میں تم پر دل سے بھروسہ کرتا ہوں۔ یہ چابی اپنے پاس رکھو۔ اگر تم یہاں کچھ اٹھا کر لے بھی جاؤ گے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ ویسے یہاں سے لے جانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں دوپہر کے بعد آؤں گا۔ یا شاید شام کو آؤں۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر سلیمان جیکٹ کاندھے پر ڈال کر فلیٹ سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں پلنگ کی ریلنگ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ مجھے وینس شہر میں سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔ مجھے ایک بار پھر گلنار کا خیال آ گیا۔ اگر قدومی کا بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ اس علاقے میں کوئی پاکستانی فیملی نہیں رہتی تو پھر گلنار کون تھی؟ پھر میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور یہ سوچنے لگا کہ مجھے جاب کہاں مل سکتی ہے اور میں کس قسم کی نوکری یہاں کر سکتا ہوں۔ میں نے سوچا سلیمان آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔ میری جیب میں اطالوی کرنسی ابھی اتنی موجود تھی کہ میں پندرہ بیس یوم تک گذارہ کر سکتا تھا۔

میں نے فلیٹ کے دروازے پر اندر سے چٹخنی لگا دی تھی۔ میں نے سونے کی کوشش کی مگر مجھے اجنبی جگہ پر نیند نہ آئی۔ ویسے بھی سلیمان کا کمرہ بڑا گندہ تھا۔ سوچا کیوں نہ سینٹ پال کے علاقے کی سیر کی جائے۔ میں دروازے کو مقفل کر کے سڑک پر آ گیا۔ یہ علاقہ شہر کا گنجان علاقہ تھا۔ دکانیں مختلف اشیاء سے بھری پڑی تھیں۔ یورپ کی ٹورسٹ عورتیں اور مرد جگہ جگہ دکانوں کے شوکیسوں میں جھانکتے نظر آ رہے تھے۔ ان دکانوں میں اٹلی کے سوینئرز بک رہے تھے۔ ریستوران بھی تھے۔ ان ریستورانوں کے

قریب سے گذرتے ہوئے خمیری روٹیوں اور گرم مسالوں کی خوشبو آتی۔ ہر عمر کی اطالوی عورتیں ایک دوسری سے اونچی آواز میں باتیں کرتی فٹ پاتھ پر گذر رہی تھیں۔

میں نے سلیمان کے فلیٹ والے چوک کی نشانی ذہن میں رکھ لی تھی۔ آوارہ گردی کرتے کرتے میں ایک پارک میں آگیا۔ یہاں ایک بڑی نہر بہہ رہی تھی۔ نہر کی دونوں جانب سائپرس اور یورپی یوکلپٹس کے درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ خدا جانے یہ کوئی نہر تھی یا دریا تھا۔ میں نے کنارے پر جاکر جھک کر دیکھا۔ پانی سبزی مائل تھا۔ یہ سمندر کا پانی تھا۔ وینس واقعی پانی کا شہر تھا۔ کسی نہ کسی سڑک کے آخر میں کوئی نہ کوئی ندی بہتی نظر آجاتی ہے۔ کنارے پر بنچ پڑے تھے۔ میں ایک خالی بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ ایک عورت بچوں والی گاڑی چلاتی آئی۔ گاڑی یعنی پرام میں ایک گول مٹول سا بچہ گرم کمبل میں دھنسا ہوا لیٹا تھا۔ عورت میرے قریب سے گذر گئی۔ میں نے بچے کی طرف دیکھ کر مسخروں کی طرح منہ چڑایا۔ بچہ ہنس پڑا۔ عورت نے مجھے نہ دیکھا۔ پارک میں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ درختوں کے پیچھے ایک گرجے کی عمارت نظر آرہی تھی۔ اس کے مخروطی مینار کے اوپر ایک صلیب دھوپ میں چمک رہی تھی۔

مجھے رومن کلیسا کی قدیم تاریخ کا خیال آگیا۔ قدیم دور میں روم یعنی روما کو یورپ کا دل کہا جاتا تھا۔ اس شہر کے آس پاس پہاڑیوں میں وحشی قوم کے قبائل آباد تھے۔ یہ قبائل اکثر روم پر حملہ آور ہوتے۔ کبھی ایک قبیلے کا روم پر قبضہ ہوجاتا۔ کبھی دوسرا قبیلہ اسے شکست دے کر خود قبضہ کر کے بیٹھ جاتا۔ لیکن روم کی اصل تاریخ ایک سو سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے جب سیزر

نے روم پر قبضہ کر کے رومن ایمپائر کی بنیاد رکھی۔ ان دنوں رومن قوم نے یورپ اور مغربی ایشیا کے بیشتر شہروں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ شمالی افریقہ کے بھی کئی ملک روم کے زیر نگیں آ گئے تھے۔ رومن ایمپائر کے شہنشاہ سیزر کہلاتے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں سیزر تھیوڈوشیس کے عہد میں رومن سلطنت مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس تقسیم کی وجہ سے رومن سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ مشرقی رومن سلطنت ایک مدت تک قائم رہی۔ اس سلطنت کے حکمران کانسٹنٹائن نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اس دور میں کلیسا ایک بہت بڑی طاقت بن گیا۔ شہنشاہ اور کلیسائی طاقت ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے۔ آخر ایک معاہدے کی رو سے بادشاہ اور کلیسا اپنی اپنی جگہ پر آزاد ہو گئے۔ یہاں سے پوپ کی خود مختاری کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں گلیلیو ایسے نامور سائنس دان پر مذہبی عدالت میں مقدمہ چلا۔ آزاد خیال رومن فلاسفر اور ہیئت دان برونو کو زندہ جلا دیا گیا۔ اسی زمانے میں مارکو پولو کو جنیوا کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانا پڑیں۔

جنیوا کی جیل میں ہی مارکو پولو نے اپنا شہرہ آفاق سفرنامہ لکھا جس نے مشرق بعید کے ملکوں کی تجارتی راہیں کھول دیں اور یورپ کے مفلس ممالک دنیا کے امیر ترین ملک بن بیٹھے ہیں۔ ایک فٹ بال زور سے آ کر میرے بنچ سے ٹکرایا۔ اور میں رومن تاریخ کے ہزاروں سال پرانے دور سے نکل کر واپس بیسویں صدی کے وینس شہر میں آ گیا۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور فٹ بال اٹھا کر بھاگ گیا۔ کافی دیر میں پارک میں سمندر کی سبز نہر کے کنارے بنچ پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا کبھی گلنار کی پراسرار شخصیت کے بارے میں سوچتا اور

کبھی لاہور کے بھاٹی دروازے 'موچی دروازے اور انار کلی کی رعنائیوں کو یاد کرتا رہا۔ جب بھوک محسوس ہونے لگی تو اٹھ کر نہر کے پل پر سے گذرتا ہوا دوسری طرف ایک چھوٹے سے پر شور اور گندے مندے ریستوران میں آکر کھانا کھایا۔ کھانا کیا تھا' بس ایک بڑا سا بند تھا جس کے اندر گوشت کا ایک قتلہ' دہی' سلاد' اور کالی مرچ کا مسالہ' ڈالا ہوا تھا۔ ویسے اطالوی کھانے خواہ بند برگر ہی ہوں' بڑے مزے دار ہوتے ہیں۔ وینس میں خاص طور پر لوگ گرم مسالوں کا استعمال بڑے شوق سے کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ شروع شروع میں وینس کے جہاز ران ہی اپنے بادبانی جہاز لے کر بحیرہ روم اور بحر ہند اور بحر اوقیانوس کے سمندروں کو چیرتے ہوئے چین' انڈیا اور کارومنڈل کے ساحلوں پر پہنچے تھے۔ شام ہو چلی تھی اور وینس شہر روشن ہو رہا تھا کہ میں سلیمان کے فلیٹ پہنچا۔ سلیمان واپس آچکا تھا۔ چھوٹے سے کابک ایسے کمرے میں مچھلی اور مرچوں کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اندر داخل ہوتے ہی چھینکیں آنے لگیں۔ سلیمان نے میری طرف ہاتھ ہلا کر کہا:

"ابھی تھوڑی دیر باہر ہی رہو۔"

میں فلیٹ کے سامنے کاریڈور میں سیڑھیوں کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک موٹی اطالوی عورت سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور میرے قریب سے ہو کر اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب وہ میرے قریب سے گذری تو مجھے ایسے لگا جیسے ساہیوال کی کوئی پلی ہوئی بھینس گذر گئی ہو۔

رات کو میرا پروگرام وینس کی نہروں والی گلیوں میں جانے کا تھا۔

سلیمان نے پیشکش کی کہ وہ مجھے اپنی ٹیکسی پر ریالٹو جزیرے کی گھاٹ تک چھوڑ دے گا۔ اسے آگے شہر کی جنوبی علاقے کی طرف جانا تھا جہاں ساری رات کسینو اور ننگے ڈانس والے کلب کھلے رہتے تھے۔ میں نے کہا:

"ٹھیک ہے سلیمان بھائی! تم مجھے ریالٹو جزیرے کی پورٹ پر اتار دینا۔"

سلیمان کہنے لگا:

"تم زیادہ دیر اس علاقے میں نہ رہنا' وہاں رات کو بڑے جرائم ہوتے ہیں۔ تمہیں وینس کی سمندروں 'نہروں والی گلیوں کی سیر کا بہت شوق ہے تو کسی روز میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔"

میں نے اسے نہ بتایا کہ میں اس سے پہلے بھی اس علاقے کی آوارہ گردی کر چکا ہوں۔ رات کو میں نے اور سلیمان نے فلیٹ میں ہی تلی ہوئی مچھلی' اطالوی روٹیوں کے ساتھ کھائی۔ وہ ساتھ ساتھ مارٹینی وائن کے گلاس بھی چڑھاتا رہا۔ میں نے مارٹینی کا صرف ایک گلاس پیا۔ کیونکہ میرا پروگرام ریالٹو جزیرے کے کسی ریستوران میں بھی بیٹھ کر مارٹینی سے شغل کرنے کا تھا۔

سلیمان نے مچھلی کھاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور پوچھا:

"تم اتنے دنوں سے وینس میں ہو، تم نے یہاں ننگے ڈانس بھی دیکھے ہیں کہ نہیں؟"

میں نے جھوٹ بولا اور کہا:

"نہیں۔ میں اس قسم کے ڈانس دیکھنے یہاں نہیں آیا سلیمان بھائی۔ میرا مقصد اس شہر کی سیر و سیاحت اور اس تاریخی ملک کی عظمت رفتہ کا مطالعہ کرنا ہے۔"

"واہ واہ!" سلیمان مذاق کے موڈ میں ہنس پڑا۔

اس نے کھانا کھانے کے بعد اپنی جینز سے رگڑ کر ہاتھ پونچھے۔ بہت ہی سستا قسم کا اطالوی سگریٹ سلگا کر لمبا کش لیا اور مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ اس کی ٹیکسی عمارت کے صدر دروازے کی ایک جانب کھڑی تھی۔ اطالوی لڑکے اس کے بند شیشوں پر انگلیوں سے کچھ لکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلیمان نے انہیں جھڑک کر ایک طرف ہٹایا۔ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ مجھے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا:

"آجاؤ۔"

سینٹ پال کے علاقے سے ریالٹو کافی دور تھا۔ سلیمان کہہ رہا تھا:

"اگر مجھے آج رات عریاں کلبوں اور کسینو کی طرف گشت کرنے نہ جانا ہوتا تو میں تمہیں اتنی دور نہیں لا سکتا تھا۔ آج میں جلدی نکل آیا ہوں۔ ایک بجے رات تک واپس فلیٹ پر آجاؤں گا۔ تم کس وقت آؤ گے؟ کیا تمہیں معلوم ہے یہاں سے سینٹ پال کے لئے کون سے نمبر کی بس ملتی

ہے؟"

پھر اس نے مجھے ساری بسوں کے روٹ سمجھائے اور کہا:

"زیادہ دیر اس علاقے میں نہ ٹھہرنا۔ نہیں تو لٹ جاؤ گے اور کوئی پتہ نہیں کوئی پیچھے سے آکر تمہیں چاقو گھونپ دے اور بعد میں تمہاری تلاشی لے کر بھاگ جائے۔"

سلیمان تیزی سے گاڑی آگے نکال کر چل دیا۔ ریالٹو جزیرے کی چھوٹی سی پورٹ روشنیوں میں جگمگا رہی تھی۔ سمندر کے پانیوں میں وینس کی آبی گلیوں والی عمارتوں کی روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہر طرف چراغاں ہو رہا ہے۔ پورٹ پر گنڈولے مسافروں کو لے کر آجا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر غیر ملکی سیاح تھے۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ سردی کافی تھی۔ میں نے اونی ٹوپی سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ جسم پر گرم جیکٹ تھی۔ ٹورسٹ تھیلا میں فلیٹ پر ہی چھوڑ آیا تھا۔ بٹوہ جس میں میرا پاسپورٹ تھا' وہ بھی میں نے فلیٹ پر ہی تھیلے میں رکھا ہوا تھا۔ میری جیب میں کوئی ساٹھ کے قریب لیرے تھے یعنی اطالوی کرنسی تھی۔ ایک سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس تھی اور ایک چھوٹا سا چاقو تھا جو میں نے سیب کاٹنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔

ایک گنڈولا یعنی کشتی جیٹی کے ساتھ آکر رکی۔ اس میں سے سارے مسافر اتر گئے۔ دو اطالوی مزدور ٹائپ کے آدمی نشے میں تھے اور جھومتے جھامتے کوئی اطالوی گانا ڈویٹ کی شکل میں گاتے کشتی سے اترے اور ایک طرف چل دیئے۔ میں بھی دوسرے سیاحوں کے ساتھ اس کشتی میں سوار ہو گیا۔

کشتی کا ملاح سانولے چہرے والا کوئی مراکشی تھا۔ اس نے سر پر پھولدار سرخ رومال باندھا ہوا تھا اور اس نے کانوں میں بحری قزاقوں والی سنہری بالیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ کشتی کی پچھلی سائیڈ پر کھڑا دونوں ہاتھوں سے ایک ہی چپو کو کبھی بائیں اور کبھی دائیں چلا رہا تھا۔ کشتی ایک چھوٹے سے سمندری ٹاپو سے گذر کر وینس کی آبی یعنی نہروں والی گلیوں میں داخل ہوگئی۔ یہاں کشتیاں بڑی آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ سیاح فلیش گن چلا چلا کر آس پاس کی تاریخی حویلیوں اور مکانوں کی تصویریں بنانے لگے۔ راستے میں ایک فٹ پاتھ کا ریستوران بھی آیا۔ کئی سیاح یہاں ڈرنک وغیرہ کرنے اور سنیکس کھانے کے لئے اتر گئے۔ میں کشتی میں ہی بیٹھا رہا۔ شروع میں میرا ارادہ بھی تھا کہ میں کسی آبی گلی کے ریستوران میں بیٹھ کر مارٹینی سے لطف اندوز ہوں گا مگر وینس کی نہروں والی پراسرار نیم روشن گلیوں میں سے گذرتے ہوئے میرا موڈ بالکل بدل گیا۔ اب میرا دل چاہتا تھا کہ راستے میں کوئی کافی شاپ آئے تو وہاں بیٹھ کر کافی پیئوں۔ کشتی دیر تک آبی گلیوں میں بہتی رہی۔ کبھی ایک موڑ گھوم جاتی۔ کبھی دوسرا موڑ گھوم کر تیسری گلی کی سنگ مرمر کی نیم روشن حویلیوں کے درمیان آجاتی۔ اب اب ایسا ہوا کہ ایک ایک کر کے کشتی کے سارے سیاح راستے کے ریستورانوں اور بعض تاریخی مقامات پر اتر گئے۔ میں اکیلا کشتی میں بیٹھا رہ گیا۔ ملاح نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں واپس جاؤں گا؟ میں نے کہا:

"مجھے برج آف سائیز لے چلو میں اس انتظار میں تھا کہ کشتی خالی ہو تو ادھر جاؤں۔"

ملاح نے میرے ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کی تھی۔ میں نے

بھی اس کو شکستہ انگریزی میں ہی جواب دیا تھا۔ ملاح آہستہ آہستہ چپو چلا رہا تھا۔ کشتی غیر محسوس انداز میں گلیوں کے سمندری پانی پر تیر رہی تھی۔ ملاح نے برج آف سائیز یعنی آہوں والے پل کے بارے میں سنا تو کہنے لگا:

"وہ پل آسیبی ہے۔ تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا:

"میں نے سن رکھا ہے کہ وہاں آدھی رات کو کسی عورت کی آہیں بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ عورت کون ہے۔"

ملاح نے مجھے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا۔ اس کے منہ میں بجھا ہوا سگار تھا۔ کہنے لگا:

"کیا تم کوئی جادوگر ہو؟"

میں نے کہا:

"نہیں۔ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ میں ٹورسٹ ہوں۔"

ملاح بولا:

"پھر اس پل کی طرف مت جاؤ۔ ادھر رات کے وقت کوئی ٹورسٹ نہیں جاتا۔"

میں نے کہا:

"تم مجھے وہاں لے چلو۔ میں تمہیں دس لیرے دوں گا۔"

ملاح نے سگار منہ سے نکال کر اپنی رنگین جیکٹ کی جیب میں ڈالا اور بولا:

"میں ایک شرط پر لے جاسکتا ہوں کہ تمہیں وہاں چھوڑ کر فورا

واپس آجاؤں گا۔ اگر تمہیں یہ شرط منظور ہے تو میں تیار ہوں۔"

میں نے کہا کہ مجھے اس کی شرط منظور ہے۔ اس نے چپو بائیں ہاتھ میں لے کر پانی میں ڈال کر پیچھے کو چلایا اور کشتی کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔ وہ مختلف آبی گلیوں میں سے کشتی کو نکالتا ہوا ایک ایسی گلی میں آگیا جو دوسری گلیوں کی نسبت تنگ تھی۔ اس گلی میں اکثر مکان خالی تھے اور ان کے تاریک دالان سنسان تھے۔ سمندر کا پانی مکانوں کی دیواروں کے درمیان بالکل ساکن تھا۔ دو جگہوں پر بجلی کے ٹیوب روشن تھے۔ میں نے اس گلی کو پہچان لیا۔ میں نے سامنے کی طرف دیکھا جہاں دوسری ٹیوب لائیٹ لگی تھی، اس سے کوئی دو بلاک چھوڑ کر اندھیرے میں مجھے آہوں کا پل نظر آگیا جو دو مکانوں کے درمیان ایک محراب کی طرح تنا ہوا تھا۔ میں دن کے وقت اس پل کے نیچے سے ایک بار گذرا تھا۔

ملاح نے کشتی ایک خالی مکان کے سنسان دالان کی پتھریلی سیڑھیوں کے پاس روک دی اور بولا:

"بس میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔"

میں نے کہا:

"میں تیر کر پل تک نہیں جاسکتا۔ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ تم کم از کم مجھے پل کے قریب تو لے چلو۔ کیا تم نے دس لیرے نہیں لینے؟"

ملاح اپنی زبان میں بڑبڑاتا ہوا چپو چلانے لگا۔ آہوں والے پل سے تھوڑے فاصلے پر پیچھے ایک اور ویران حویلی تھی۔

ملاح نے اس حویلی کے دالان کی سیڑھیوں کے ساتھ کشتی لگادی اور کہا:

"بس اس سے آگے میں کسی صورت میں نہیں جاسکتا۔ اب تم جانو تمہارا کام۔"

میں نے اسے جیب سے دس لیرے نکال کر دیئے۔ ملاح کی شکل بتارہی تھی کہ وہ کافی ڈرا ہوا ہے۔ اس نے لیرے لے کر جیب میں ٹھونسے۔ بڑی تیزی سے کشتی کو پیچھے گھمایا اور تیز تیز چپو چلاتا گلی کا موڑ گھوم گیا۔

اب میں نے پل کی طرف دیکھا۔ پل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک بار تو مجھے بھی کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا۔ لیکن یہ خیال مجھے حوصلہ دے رہا تھا کہ وہاں کوئی چڑیل وغیرہ نہیں ہے بلکہ ایک عورت کی آہیں بھرنے کی آواز آتی ہے۔ میرا تجسّس تھا جو مجھے وہاں تک لے آیا تھا اور آگے لے جارہا تھا۔ پل حویلی کے دالان سے بمشکل کوئی دس قدم پر ہو گا۔ گلی میں اگر فرش ہوتا تو میں دس قدم چل کر پل تک پہنچ جاتا۔ مگر گلی میں ایڈریاٹک سمندر کا پانی بہہ رہا تھا۔ جس خالی خالی حویلی کے دالان کی سیڑھیوں میں میں کھڑا تھا' وہاں بھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس حویلی کے اندر ہی سے کوئی راہ داری یا راستہ پل تک جاتا ہو۔

گلی کی دوسری جانب کسی اونچی حویلی کی قلعہ نما دیوار تھی۔ کسی مکان کی کھڑکی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ میں نے اللہ کو یاد کیا اور دالان میں سے گذرتا ہوا حویلی کے بڑے دروازے پر آگیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے مرطوب ہوا آرہی تھی۔ میں نے بھی جھانک کر اندر دیکھا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

میں نے جیب سے ماچس نکال کر تیلی روشن کی۔

ماچس کی روشنی میں مجھے ایک طرف تنگ سا زینہ اوپر جاتا نظر آگیا۔

ضرور یہ زینہ آہوں والے پل کو جاتا ہو گا۔ تیلی بجھ گئی۔ میں نے زینہ دیکھ لیا تھا۔ اندازے سے اس کی طرف بڑھا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ میری بیوقوفی ہی آپ سمجھ لیں، مگر جوانی میں انسان کو اس قسم کی بیوقوفیاں ضرور کرنی چاہئیں۔ دوسروں کا تو مجھے پتہ نہیں۔ لیکن میں نے ایسی بہت سی بے وقوفیاں کی ہیں اور کبھی کبھی آج بھی کرتا ہوں۔ اس سے مجھے نقصان کم پہنچا ہے مگر علم بہت حاصل ہوا ہے۔ کئی سربستہ راز افشا ہوئے ہیں۔ میں آہوں والے پل کا سربستہ راز بھی کھولنا چاہتا تھا۔

زینے میں بڑا اندھیرا تھا۔ میں ماچس جلا جلا کر اس کی روشنی میں زینہ چڑھ رہا تھا۔ زینہ ایک طرف گھوم گیا۔ پھر چکر کھا کر سیدھا ہو گیا۔ آگے ایک دروازہ آگیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر دیکھا۔ دروازے پر کوئی تالا نہیں تھا۔ میں نے اسے ذرا سا دبا کر اندر کو دھکیلا۔ دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر سے جو ہوا آئی، اس میں خشک کافور کی بو تھی۔ میں پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ مجھے خوف محسوس ہوا۔ اندر واقعی کوئی چڑیل ہی نہ رہتی ہو۔ ایک بات کی وضاحت یہاں میں ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ مجھے بچپن ہی سے چڑیلوں کو دیکھنے کا شوق رہا ہے۔ ٹھیک ہے مجھے ان سے ڈر ضرور لگتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میری آرزو ہوتی تھی کہ کبھی کوئی چڑیل مجھے نظر آئے اور میں اسے دیکھوں۔ اس کی آواز سنوں۔ اس خواہش نے میرے اندر چڑیل کا آدھا خوف ختم کر دیا تھا۔ اس وقت بھی مجھے ڈر ضرور لگ رہا تھا لیکن دل میں شوق اور تجسّس بھی تھا کہ اگر واقعی اندر کوئی چڑیل ہے تو میں اسے دیکھوں کہ وہ کیسی ہے۔ میں نے بچپن میں یہ بھی سنا تھا کہ چڑیل کبھی پری اور کبھی نہائیت حسین عورت

کے روپ میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر چڑیل کسی حسین عورت کے روپ میں سامنے آئی تو میں اس سے التجا کروں گا کہ اب اسی روپ میں رہنا۔

چنانچہ تھوڑی دیر تک میں زینے کی دیوار کے ساتھ خاموش کھڑا رہا۔ پھر اللہ کا نام لے کر دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ میں دروازے کے پاس ہی ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا اور آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی تک مجھے کسی عورت کے آہیں بھرنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

ایک سناٹا سا فضا پر طاری تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر رکھا تھا کہ آہوں کے پل کا راز معلوم کر کے رہوں گا۔ میں ہمت کر کے دیوار کا سہارا لئے قدم قدم بڑھانے لگا۔ میں دیوار کو ہاتھ سے ٹٹولتا ہوا جا رہا تھا۔ کیونکہ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد میرا ہاتھ کسی ستون سے جا کر لگا۔ میں ستون پر ہاتھ اوپر تک لے گیا۔ یہ ستون دیوار کے ساتھ ساتھ شاید چھت تک چلا گیا تھا۔ میں نے ایک پاؤں آگے بڑھا کر فرش کو ٹٹولا کہ آگے کیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ آگے بھی کوئی زینہ ہے جو نیچے جاتا ہے۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں، مجھے واپس چلے جانا چاہئے۔ لیکن منزل کے قریب آکر میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر زینہ اترنے لگا۔ یہ زینہ تنگ تھا اور ذرا نیچے جا کر گھوم گیا۔ جیسے ہی میں زینے کا موڑ گھوما۔ مجھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی نیچے سے آرہی تھی۔

ساتھ ہی مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں وہیں دم

سادھے کھڑا ہو گیا۔ ایسے جیسے کوئی فرش پر چل رہا ہے۔ پھر یہ آواز دور ہو کر غائب ہو گئی۔ میں ہمت کر کے زینے کی آخری سیڑھی تک آ گیا۔ آگے پھر ایک دروازہ تھا۔ دروازے کے اوپر ایک محرابی روشن دان تھا۔ روشنی اس روشن دان میں سے آ رہی تھی۔ یہ بجلی کی روشنی لگ رہی تھی۔ میں نے دروازے میں دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں کوئی سوراخ وغیرہ نہ ملا۔ روشندان کافی اونچا تھا۔ مشک کافور کی بو میں اب عجیب و غریب پرفیوم کی خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں نے دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔ دوسری طرف جیسے کوئی فرش پر چل پھر رہا ہو۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر اس حویلی میں کوئی شریف آدمی رہتا ہے تو وہ تو مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے گا کہ میں چوری کی نیت سے اس کی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی دروازے کے قریب سے گذرا ہو۔ میں نے کان اس آواز پر لگا دیئے۔ قدموں کی آواز غائب ہو گئی۔ پھر مجھے وہ آواز سنائی دی جس کی جستجو مجھے وہاں کھینچ کر لے آئی تھی۔ یہ کسی عورت کے آہیں بھرنے کی آواز تھی ایک بار تو میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آواز دروازے کے بالکل قریب سے آ رہی تھی۔

چند سیکنڈ کے بعد یہ آواز بھی ختم ہو گئی۔

میں اس آواز کا معمہ حل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے قدرتی خوف پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور دروازے کو ذرا سا دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ دوسری طرف جھانک کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے ایک کشادہ کمرہ تھا۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ دیواروں پر سرخ رنگ کے بوسیدہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ سنگ مرمر کے دو ستونوں کے درمیان ایک دیوان بچھا تھا۔ کمرہ خالی

تھا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ فضا میں بڑی پر اسرار خوابوں ایسی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میں خالی دیوان تک جاؤں۔ اتنے میں ستونوں کے عقب میں سرخ پردہ ایک طرف کو ہٹا اور میں نے ایک سرخ اور سفید عورت کو دیکھا جس نے قدیم رومن طرز کا سرخ لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اسکا ایک کندھا ننگا تھا۔ سر پر رومن شہزادیوں کی طرح سفید پھولوں کی ڈالی کا تاج پہن رکھا تھا۔ چھت کے ساتھ موم بتیوں والا فانوس روشن تھا۔ اس کی روشنی میں عورت کے سنہری بال طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بال آبشار کی طرح اس کے عریاں شانے پر گر رہے تھے۔

مجھے یقین سا ہونے لگا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ یا پھر حقیقت کی دنیا سے نکل کر خواب کی دنیا میں آگیا ہوں۔ وہ عورت جو رومن شہزادی لگ رہی تھی، ابھی تک ستونوں کے پاس کھڑی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر انگریزی میں کہا:

"سوری! میں غلطی سے یہاں آگیا ہوں۔ دراصل میں ٹورسٹ ہوں، اس پرانی حویلی کی سیر کرنا چاہتا تھا۔"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی دیوان پر آکر بیٹھ گئی۔ میں ابھی تک دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے پاس آگیا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ عورت واقعی کوئی رومن شہزادی لگ رہی تھی جو ہزار سال پرانی تاریخ کے ایوانوں میں سے نکل کر بیسویں صدی میں آگئی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مجھے حوصلہ ہوا کہ یہ چڑیل نہیں ہے اور اگر چڑیل بھی ہے تو میں اس

سے التجا کروں گا کہ وہ اسی رومن شہزادی والے روپ میں ہی رہے۔

دیوان کے پاس ہی ایک پرانی طرز کی کرسی پڑی تھی۔ عورت نے خواب آلود آواز میں انگریزی میں ہی کہا:

"بیٹھ جاؤ۔"

میں رومن طرز کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر تیر کمان، نیزے اور پرانا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ یہ کسی ساتویں، آٹھویں صدی عیسوی کے قلعے کا دیوان خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا:

"کیا تم اس حویلی میں رہتی ہو؟ تم نے رومن کاسٹیوم کیوں پہن رکھا ہے؟"

عورت کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک باوقار سنجیدگی اور جلال سا چہرے پر آ گیا۔ اس نے چہرہ ذرا سا اوپر اٹھا کر کہا:

"میں روم کے چوتھے سیزر اوگتایاس شہنشاہ روم کی بیٹی شہزادی ماریانہ ہوں۔ یہ میرا محل ہے۔ میں ہر مہینے اماوس کی رات کو یہاں آتی ہوں۔"

تب مجھے یاد آ گیا کہ آہوں کے پل کے بارے میں ایک ملاح نے مجھے بتایا تھا کہ اماوس کی رات کو جب آسمان پر چاند نظر نہیں آتا اور گہری تاریکی ہوتی ہے تو اس پل کی جالیوں میں سے کسی آسیب کی آہیں بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اماوس کی رات کے سوا یہ آواز کبھی سنائی نہیں دیتی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی آسیبی عورت ہے۔ مگر کمرے میں ماحول روشن تھا اور عورت پورے شاہانہ لباس کے ساتھ دیوان پر نیم دراز تھی۔ وہاں خوف کا شائبہ تک

نہیں تھا۔ لیکن میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ عورت کون ہے اور قدیم رومن طرز کا ماحول بنا کر یہاں کیا کر رہی ہے۔ آخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا:

"ماریانہ! میں بیسویں صدی کا رہنے والا ہوں' اور یہ صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کے عروج کی صدی ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تم آج سے ایک ہزار برس پہلے کے کسی رومن بادشاہ بیٹی ہو اور اب تک زندہ ہو؟"

ماریانہ کے چہرے پر کچھ اداسی سی چھا گئی۔ جیسے ایک سایہ سا گذر گیا ہو۔ ایک لمحے کے لئے وہ قالین پر نظریں جمائے کچھ دیکھتی رہی۔ پھر میری طرف دیکھے بغیر بولی:

"میں جانتی ہوں تم ضرور مجھے کوئی چڑیل یا بدروح سمجھ رہے ہو گے۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ میں بھی تمہاری طرح زندہ ہوں اور انسان ہوں۔"

میں نے کہا: "لیکن کوئی انسان ایک ہزار برس تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا تو خیال ہے کہ تم وینس کی کوئی ایکٹرس ہو اور تمہیں قدیم زمانے کا لباس پہننے کا شوق ہے۔"

ماریانہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ گہری آواز میں بولی:

"ایک ہزار سال میں تم پہلے شخص ہو جو کسی خوف اور دہشت کے بغیر یہاں تک آئے ہو' تم سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر وہ میری آہوں کی آواز اور قدموں کی آہٹیں سن کر خوف کے مارے بھاگ گئے یا بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑے۔ تم نے یہاں آکر ثابت

کر دیا ہے کہ تم ہی وہ بہادر آدمی ہو جس کو میرے ہم راز ہونے کا حق حاصل ہے۔"

میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہ عورت وینس ٹی وی یا کسی سٹیج کی اداکارہ ہے اور رومن ایمپائر کے ماضی کا بھوت اس پر سوار ہو گیا ہوا ہے اور اب یہ رات کو رومن شہزادیوں والا لباس پہن کر اپنا شوق پورا کرتی ہے۔ میں بغیر کسی ڈر خوف سے اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ میں نے سوچا معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کونسا راز مجھے بتانا چاہتی ہے۔ جب میں نے اس کے خاص راز کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگی:

"میں دو ہزار سال سے ہر تاریک رات کو یہاں آتی ہوں، مجھے کسی ایسے انسان کی تلاش ہوتی تھی کہ جس کو میں بتا سکوں کہ قدیم رومن سلطنت کا جاہ و جلال کیسا تھا۔ اسے یہ بتا سکوں کہ رومن شہنشاہ صرف ظالم حکمران ہی نہیں تھے، وہ فلسفی، آرٹسٹ اور شاعر بھی تھے۔ رومن ایمپائر نے اگر ایک ظالم بادشاہ نیرو پیدا کیا تو مارکس اور یلیٹس بھی رومن سلطنت کا بادشاہ ہی تھا جس کی دانش مندی، علم دوستی اور رعایا پروری مثالی حیثیت رکھتی تھی۔"

وہ چپ ہو گئی۔ پھر اس نے ایک گہری آہ بھری اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی:

"میری آہیں روم کے عالی شان ماضی کا نوحہ ہیں۔ تم اس ملک کے رہنے والے نہیں ہو، تم ایک رومن شہزادی کے کتھارسز کو کبھی سمجھ نہیں سکتے۔ روم کے ہر شہنشاہ، ہر سیزر نے عظیم سلطنت روما کا خواب دیکھا اور روم کی سلطنت کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا۔ مگر افسوس اس عظیم سلطنت کی عمارت چند سالوں کے بعد ہی زمین بوس ہو گئی۔

میں نے کہا: "اس میں کوئی شک نہیں کہ روم کی عظیم سلطنت نے دنیا کو ایک کوڈ آف لا دیا مگر اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ جو کچھ بھی تھا' رومن سلطنت کا جاہ و جلال مفتوحہ علاقوں کے خراج کا مرہون منت تھا۔ جیسے جیسے مقبوضہ علاقے آزاد ہوتے گئے' رومن سلطنت کے محل مسمار ہوتے چلے گئے۔ اور ایک وقت آیا کہ رومن سلطنت رومانام کا ایک چھوٹا سا شہر بن کر رہ گئی۔"

ماریانہ کی آنکھوں میں عجیب چمک آگئی۔ اس نے ساکت نگاہوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر دیوان پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تم پر اپنا راز فاش کرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دیوان کے عقب میں جو سرخ بوسیدہ بھاری پردہ گرا ہوا تھا' وہ آہستہ آہستہ چلتی اسی طرف گئی۔ ایک ہاتھ سے پردہ ہٹایا اور آگے بڑھی۔ پردے کے پیچھے بھی ایک چھوٹا سا زینہ تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے زینہ اترنے لگا۔ یہ سب کچھ مجھے ایک ڈرامہ سا لگ رہا تھا۔ یہ زینہ ایک چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا تھا۔ چھت کے ساتھ موم بتیوں والا فانوس روشن تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ فرش سنگ مرمر کا تھا۔ سامنے دیوار پر کسی باغ کا منظر روغنی رنگوں میں پینٹ کیا ہوا تھا۔ یہ باغ پرانا تھا جس میں ایک طرف کسی قلعے کا دروازہ تھا۔ قلعے کے دروازے کے آگے خندق پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا۔ باغ میں سائپرس کے درخت ساکن کھڑے تھے۔ ماریانہ دیوار پر بنی ہوئی اس تصویر کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس نے میری طرف گردن پھیر کر دیکھا اور بولی:

"تمہیں اپنے ماڈرن زمانے کی سائنس اور ٹیکنالوجی پر بڑا فخر ہے مگر

راز میں تم پر افشا کرنے والی ہوں، وہ تمہیں اور تمہاری سائنس کو بھی حیران کردے گا۔ میرا ہاتھ پکڑو۔"

میں دل میں کچھ گھبرلما گیا کہ جانے یہ عورت کیا کرنے لگی ہے۔ میں ذرا ہچکچایا تو اس نے خود میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

"گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں کسی ایسے رومن ایریا میں نہیں لے جارہی جہاں انسانوں کو بھوکے شیروں کے آگے ڈالا جاتا تھا۔"

میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے پوچھا:

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔"

ماریانہ مسکرائی۔

"تم سمجھ بھی نہیں سکتے۔ میں تمہیں اپنے شاہی محل میں لئے جارہی ہوں۔ یہ قلعہ دیکھ رہے ہو؟ یہ تصویر میں بنا ہوا قلعہ ہے، تصویر میں بنا ہوا باغ ہے، دونوں بے جان ہیں مگر ابھی اس میں جان پڑ جائے گی۔ میرے ساتھ اس باغ میں آجاؤ۔"

اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی پاگل عورت ہے جو وینس کے کسی نفسیاتی امراض کے ہسپتال سے فرار ہو کر اس حویلی میں آکر بیٹھ گئی ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ماریانہ نے میرا ہاتھ کھینچا اور دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ میں ایک باغ میں ہوں۔ یہ وہی باغ تھا جو ایک سیکنڈ پہلے میں نے دیوار پر تصویر کی شکل میں بنا ہوا دیکھا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یا اللہ! یہ کیا معمہ ہے؟ میں اس باغ میں کیسے آگیا؟ باغ میں کیسے جان پڑ گئی؟ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے تصور سے میرے دل پر رقت طاری ہو گئی۔ میرے مالک! تو مالک ارض و سما ہے۔ تو قادر مطلق ہے، یہ جو کچھ بھی ہوا ہے،

تیرے حکم اور تیرے اشارے سے ہوا ہے، تو اگر چاہے تو تن مردہ میں جان پڑ جائے، تو عظیم ہے! تو قادر مطلق ہے!.....

میں نے باغ کا جائزہ لیا۔ باغ میں شام کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا میں سائپرس کے درختوں کی شاخیں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ میں نے قلعے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ایک سیکنڈ پہلے جس قلعے کا دروازہ بند تھا، اب وہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ قلعے کے اندر سے دو گھڑ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے نکلے۔ لکڑی کے پل پر ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ پل عبور کر کے وہ باغ کے دوسری طرف سڑک پر درختوں میں غائب ہو گئے۔ ماریانہ نے ابھی تک میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی طمانیت اور سکون تھا جیسے وہ اپنے گھر میں آگئی ہو۔ کہنے لگی:

"جانتے ہو تم کس زمانے میں ہو اور کہاں آگئے ہو؟"

مجھ پر ابھی تک حیرت طاری تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں ابھی تک تیز تیز تھیں۔ میں بول نہ سکا۔ صرف نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے قلعے کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"یہ میرے شہنشاہ باپ کا قلعہ ہے اور تم اپنے زمانے سے تقریباً دو ہزار برس پیچھے آگئے ہو۔"

اب جو میں نے اپنے لباس پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر مزید حیران رہ گیا کہ میرا لباس بھی قدیم رومن زمانے کے لباس میں بدل چکا تھا۔ میرے پاؤں میں فیتے دار چپل تھی۔ جسم پر صرف ایک ہی قرمزی رنگ کا ٹیونک یعنی لبادہ تھا۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میرے بال بھی رومن وضع کے لمبے لمبے ہو گئے

تھے۔ میں دہشت زدہ ہو گیا۔ یا اللہ! یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ یا اللہ! تو میری حفاظت فرما!

"آؤ میں تمہیں اپنی سہیلیوں سے ملاؤں۔"

ماریانہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باغ کے دوسرے قطعے میں لے آئی۔ یہاں سائپرس کے ساتھ سرو کے درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ چاندی ایسے پانی کا فوارہ اچھل رہا تھا۔ سنگ مرمر کی روشوں کے درمیان شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ درختوں کے نیچے جگہ جگہ سنگ مرمر کے بنچ پڑے تھے۔ ایک طرف سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر چھ سات رومن لڑکیاں قدیم ریشمی رومن لباس میں سرو کے درختوں کے درمیان سے دوڑتی ہوئی نکلیں اور ماریانہ کے پاس آکر رک گئیں اور مجھے حیرانی سے تکنے لگیں۔ ایک لڑکی نے اس زمانے کی رومن زبان میں ماریانہ سے کچھ پوچھا۔ ماریانہ نے میری طرف اشارہ کر کے انہیں کچھ کہا۔ وہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ باغ کی ایک روش کے قریب ایک ڈولی رکھی ہوئی تھی۔ چار حبشی غلام سر جھکائے ایک طرف کھڑے تھے۔ ڈولی کے چار بانس تھے جو باہر نکلے ہوئے تھے' ان پر چاندی کے پترے چڑھے ہوئے تھے۔

ڈولی کے اوپر ایک سنہری چھت پڑی تھی۔ ماریانہ نے مجھے ڈولی میں اپنے ساتھ بٹھالیا۔ اس کے ساتھ ہی غلاموں نے ڈولی کو کندھوں پر اٹھایا اور ایک خاص رفتار سے چلتے ہوئے باغ سے باہر نکل آئے۔ ماریانہ نے کہا:

"میں تمہیں اپنے زمانے میں ضرور لے آئی ہوں۔ تمہارا لباس اور حلیہ بھی قدیم رومنوں والا ہو گیا ہے مگر تمہاری زبان میں تبدیل نہیں کر سکی۔ تم رومن زبان جو یہاں بولی جاتی ہے' نہیں سمجھ سکو گے۔ اس لئے

خاموش رہنا۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے بھی تمہارا تعارف یہ کہہ کر کرایا تھا کہ تم قرطاجنہ میں جو میری سہیلی رہتی ہے' اس کے بھائی ہو اور تم بول نہیں سکتے۔ میں اپنے باپ سے بھی تمہارا اسی طرح تعارف کرادوں گی۔ تم بالکل نہ بولنا۔"

میں تو جیسے خواب کے عالم میں تھا۔ سب کچھ خواب لگ رہا تھا۔ ماریانہ کی سواری جب قلعے کے دروازے میں داخل ہوئی تو ڈیوڑھی میں سے چار گھڑ سوار آگے آگے ہو گئے۔ انہوں نے لمبی شہنائی بجا کر اعلان کیا کہ شہزادی کی سواری آرہی ہے۔ قلعے کے اندر ایک بازار تھا۔ شہنائی کی آواز سنتے ہی بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ دیکھتے دیکھتے بازار خالی ہو گیا۔ قدیم روم کے بازاروں میں سے گذرتی ہوئی ہماری سواری شاہی محل میں پہنچ گئی۔ شاہی محل کا ماحول وہی تھا جو میں نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھ رکھا تھا۔

ہر قدم پر مجھے احساس ہوتا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ حقیقت میں' میں دو ہزار سال پیچھے کے زمانے میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ماریانہ ہر قدم پر میرے ساتھ تھی۔ رات کو مجھے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ ایک عجیب بے چینی کی کیفیت تھی جو مجھ پر ہر لمحے طاری تھی۔ شاہی مہمان خانے کے شاہانہ بستر پر بھی مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں اس رنگین مگر غیر قدرتی خواب کے جال سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ یہ بات میرے اختیار میں نہیں رہی اور میں ماریانہ کی مرضی کے بغیر یہاں سے واپس بیسویں صدی کے وینس میں نہیں جا سکتا۔ میں بستر سے اٹھ کر گیلری میں آگیا۔ کسی مضبوط بیل کی شاخیں گیلری کی دیوار کے ساتھ اوپر تک چلی گئی تھیں۔ سامنے سڑک کے پار شاہی عمارات میں کہیں کہیں شمع دانوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

رات نہ جانے کتنی گذر چکی تھی۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

میں نے وہاں سے فرار کا فیصلہ کیا اور بیل کی موٹی شاخوں کو پکڑ کر نیچے اتر آیا۔ اب میں قلعے کے سنسان بازاروں میں پھرنے لگا۔ کسی جگہ سے پہرے دار کی آواز آتی تو میں کسی ستون یا مکان کی دیوار اوٹ میں چھپ جاتا۔ اسی طرح چلتے چلتے میں قلعے کے دروازے کے قریب آگیا۔ یہاں رومن سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ میں ایک طرف چھپ کر سوچنے لگا کہ یہاں سے کیسے باہر نکلا جائے۔ یہ لوگ مجھے پکڑ کر موت کے تہہ خانے میں پھینک دیں گے۔ میں رومن محلات کے خفیہ تہہ خانوں کا بہت حال پڑھ چکا تھا۔ ان تہہ خانوں میں جن قیدیوں کو ڈالا جاتا تھا' پھر ان کی لاش بھی باہر نہیں آتی تھی۔

مجھے پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی سڑک پر کسی چھکڑے کے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچرے سے بھرا ہوا ایک چھکڑا قلعے کے دروازے کی طرف جارہا تھا۔ جب یہ چھکڑا میرے قریب سے گذرا تو میں لپک کر اس پر سوار ہوا اور کچرے میں خود کو چھپا دیا۔ چھکڑا قلعے کی ڈیوڑھی میں رک گیا۔ میں نے سپاہیوں کی آوازیں سنیں۔ وہ رومن زبان میں کچھ بول رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ چھکڑے کی تلاشی لے رہے ہیں۔ ایک سپاہی نے کچرے میں نیزہ مارا تو وہ میرے قریب سے ہو کر نیچے اتر گیا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ سپاہی نے مجھے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اسی لمحے مجھے پکڑ لیا گیا۔ میں نے اردو میں' انگریزی میں' پنجابی میں چیخ چیخ کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میں پاکستان کا ٹورسٹ ہوں اور شاہی محل کی شہزادی ماریانہ مجھے وینس سے یہاں لے آئی ہے۔ مگر میری ایک بھی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے فصیل کے پاس لے گئے۔ ایک سپاہی نے مجھے ستون کے

ساتھ باندھ دیا۔ دوسرے نے نیزہ اٹھایا۔ اسے اپنے ہاتھ میں تولا اور پھر پوری طاقت سے میرے سینے میں گھونپ دیا۔ میرے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ اس کے بعد میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اسی پراسرار حویلی کے دالان میں اپنے ٹورسٹ لباس میں کھڑا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ آہوں والے پل پر کس راستے سے ہو کر جاؤں۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ میں جلدی سے واپس مڑا۔ ملاح جا چکا تھا۔ میں وہیں گلی کی نہر کے کنارے پراسرار حویلی کی سیڑھی میں بیٹھ گیا۔ نہر کا پانی پتھر کی سیڑھی سے ٹکرا کر ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر میں کوئی خواب ہی دیکھ رہا تھا تو مجھے اس بھیانک خواب سے نجات مل گئی۔

تھوڑی دیر گذری ہوگی کہ مجھے پانی میں شپ شپ کی آواز سنائی دی۔ میں نے جھک کر گلی کی نہر جہاں مڑتی تھی' اس طرف دیکھا ایک کشتی بڑے آرام آرام سے پانی پر بہتی چلی آ رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے ملاح کو آواز دی۔

اس نے کشتی کنارے کے ساتھ لگا دی۔ میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی میں صرف ایک سیاح اکٹھا ہو کر ایک طرف سو رہا تھا۔ شاید وہ نشے میں دھت تھا۔ کیونکہ وائن کی ایک خالی بوتل اس کے قریب ہی کشتی میں پڑی تھی۔ ملاح سے میں نے اطالوی میں کہا کہ مجھے پورٹ پر پہنچا دو۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کشتی پورٹ کی طرف ہی جا رہی تھی۔

دور سے ریالٹو پورٹ کی روشنیاں نظر آئیں تو میری جان میں جان

آئی۔ سوچنے لگا۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ میں پراسرار حویلی کے تاریک دالان میں کھڑے کھڑے کیسے خواب کی دنیا میں پہنچ گیا۔ شاید یہ اس وجہ سے تھا کہ میں ماورایت پسند ہوں اور مجھے پراسرار حویلیوں میں رہنے والی خوبصورت عورتوں اور شہزادیوں کی روحوں سے بڑی محبت ہے۔ میری اسی کمزوری یا جذباتیت نے مجھے یہ سب کچھ ایک پل میں دکھادیا تھا۔ جس وقت میں وینس شہر کے سب سے بڑے جزیرے ریالٹو کی گھاٹ سے باہر وینس کے بازاروں میں آیا تو اس وقت رات کے دو بج رہے تھے، مگر بازاروں میں رونق تھی۔ بازار سنسان نہیں تھے۔ اس وقت کوئی بس نہیں چل رہی تھی۔

مجبوراً مجھے ایک ٹیکسی لینی پڑی۔ مجھے یہ احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ میرے پیسے ختم ہو رہے ہیں اور اب مجھے کسی جگہ کوئی جاب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ میں ابھی وینس میں مزید کچھ روز ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میں نے آہوں والے پل کا معمہ حل کرنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا اور اب یہ ارادہ کیا تھا کہ وینس شہر کی نائٹ کلبوں کی آوارہ گردی کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان کلبوں میں رات کے وقت زندگی کس رنگ میں بسر ہوتی ہے۔

میں فلیٹ پر پہنچا تو سلیمان ابھی نہیں آیا تھا۔ میں صوفے میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ حویلی کی پراسرار رومن شہزادی ماریانہ کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے نیند آئی۔ صبح کوئی دس بجے ہوں گے کہ سلیمان نے مجھے جگادیا۔ وہ رات کسی عورت کو ساتھ لے آیا تھا جو اس کے بستر میں گھس کر ابھی تک سو رہی تھی۔ سلیمان نے اسے لات مار کر جگایا اور گالی دے کر کہا:

"چلو چلو۔ دفع ہو جاؤ۔"

عورت بڑبڑائی۔ آنکھیں ملتی بستر سے نکل آئی۔ سلیمان نے بٹوے میں سے کچھ لیرے نکال کر اسے دیئے۔ وہ چلی گئی تو سلیمان نے میری طرف جھک کر دیکھا۔ ہنس کر بولا:

"تم کب سے جاگ رہے ہو؟ رات کب آئے تھے؟ میں تو دو بجے کے بعد آیا تھا۔ تم سو رہے تھے۔"

میں نے یونہی ٹالنے کے لئے کہہ دیا: "بس جلدی ہی آگیا تھا۔"

سلیمان کے ساتھ ماریانہ رومن شہزادی والے خواب کے بارے میں بات کرنا بیکار تھا۔ میں نے اس کا بالکل ذکر نہ کیا۔ وہ ناشتہ تیار کر چکا تھا۔ ہم دونوں ناشتہ کرنے لگے۔ میں نے سلیمان سے کہا:

"دوست! میرے پیسے ختم ہو رہے ہیں۔ میں اس شہر میں ابھی کچھ عرصہ قیام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے کوئی چھوٹی موٹی جاب دلوا دو تو میرے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی آسانی ہو جائے گی۔"

سلیمان سگریٹ کا لمبا کش لگا کر بولا:

"ایک ترکیب میرے ذہن....."

اس نے سگریٹ کا کش کھینچ کر پورا دھواں حلق سے نہیں نکالا تھا۔ بات کرتے ہوئے وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں زور سے مسلتے ہوئے سگریٹ بنانے والوں کو اطالوی زبان میں گالی دی اور آنکھیں ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے بولا:

"میں تمہیں گیس سٹیشن پر کام دلوا سکتا ہوں مگر وہاں ڈاکے بہت

پڑتے ہیں۔ کسینو کے باہر گارڈ کی ڈیوٹی دے سکو گے؟ نہیں، نہیں۔ تم یہ کام نہیں کر سکو گے۔ اچھا تو پھر میں تمہیں ایک نائٹ کلب میں کام دلوا دیتا ہوں۔ اس کا بار مین میرا دوست ہے۔ آج اسی سے بات کرتا ہوں۔"

میں نائٹ کلب کا سن کر بڑا خوش ہوا۔ اگر نائٹ کلب میں مجھے کام مل جائے تو تنخواہ بھی ملے گی۔ اور نائٹ کلب کے مزے بھی اڑاؤں گا۔"

میں نے فوراً کہا:

"ہاں، نائٹ کلب کی جاب ٹھیک رہے گی۔"

سلیمان دیوار کے ساتھ لگے آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا، بولا:

"وہاں تمہیں ایک وقت کا کھانا مفت ملے گا اور ایک بوتل مارٹینی کی ساتھ ملا کرے گی۔ تین چار سو لیرے تنخواہ ہوگی مگر ڈیوٹی بڑی سخت ہے۔ ساری رات تمہیں وہاں گذارنی پڑے گی۔"

میں نے کہا: "مجھے منظور ہے۔"

"او کے۔ میں آج ہی اپنے دوست سے بات کرتا ہوں۔"

دوسرے روز شام کو سلیمان مجھے وینس کی ایک نائٹ کلب میں لے گیا۔ یہ سمندر سے ہٹ کر ایک گنجان محلے میں تھا۔ سلیمان مجھے کلب کے گلی والے دروازے سے اندر لے کر گیا۔ اس نے اپنے دوست رابرٹو سے ملایا۔ رابرٹو ایک مضبوط تن و توش کا آدمی تھا جس کی مونچھیں پھولی ہوئی تھیں اور گردن بھینسے کی طرح موٹی تھی۔ سلیمان اس سے میرے بارے میں بات کر چکا تھا۔ رابرٹو نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اطالوی میں بولا:

"او کے۔ ابھی سے کام شروع کر دو۔"

نائٹ کلب کا نام پارما نائٹ کلب تھا۔

سلیمان مجھے رابرٹو کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی رابرٹو نے مجھے مختلف بوتلوں سے بھرا ہوا ایک گتے کا کیس پکڑایا اور کہا۔۔ اسے کونے والے گودام میں رکھ آؤ۔ میں بار روم کے عقبی کمرے میں تھا۔ یہاں رابرٹو مختلف مشروبات کی بوتلوں کو لکڑی کے بکسوں سے نکال نکال کر شیلف میں لگا رہا تھا۔ میں گتے کا ڈبہ لے کر تنگ راہ داری سے گذرتا ہوا کونے والے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں پہلے ہی سے کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ شیلف میں سینکڑوں بوتلیں لگی تھیں۔ میں نے ڈبہ فرش پر دوسرے ڈبوں کے اوپر رکھا اور واپس رابرٹو کے پاس آگیا۔ اس نے ایک الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اس میں سے وردی نکال کر پہن لو اور اپنے یہ کپڑے وہیں رکھ دو۔"

میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔ اسکی تیز تیز اطالوی زبان میری سمجھ سے بالا تھی۔ بس الماری کپڑے وردی ہی سمجھ سکا تھا۔ رابرٹو نے مجھے گالی دے کر کہا:

"میرا منہ کیا تکتے ہو' جاؤ۔"

میں جلدی سے الماری کی طرف گیا۔ اس کے اندر سرخ پتلونیں سرخ جیکٹیں اور زرد مخمل کی ٹوپیاں ہینگروں سے لٹک رہی تھیں۔ میں نے ایک ٹوپی' ایک پتلون' ایک جیکٹ اتاری اور باتھ روم میں جاکر اپنے کپڑے اتار کر نائٹ کلب کی وردی پہن لی۔ اپنے کپڑے واپس الماری میں رکھ کر رابرٹو کے پاس آیا تو وہ ہنس کر اپنے گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا:

"اب ٹھیک ہے۔"

فوراً اس نے شیشے کے ایک گول ٹرے میں مارٹینی کی ایک بوتل اور دو خالی جام اوندھے کر کے رکھے اور کہا:

"اسے بار روم میں میز نمبر ۳۴ کو جاکر دے دو۔ یہ میز ڈانسنگ فلور کے پاس ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔"

اس نے فوجی افسر کی طرح حکم دیتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بار روم کا کونسا دروازہ ہے۔ جب میں نے رابرٹو سے بار روم کے دروازے کا پوچھا تو وہ گالی دے کر چلایا:

"وہ سامنے ہے۔ وہ۔۔۔۔ جاؤ۔"

بار روم تمباکو اور مختلف شرابوں کی بو سے بھرا ہوا تھا۔ فضا بوجھل اور دھندلی تھی۔ میزوں پر مدھم لائٹیں روشن تھیں۔ ڈانسنگ فلور پر پانچ چھ عورتیں نیم عریاں کاسٹیوم میں میوزک کے شور میں اچھل کود رہی تھیں۔ ایک طرف میزیں لگی تھیں جہاں جوا ہو رہا تھا۔ لوگ خوشی کے عالم میں تھے اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ڈانسنگ فلور کے

قریب جو لوگ بیٹھے تھے، وہ رقص کرتی نیم عریاں لڑکیوں پر آوازے بھی کس رہے تھے۔ اور ان کی طرف کبھی کبھی دس، پانچ کا نوٹ بھی اچھال دیتے تھے۔ مارٹینی کا ٹرے میرے ہاتھ میں تھا۔ میں میزوں کے نمبر پڑھنے لگا۔ ایک باوردی بار ٹینڈر یا میری طرح کے بیرے نے مجھے نمبر پڑھتے دیکھا تو لپک کر میرے پاس آگیا۔

"تم نئے آئے ہو؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ اس نے پوچھا:

"نمبر کونسا ہے؟"

"چونتیس" میں نے فوراً جواب دیا۔

اس نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ میں دوسری میزوں کے درمیان سے گذر کر چونتیس نمبر میز پر پہنچ گیا۔ یہ میز ڈانسنگ فلور کے قریب ہی تھی۔ میز پر دو کسرتی بدن والے باکسر ٹائپ کے آدمی بیٹھے بڑے غور سے فلور پر رقص کرتی عورتوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے جھک کر مشروب کی بوتل اور دو جام میز پر رکھے تو ایک آدمی نے دس لیرے کا نوٹ جیب سے نکال کر میری خالی ٹرے میں رکھ دیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور واپس مڑا۔ یہ دونوں آدمی مجھے شکل ہی سے دہشت گرد لگے۔ کہیں یہ نائٹ کلب میں بم لگانے نہ آئے ہوں۔ اگر میں انہیں پکڑوا دوں تو نائٹ کلب میں نہ صرف میری نوکری پکی ہو جائے گی بلکہ ہو سکتا ہے میری راتوں رات ترقی بھی ہو جائے۔ یہ سوچ کر میں ایک طرف اندھیرے میں ستون کے پاس کھڑا ہو گیا اور ان دونوں آدمیوں کی نقل و حرکت غور سے دیکھنے لگا۔

فلور پر ڈانس کرتی ہوئی ایک سنہرے بالوں والی سڈول بدن کی

خوبصورت لڑکی فلور کے کنارے آئی تو ان دونوں میں سے ایک آدمی نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ڈانسر لڑکی فلور سے اتری اور قیامت خیز چال چلتی میز کے قریب آگئی۔ اس آدمی نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کے گریبان میں ڈال دیا۔ اور پھر بازو سے کھینچ کر اسے اپنے قریب کیا اور کان میں کچھ کہا۔ سنہرے بالوں والی لڑکی کا چہرہ ایکدم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے نوٹ میز پر پھینکا اور تیزی سے واپس فلور پر جا کر رقص کرنے لگی۔

دونوں آدمی اٹھے۔ میز پر مشروب کی رقم رکھی اور بار روم کے عقبی گیٹ سے باہر نکل گئے۔ وہاں اتنا شور مچا ہوا تھا' اتنا ہنگامہ تھا کہ اس چھوٹے سے ڈرامے کو کسی نے نہ دیکھا۔ اگر دیکھا بھی ہو گا تو وہاں کسی کو اس طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اس قسم کے واقعات نائٹ کلبوں کا معمول ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس واقعے کے بعد ڈانس کرتی سنہرے بالوں والی لڑکی کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ اور وہ اس جوش و خروش سے رقص نہیں کر رہی تھی۔ کسی نے میرے کندھے پر پیچھے سے ہاتھ مارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ چیف بیرا غصیلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا: "اپنا کام کرو۔ ۔جاؤ۔"

میں جلدی سے بار روم کے پیچھے رابرٹو کے پاس آگیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے' وہ رابرٹو کو بتا دوں۔ پھر خیال آیا کہ یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے۔ رابرٹو میرا مذاق اڑائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے ڈانٹ بھی دے کہ گاہکوں کی نقل و حرکت پر نظر کیوں رکھتے ہو۔

نائٹ کلبوں میں میری ڈیوٹی شام کو شروع ہوئی اور رات کو ایک بجے ختم ہو گئی۔ اس دوران میں نے وہیں کچن میں رات کا کھانا بھی کھایا۔ جب

ڈانسر لڑکی نتالی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں کافی مگ میں ڈال رہا تھا کہ پیچھے سے نتالی نے پوچھا:

"تمہارا باتھ روم وہ سامنے ہے کیا؟"

دراصل باتھ روم کے دروازے پر سلیمان نے اطالوی اور امریکن ایکٹرسوں کی اتنی تصویریں اخباروں' رسالوں سے پھاڑ کر چپکائی ہوئی تھیں کہ دروازے کا صرف ہینڈل ہی نظر آتا تھا۔ میں نے کہا:

"ہاں۔ یہی ہے۔"

نتالی باتھ روم میں چلی گئی۔

میں کافی کا مگ لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلیمان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ کسی وقت آسکتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اب وہ اسی وقت آئے جب نتالی وہاں سے جاچکی ہو۔ اگرچہ وہاں کے معاشرے کے ماحول کے مطابق فلیٹ میں کسی عورت کو لے آنا کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ سلیمان کو پتہ چلے کہ میرے ساتھ رات کو کوئی لڑکی بھی تھی۔

نتالی باتھ روم سے باہر نکلی تو اس نے بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی اور وہ ٹشو پیپر سے اپنے ہونٹوں کی سرخی اتار رہی تھی۔ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا:

"میں یہاں سو جاؤں گی۔ تھوڑی سی رات رہ گئی ہے۔ تم پلنگ پر سو جاؤ۔"

میں نے کہا: "نہیں نتالی! تم پلنگ پر سوؤ' میں صوفے پر ہی سویا کرتا ہوں۔"

نتالی نے ایک عجیب سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میں کرسی پر خاموش بیٹھا

میں ڈیوٹی سے آف ہوکر اپنے کپڑے پہن کر جانے لگا تو رابرٹو نے مجھے آواز دی:

"اے۔۔۔ادھر آؤ۔"

اس نے میز کی دراز میں سے پچاس لیرے کا نوٹ نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا اور بولا:

"اسے خرچ کرو۔ تمہاری تنخواہ میں سے کٹ جائے گا۔"

میں بڑا خوش ہوا اور کلوک روم کی طرف چلا۔ کیونکہ مجھے بتادیا گیا تھا کہ ڈیوٹی سے فارغ ہونے کے بعد گلی کے عقبی دروازے سے نہیں بلکہ کلوک روم والے دروازے سے باہر جاؤ گے۔ سارے ملازم اسی راستے سے باہر جاتے ہیں۔

کلوک روم میں مدھم بلب روشن تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی اونچی الماری یہاں سے وہاں تک چلی گئی تھی۔ اس الماری میں مختلف خانے بنے ہوئے تھے۔ میں کلوک روم میں داخل ہوا تو وہاں پہلے سے تین ڈانسر لڑکیاں لوہے کی الماری کے خانوں میں سے اپنے کپڑے نکال رہی تھیں۔ ان میں وہ سنہرے بالوں والی ڈانسر لڑکی بھی تھی جس کو ڈانسنگ فلور پر باکسر قسم کے آدمی نے نوٹ دے کر کان میں کچھ کہا تھا اور لڑکی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ باقی دونوں لڑکیاں آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ مگر سنہرے بالوں والی لڑکی خاموش تھی۔ میں اس کے قریب سے گذرا تو اس کے بالوں کا پلاسٹک کا پن نیچے گر پڑا۔ میں نے جلدی سے اٹھا کر اسے پکڑایا تو وہ میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائی اور میرا شکریہ ادا کر کے الماری کو تالہ لگانے لگی۔

کلوک روم کے دروازے کے باہر ایک گلی تھی جس میں سرخ رنگ کا ایک بلب بڑی خطرناک قسم کی روشنی دے رہا تھا۔ گلی آگے جا کر سڑک پر نکل آئی۔ یہ سڑک میری دیکھی بھالی تھی۔ رابرٹو اور سلیمان نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ رات سوا دو بجے یہاں سے ایک بس جاتی ہے جو سینٹ پال کے علاقے سے گذرتی ہے۔ مجھے سینٹ پال کے علاقے میں ہی جانا تھا۔ رابرٹو نے کہا تھا اگر یہ بس نہ پکڑ سکے تو تمہیں ٹیکسی پر جانا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے بعد بس صبح پانچ بجے آتی ہے۔ میں بس سٹاپ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ لیمپ پوسٹ کی روشنیاں کافی فاصلے فاصلے پر تھیں۔ بس سٹاپ پر کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں شیڈ کے نیچے خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ ابھی وینس میں سردیوں کا موسم شروع نہیں ہوا تھا مگر رات کو کافی خنکی ہو جاتی تھی۔ میں بار روم میں کام کرتے کرتے کافی تھک گیا تھا۔ کیونکہ وہاں مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ مجھے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ رات دو بجے کے بعد جو بس آتی ہے' اسے ہاتھ دے کر رکنے کا اشارہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہاتھ نہ دو تو وہ نکل جاتی ہے۔

میں نے بس سٹاپ کی شیشے کی دیوار میں سے بس کی روشنیاں دیکھیں۔ یہ بس بغلی گلی میں سے چڑھائی چڑھ کر سڑک پر نمودار ہوئی تھی۔ اس کے اندر دھیمی دھیمی روشنی میں سواریاں نظر آ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ بس سٹاپ پر آ کر ضرور رکے گی' پھر میں اس میں سوار ہو جاؤں گا۔ مگر چونکہ میں نے شیڈ میں سے نکل کر اسے اشارہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی' اس لئے بس سٹاپ کے سامنے سے تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور حسرت بھری نظروں سے بس کو جاتے دیکھنے لگا۔ دل میں بس ڈرائیور

کو دو چار گالیاں بھی دیں۔ اگرچہ مجھے نائٹ کلب سے پچاس لیرے بطور ایڈوانس مل چکے تھے مگر میں ٹیکسی کا اتنا زیادہ کرایہ خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

روکو۔" دوسرے لمحے سامنے والے مکانوں کے درمیان جو اندھیرا راستہ تھا' وہاں سے ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور ٹیکسی کا دوسری جانب کا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر سمٹ کر چھپ گئی۔

"خدا کے لئے گاڑی لے چلو۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

بوڑھے ڈرائیور نے ڈرائیونگ وھیل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

"نکل جاؤ میری گاڑی میں سے۔ میں بدمعاش عورتوں کو نہیں بٹھایا کرتا۔"

میں نے جھک کر گاڑی کے اندر دیکھا۔ یہ وہی سنہرے بالوں والی لڑکی تھی جو کچھ دیر پہلے نائٹ کلب کے فلور پر ڈانس کر رہی تھی۔ جس کا پن میں نے اٹھا کر دیا تھا اور اس نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ اب اس نے بھی پہچان لیا۔ اسکا رنگ سفید پڑ چکا تھا اور خوف کے ماری کانپ رہی تھی۔ کہنے لگی:

"خدا کے لئے مجھے یہاں سے لے چلو۔ جلدی کرو وہ لوگ....."

میں جلدی سے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور دروازہ بند کر کے ڈرائیور سے کہا:

"گاڑی بھگاؤ۔ میں تمہیں دوگنا کرایہ دوں گا۔"

اتنے میں مکانوں کی طرف سے فائر کی آواز آئی۔ لڑکی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ دو آدمی تیزی سے بھاگتے ٹیکسی کی طرف آ رہے تھے۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ انجن پہلے ہی سٹارٹ تھا۔ ٹائروں کی چیخ بلند ہوئی اور گاڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔ پیچھے سے پستول کے دو فائر ہوئے مگر گاڑی کو کوئی گولی نہ لی۔ میں نے ڈانسر لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تسلی دی۔ اسکا

ہاتھ سرد تھا اور کانپ رہا تھا۔

ٹیکسی گلی میں سے نکل کر بڑی سڑک پر آئی تو ڈرائیور نے اس کی سپیڈ تیز کر دی۔ جب ہم خطرناک علاقے سے کافی دور نکل آئے تو اطالوی ڈرائیور نے گردن پیچھے گھما کر نظریں سامنے رکھتے ہوئے کہا:

"بہتر ہے تم لوگ اگلے چوک میں اتر جاؤ' وہاں تمہیں دوسری ٹیکسی مل جائے گی۔ میں تھانہ کچہری کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

میں نے ڈرائیور کو مزید پیسوں کا لالچ دیا مگر اس نے اگلے چوک میں جا کر ٹیکسی روک دی اور بولا:

"اگر تم نہیں اترو گے تو میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

لڑکی اب کسی حد تک اپنے ہوش و حواس میں تھی مگر وہ بدستور گھبرائی ہوئی تھی اور ٹیکسی سے نکلنے کے بعد بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ ڈرائیور ٹیکسی لے کر زوں کر کے نکل گیا۔ سنسان سڑک پر ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ لڑکی سڑک پر اترنے کے بعد زیادہ گھبرا گئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون لوگ تھے اور اس کے پیچھے کیوں لگے ہیں۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتی۔ پھر میرا ہاتھ تھام کر منتیں کرنے لگی:

"خدا کے لئے مجھے یہاں سے لے چلو۔ اف کیا کروں۔ کوئی ٹیکسی نظر نہیں آتی۔"

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خوش قسمتی سے ایک خالی ٹیکسی سڑک پر سے گذری۔ لڑکی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخ کر ٹیکسی ٹیکسی کی آوازیں دیں۔ ٹیکسی سڑک کی دوسری جانب سے گھوم کر ہمارے پاس آگئی۔ وہ جلدی سے پچھلی سیٹ پر جھک کر بیٹھ گئی۔ میں نے ڈرائیور سے

کہا:

"سینٹ پال چلو۔"

ٹیکسی چل پڑی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا:

"تمہیں جہاں جانا ہے، میں تمہیں وہاں اتار دیتا ہوں۔ تم کہاں رہتی ہو؟"

لڑکی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھ ابھی تک کپکپا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی بہت خطرناک گینگ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دوڑتی ہوئی ٹیکسی میں سٹریٹ لیمپ کی روشنی پر پڑتی تو مجھے اسکا قابل رحم چہرہ جو واقعی بڑا خوبصورت تھا، نظر آجاتا۔ اس نے ملتجی لہجے میں کہا:

"میں کون ہوں، کہاں رہتی ہوں، یہ لوگ کون تھے، یہ ساری باتیں میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ پلیز مجھے رات کی رات کسی جگہ چھپالو۔ تم نائٹ کلب میں بھی مجھے ملے تھے۔ تم وہی ہو ناں؟

"ہاں۔ میں نے آج ہی نائٹ کلب میں ویٹر کی ڈیوٹی جوائن کی ہے۔ میں نے تمہیں فلور پر ڈانس کرتے بھی دیکھا تھا۔"

لڑکی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بڑی اپنائیت سے دبایا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"پلیز! مجھے رات کی رات پناہ دے دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔"

اسکا مطلب تھا کہ اب مجھے اس ڈانسر لڑکی کو لے کر سلیمان کے فلیٹ میں جانا تھا۔ میرے پاس دوسری کوئی جگہ نہیں تھی۔ لڑکی کی حالت ایسی

تھی کہ میں اسے چھوڑ دینا خلاف انسانیت سمجھتا تھا اور پھر وہ میری نائٹ کلب کی کولیگ بھی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

"فکر نہ کرو۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔"

لڑکی نے اپنا سنہری بالوں والا سر میرے ساتھ لگا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے دل میں ان اطالوی غنڈوں کو بڑی گالیاں دیں جو ایسی معصوم لڑکی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت میں خود کو ہیرو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن چونکہ مجھے پہلے بھی تلخ تجربہ ہو چکا تھا اور میں اٹلی کے گھناؤنے معاشرے اور وہاں کے جرائم پیشہ گروہوں کی مذموم سرگرمیوں سے کافی حد تک واقف ہو گیا تھا' اس لئے دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اسے منہ اندھیرے سلیمان کے فلیٹ سے رخصت کر دوں گا اور پھر کبھی اس سے واسطہ سروکار نہیں رکھوں گا۔ نائٹ کلب میں بھی جب یہ ڈانس کر رہی ہو گی یا کلب میں آتی جاتی ملے گی تو میں سوائے ہیلو ہیلو کرنے کے اس سے کوئی بات نہیں کروں گا۔

سلیمان نے ایک چابی مجھے دے رکھی تھی۔ ٹیکسی سینٹ پال کے علاقے میں داخل ہوئی تو میں نے اسے سلیمان کے فلیٹ والی گلی کے باہر ہی روک دیا۔ لڑکی کو لے کر میں فلیٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے موسم بہار کا پھولدار فراک پہن رکھا تھا' جسم پر اونی جرسی تھی۔ اس کے بالوں اور لباس میں سے سینٹ کی خوشبو آ رہی تھی۔ لڑکی میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ اٹلی کی یہ لڑکی ڈانسنگ کے پیشے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی لڑکیاں تو عام طور پر بڑی دلیر ہوتی ہیں مگر یہ تو بے حد کمزور دل کی ہے۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ عورت چاہے وینس کی ہو' چاہے ماموں کانجن کی۔ جب

مرد طاقت آزمائی پر اتر آئے تو وہ بڑی ہی کمزور ہوتی ہے۔

وہ میرے ساتھ بالکل خاموش چل رہی تھی۔ سلیمان کے فلیٹ والی عمارت کا گیٹ کھلا تھا۔ یہ گیٹ رات دن کھلا ہی رہتا تھا۔ میں دوسری منزل پر آگیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ پھر خیال آیا کہ چابی تو میری جیب میں ہے۔ میں چابی لگا رہا تھا۔ لڑکی نے پوچھا:

"تم یہاں اکیلے ہی رہتے ہو؟"

میں نے کہا:

"نہیں۔ ایک دوست کے ساتھ رہتا ہوں، وہ ٹیکسی چلاتا ہے۔ کبھی رات کو آجاتا ہے، کبھی نہیں آتا۔ ابھی تک وہ نہیں آیا۔"

میں نے بتی جلا کر کمرے کو خالی دیکھ کر کہا۔ لڑکی پرس گود میں لے کر سلیمان کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی:

"بس میں ایک سگریٹ کر لیٹ جاؤں گی۔ دن نکلتے ہی چلی جاؤں گی۔"

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اسکا ہاتھ اب گرم تھا اور اسکی کپکپاہٹ بھی ختم ہو چکی تھی۔

"میں تمہارے احسان کا بدلہ دینا چاہتی ہوں۔"

میں نے اس کے ہاتھ کو آہستہ سے تھپتھپاتے کہا:

"اسکی ضرورت نہیں۔ ہاں۔ تمہارا نام کیا ہے....."

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ اس نے اپنی مخروطی انگلی سے اپنے سرخ ہونٹوں پر سے سنہری بال پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:

"نتالی۔ میرا نام نتالی ہے۔ مجھے پارمانائٹ کلب میں آئے دو مہینے ہی ہوئے ہیں۔ پہلے میں پرسی پولیس کلب میں ڈانس کیا کرتی تھی۔"

"تمہارے لیے کافی بناؤں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں پلیز! جب تک میں سگریٹ پیتی ہوں، تم میرے پاس ہی بیٹھے رہو۔ مجھے ابھی تک ڈر لگ رہا ہے۔"

اس نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ سلیمان کافلیٹ رات کے وقت بھی ویسا ہی گندا تھا جیسے دن کے وقت گندا ہوتا تھا۔ نتالی اس ماحول میں بہار کا پھول لگ رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نتالی واقعی بہت خوبصورت تھی۔ شاید یہ وہی سنہری بالوں والی لڑکی تھی جس سے محبت کرنے کا عزم لے کر میں پاکستان سے جانب اطالیہ چلا تھا۔ مگر اب میں بڑا محتاط ہو گیا ہوا تھا اور میں نے اس قسم کی باتوں سے توبہ بھی کی ہوئی تھی۔

رات کے تین بجنے والے تھے۔ میں نے باقی رات سو کر گذارنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ چنانچہ میں نے نتالی سے کہا: "میں اپنے لئے کافی بناتا ہوں۔"

نتالی نے مجھے بالکل نہ روکا۔ آگے سے کوئی بات بھی نہ کی۔ میں نے گیس کے چولہے پر پانی کی کیتلی رکھ دی اور سگریٹ سلگا کر وہیں بوسیدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ نتالی انتہائی محویت کے عالم میں فرش کی طرف تک رہی تھی۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے نہ بلایا اور اٹھ کر چولہے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو اس قسم کے معاملات میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک لڑکی کو مصیبت کے وقت پناہ کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے پناہ دے دی تھی۔ بس اس سے آگے میں اس

ڈانسر لڑکی نتالی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں کافی مگ میں ڈال رہا تھا کہ پیچھے سے نتالی نے پوچھا:

"تمہارا باتھ روم وہ سامنے ہے کیا؟"

دراصل باتھ روم کے دروازے پر سلیمان نے اطالوی اور امریکن ایکٹرسوں کی اتنی تصویریں اخباروں، رسالوں سے پھاڑ کر چپکائی ہوئی تھیں کہ دروازے کا صرف ہینڈل ہی نظر آتا تھا۔ میں نے کہا:

"ہاں۔ یہی ہے۔"

نتالی باتھ روم میں چلی گئی۔

میں کافی کا مگ لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلیمان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ کسی وقت آسکتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اب وہ اسی وقت آئے جب نتالی وہاں سے جاچکی ہو۔ اگرچہ وہاں کے معاشرے کے ماحول کے مطابق فلیٹ میں کسی عورت کو لے آنا کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ سلیمان کو پتہ چلے کہ میرے ساتھ رات کو کوئی لڑکی بھی تھی۔

نتالی باتھ روم سے باہر نکلی تو اس نے بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی اور وہ ٹشو پیپر سے اپنے ہونٹوں کی سرخی اتار رہی تھی۔ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا:

"میں یہاں سو جاؤں گی۔ تھوڑی سی رات رہ گئی ہے۔ تم پلنگ پر سو جاؤ۔"

میں نے کہا: "نہیں نتالی! تم پلنگ پر سوؤ، میں صوفے پر ہی سویا کرتا ہوں۔"

نتالی نے ایک عجیب سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میں کرسی پر خاموش بیٹھا

کافی پیتا رہا۔ اور اسے تکتا رہا۔ طوفان میرے اندر بھی چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ مگر میں چپ تھا۔ میں نے توبہ کی ہوئی تھی۔ اور میں اپنی توبہ پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ نتالی آگے بڑھ کر پلنگ پر جاکر لیٹ گئی۔ اس نے کمبل اوپر کر لیا۔

"بتی بجھادوں؟" میں نے پوچھا۔

"جیسے تمہاری مرضی" نتالی نے خواب ایسے لہجے میں کہا۔ میں نے بتی گل نہ کی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے بتی بجھادی تو اندھیرے میں شیطان مجھ پر حملہ کردے گا۔ بلکہ میں خود شیطان بن کر حملہ کردوں گا۔ مگر میں نے توبہ کی ہوئی تھی۔ میں نے بتی جلتی رہنے دی۔ کافی کا خالی مگ ایک طرف رکھ کر میں بھی صوفے میں کمبل لے کر دھنس گیا۔ نتالی کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ اس کے سنہری بال کمبل سے باہر سونے کے تاروں کی طرں نظر آرہے تھے۔ میں نے نظریں ہٹالیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند بالکل نہیں آرہی تھی۔

میری یہ حالت تھی کہ اونگھتے اونگھتے کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی آنکھ کھل جاتی۔ نتالی اسی طرح دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی تھی۔ شاید وہ سوگئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اونگھنے لگا۔ پھر مجھے واقعی نیند آگئی اور میں سوگیا۔ آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ میں نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ نتالی جاچکی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی۔

باتھ روم میں جاکر میں نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر آکر کافی بنانے لگا۔ گلی میں سے عورتوں اور بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر دروازے میں چابی لگی اور سلیمان اندر آگیا۔ وہ سخت تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے جیکٹ اتار کر پھینکی اور پلنگ پر اپنے آپ کو گرادیا۔

"ساری رات غارت ہوگئی۔ صرف دو تھوڑے فاصلے کی سواریاں ہی ملیں۔"

پھر ایکدم چونک کر اٹھ بیٹھا اور کمبل کو سونگھتے ہوئے بولا: "یہاں کوئی عورت سوئی تھی؟"

میں خاموش رہا۔ سلیمان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"شاباش! اب تم وینس شہر کو صحیح سمجھ سکوگے۔ اچھا بتاؤ وہ کون تھی؟ کوئی گرل فرینڈ تھی تو بڑی اچھی بات ہے۔ طوائفوں کے چکر میں نہ پڑنا۔ ایسی بیماری لگے گی کہ ساری عمر روتے رہوگے۔"

میں کافی لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں مسکرا رہا تھا۔ سلیمان نے سگریٹ سلگالیا تھا۔ کہنے لگا:

"دوست! یہ بتاؤ نائٹ کلب کی پہلی رات کیسی رہی؟ جاب پسند آئی؟"

میں نے کہا:

"رابرٹو نے مجھے پچاس لیرے ایڈوانس بھی دیئے ہیں۔ اچھی جاب ہے۔ مجھے پسند ہے۔"

"بس مل گئی تھی واپسی پر؟"

مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ اسے ہاتھ کا اشارہ کرنا ہے، وہ نکل گئی۔ میں تو ٹیکسی پر آیا ہوں۔ بیس لیرے خرچ ہوگئے۔"

سلیمان نے ٹیکسی ڈرائیور کو بڑی گندی گالی دی۔

"ارے وہاں سے یہاں تک کا کرایہ دس لیرے سے کبھی زیادہ نہیں بنتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب تم بس کو ہاتھ ضرور دیا کرو۔"

وہ اٹھ کر باتھ روم جاتے ہوئے بولا:

"دوست! میرا ناشتہ نہ بنانا۔ میں ایئر پورٹ سے ناشتہ کر کے آرہا ہوں۔ بس اب پلنگ پر گر کر درخت کی طرح سو جاؤں گا۔"

میرے دوست سلیمان نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ خراٹے لے رہا تھا۔ میری بھی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ سنہرے بالوں والی مصیبت زدہ لڑکی نتالی کا خیال ضرور ذہن کو پراگندہ کر رہا تھا۔ مگر آخر کار میں بھی سو گیا۔

رات کو میں اپنی ڈیوٹی پر پارما کلب پہنچ گیا۔ کلب میں بڑی رونق تھی۔ ہال کمرے کی سلاٹ مشینیں بھی چل رہی تھیں۔ جوا ہو رہا تھا۔ ڈانسنگ فلور پر نیم عریاں کاسٹیوم پہنے لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ مجھے ان میں نتالی کہیں نظر نہ آئی۔ میرا خیال بار بار اس کی طرف جا رہا تھا۔ جانے وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی۔ میں اس کی مصیبت پر پریشان نہیں تھا۔ جس سوسائٹی میں وہ رہ رہی تھی، یہ اس کا تقاضا تھا کہ نتالی کسی نہ کسی مشکل میں پھنس کر رہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ کلبوں میں راتوں کو نیم عریاں اور عریاں ڈانس کرنے والی لڑکیاں بہت جلد کسی نہ کسی مافیا کے جال میں پھنس جاتی ہیں اور مافیا کے اراکین اپنے گھناؤنے اور مجرمانہ مقاصد کے لئے ان لڑکیوں کو استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ان لڑکیوں کا کردار نیم طوائفوں والا ہوتا ہے اور انہوں نے بھی کچھ دولت کے لالچ میں اور کچھ موت کے خوف سے اپنے آپ کو مافیا کے حوالے کر دیا ہوتا ہے۔ مجھے نتالی کی مصیبت کی بجائے اس کے انداز دل ربائی نے اس کے قریب کر دیا تھا۔ آپ اسے میری کمزوری کہہ لیں، چاہے میرا ارتکاب گناہ کہہ لیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اس سنہری

بالوں والی نیم طوائف اطالوی کلب ڈانسر کے دام الفت میں پھنس چکا تھا۔ میری توبہ کو نتالی نے توڑ ڈالا تھا۔

مشروبات کا ٹرے ہاتھ میں لئے میں میزوں کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اور نتالی کا خیال، اس کی حسین صورت، اس کی لمبی سنہری زلفیں اور اس کا گرمجوشی کے ساتھ میرے قریب ہوکر سرگوشی میں بات کرنے کا انداز میرے اعصاب کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ میں بار بار اس کے خیال کو دل سے نکالتا۔ اسے جھٹکتا، توبہ کرتا اور بار بار نتالی کا خوبصورت چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا اور میری توبہ ٹوٹ جاتی۔ میرا وجود جیسے چکی کے دو پاٹوں میں پس رہا تھا۔ کبھی مجھے جنت کی ہوا آتی اور کبھی دوزخ کے شعلے مجھے اپنے چہرے کے بالکل قریب محسوس ہوتے اور میں ڈر کر نتالی کا خیال دل سے نکال دیتا۔

فلور پر ڈانس کرتی لڑکیوں میں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک نہ ایک لڑکی فلور کے پیچھے گرے ہوئے پردے کے پیچھے چلی جاتی تھی اور اس کی جگہ دوسری لڑکی آجاتی تھی۔ کلب کی فضا سگریٹ کے دھوئیں اور مشروبات کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی مگر اب میں اس فضا کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔

میری ڈیوٹی رابرٹو نے ان میزوں پر لگائی تھی جو ڈانسنگ فلور کے گرد نیم دائرے کی شکل میں بچھی ہوئی تھیں۔ ان میزوں پر زندگی کے ہر طبقے کے اوباش لوگ بیٹھے مشروبات پی رہے تھے اور ڈانس کرتی لڑکیوں پر فقرے بھی کس رہے تھے اور ان پر کبھی کبھی پانچ دس لیرے کا نوٹ بھی اچھال دیتے تھے۔ میرا کام یہ تھا کہ ان میزوں پر کوئی گلاس خالی ہو تو اسے فورا

وائن یا وسکی سے بھردوں اور ساتھ ہی حساب بھی لکھتا جاؤں کہ فلاں میز پر کتنے پیگ دیئے گئے ہیں۔ قدرتی طور پر میری نگاہ ڈانس کرتی نیم عریاں لڑکیوں کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی' ان کے سرخ و سفید بدن کلب کی نیلی پیلی اور سرخ روشنیوں میں شعلوں کی طرح لگ رہے تھے۔ کلب کے باہر وینس کی رات بے حد سرد تھی مگر کلب کے اندر کی فضا گرم تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ جب بھی میری نگاہ ڈانسنگ فلور کی طرف جاتی ہے' نیگرو لڑکی مجھے گھور کر دیکھتی ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے کوئی اشارہ کرتی ہے۔ پہلے تو میں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن ایک دفعہ جب میں فلور کے بالکل ساتھ لگی میز پر گلاس میں وائن ڈال رہا تھا تو چوڑے نتھنوں والی سانولی نیگرو لڑکی رقص کرتے کرتے میرے قریب آگئی اور ہیلو کہا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میز کے گرد بیٹھے ہوئے گاہک نیم مدہوش تھے۔ نیگرو لڑکی نے مجھے اشارہ کیا کہ پردے کے پیچھے آؤ۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

یہ مجھے کیوں بلا رہی ہے؟ مجھے خیال آیا شاید میں اسے پسند آگیا ہوں اور وہ پردے کے پیچھے ڈریسنگ روم میں بلا کر مجھ سے اظہار محبت کرے گی۔ یورپ کی اور خاص طور پر اطالیہ کی اس قماش کی لڑکیوں کو اگر کوئی مرد پسند آجائے تو اس سے بڑی بے باکی سے محبت کا اظہار کرتی ہیں اور ان پر زبردست خود سپردگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور کوئی مرد طریقت ہی ان کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ اپنے بارے میں مجھے علم تھا کہ میں کوئی مرد طریقت نہیں ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں گناہ کی دلدل میں پھنسنے سے گھبراتا تھا۔ نتالی نے میری توبہ ضروری توڑ دی تھی اور اس کے بارے میں

میرے دل میں محبت کا ایک خفیہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا لیکن اس سانولی نیگرو لڑکی نے جس انداز میں مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا' اس نے میرے نیکی کے خیالات میں ہلچل مچادی تھی۔

میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں اس لڑکی کے جال میں نہیں پھنسوں گا۔ میں ٹرے میں مشروبات کی دو بوتلوں کو سنبھالتا ہوا میزوں کی دوسری طرف گیا تو نیگرو لڑکی پردے کے پیچھے جا رہی تھی۔ میری بوتلیں خالی ہو گئی تھیں۔ میں نئی بوتلیں لینے کے لئے بار روم کے کاؤنٹر کی طرف گیا۔ ٹرے میں دوسری بوتلیں رکھیں اور واپس مڑا۔ ساتھ ہی چھوٹا سا کوریڈور پردے کے پیچھے جو ڈریسنگ روم بنے ہوئے تھے' ان کی طرف جاتا تھا۔ میری نگاہ خالی کوریڈور کی طرف اٹھ گئی۔ چوڑے نتھنوں والی نیگرو لڑکی کا خیال شیطان بن کر میرے دماغ پر چھا گیا۔ اور پھر میرے قدم اپنے آپ کوریڈور کی طرف اٹھ گئے۔ بار ٹینڈر بروٹو دوسری طرف منہ کئے کسی کام میں مصروف تھا۔ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ مجھے ضرور آواز دیتا کہ میں ادھر کیا لینے جا رہا ہوں۔ کوریڈور میں ذرا آگے جا کر بائیں ہاتھ کو ساتھ ساتھ تین چار چھوٹے چھوٹے ڈریسنگ روم بنے ہوتے تھے جہاں ڈانس کرنے والی لڑکیاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد آکر اپنا کاسٹیوم بدلتی تھیں۔

مجھے بالکل پتہ نہیں تھا۔ نیگرو لڑکی ابھی تک فلور کے عقبی بھاری پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑی تھی۔ جیسے ہی میں اس کے قریب سے گذرا۔ وہ سامنے آگئی۔ اس نے مجھ سے کہا:

"میرے پیچھے آؤ۔"

اس کے لہجے میں کم از کم مجھے ضرور دعوت گناہ کا احساس ہوا۔

اصل میں میرے اندر کا شیطان مجھے اپنے طور پر یہ احساس دلا رہا تھا۔ وہ سامنے والے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں نے کوریڈور میں ادھر ادھر دیکھا اور میں بھی اندر چلا گیا۔ ہم مشرقی لوگوں کے دلوں میں ایک چور ضرور چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ہم اس قسم کا کام کرنے سے پہلے ادھر ادھر ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ نیگرو لڑکی ڈریسنگ ٹیبل پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ کمرہ بالکل خالی تھی۔ میں اپنی طرف سے بڑا ہیرو بنا اس کی طرف مسکراتے ہوئے بڑھا۔ نیگرو لڑکی نے میری طرف بالکل توجہ نہ دی۔ وہ پرس کھول کر کوئی شے تلاش کر رہی تھی۔ میرے احساس مردانگی کو دھچکا سا لگا کہ اس لڑکی نے مجھے بلایا بھی ہے اور اب مجھے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ پرس میں ہاتھ ڈال کر چیزوں کو ادھر ادھر کرتی ہوئی وہ میری طرف دیکھے بغیر میرا نام لے کر بولی:

"تمہارا نام یہی ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

اب میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھے محبت کرنے کے لئے نہیں بلایا تھا۔ اس دوران نیگرو لڑکی کاغذ کا ایک تہہ کیا ہوا ٹکڑا نکال چکی تھی۔ یہ کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

"نتالی نے یہ خط تمہارے نام دیا ہے۔"

نتالی کے نام ہی سے میرے دل میں گناہ کا جو خیال تھا' غائب ہو گیا۔ کیونکہ نتالی کے خیال سے میرا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اور مجھے میرے عشق کرنے کے تجربے نے بتایا تھا کہ یہ اسی فی صد خالص محبت کی علامت ہوتی ہے۔ نیگرو لڑکی نے چاندی کے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر

ہونٹوں میں دبایا اور لائٹر سے اسے سلگاتے ہوئے بولی :

"تم نتالی کو کب سے جانتے ہو؟"

میں کاغذ کو کھولنے لگا تو نیگرو لڑکی بولی :

"اسے یہاں مت پڑھو۔"

پھر وہ بلی کی طرح ڈریسنگ ٹیبل پر سے اچھل کر اتری ۔ تیز تیز قدموں سے بند دروازے تک گئی۔ دروازے کے سوراخ میں سے دوسری طرف دیکھا کہ باہر کوئی کان لگا کر ان کی باتیں تو نہیں سن رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ باہر کوئی نہیں ہے تو وہ میرے پاس آگئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے بولی :

"نتالی بڑی اچھی لڑکی ہے ۔ وہ اس ماحول کی لڑکی نہیں ہے۔ میں اسے جانتی ہوں' وہ میری ایک ہی سہیلی ہے' اس وقت وہ سخت مشکل میں ہے' اسکا خیال ہے کہ تم اس کی مدد کر سکتے ہو۔ اس خط کو باتھ روم میں جاکر پڑھنا۔ اور اگر تم اس کی کوئی مدد کر سکو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

باہر سے کسی مرد کی تیز آواز آئی :

"ساشی! کتنی دیر لگاؤ گی کاسٹیوم بدلنے میں؟"

اس نیگرو لڑکی کا نام ساشی تھا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اسی طرح تیز آواز میں بلکہ چیخ کر کہا :

"آرہی ہوں بو....."

اس نے ہلکی سی اطالوی میں گالی بھی دی۔ پھر جلدی جلدی میرے سامنے کپڑے اتار کر دوسری کاسٹیوم پہننی شروع کر دی۔ میں نے دوسری طرف منہ کیا تو ساشی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا : "تم مجھے کمینے آدمی لگتے ہو؟"

اب میں اسے کیسے کہتا کہ واقعی اس معاملے میں، میں کمینہ ہوں۔
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کاسٹیوم بدل کر وہ لپک کر دروازے کے پاس گئی۔ ذرا سا پٹ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا اور ہاتھ سے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا اپنا مشروبات والا ٹرے اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ نتالی کا رقعہ میری پتلون کی پچھلی جیب میں تھا۔ میں رقعہ پڑھنے کے لئے بے چین تھا مگر جب میں بار روم کے کاؤنٹر کے قریب سے گذرا تو بروٹو نے کرخت آواز میں اطالوی زبان میں پوچھا: "ادھر کہاں سے آرہے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور جلدی سے ہال روم میں چلا گیا۔ یہاں میوزک کا شور مچا تھا۔ میں فلور کے ساتھ والی میزوں کے پاس جاکر اپنے کام میں لگ گیا۔ جہاں کسی میز پر گلاس خالی ہوتا، میں اسے جلدی سے بھر دیتا اور گتے کے چھوٹے سے ٹکڑے پر میز کے نمبر کے آگے ایک کاہندسہ ڈال دیتا۔ اسی طرح پھرتیاں دکھاتا ہوا کھسکتا ہوا اس طرف چلا گیا جہاں باتھ روم تھے۔ یہاں مردانہ اور زنانہ باتھ روم ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ میں نے ٹرے ایک خالی میز پر رکھی اور مردانہ باتھ روم میں گھس گیا، اندر جاتے ہی نتالی کا رقعہ کھول کر دیکھا۔ رقعے میں انگریزی میں جلی حروف میں میرے نام کے آگے لکھا تھا:

"میری مدد کرو۔"

اس کے نیچے کسی جگہ کا پورا ایڈریس اور نیچے نتالی لکھا ہوا تھا۔ میرے کان گرم ہوگئے۔ جلدی سے رقعہ جیب میں ڈالا اور باتھ روم سے نکل آیا۔

رات کو سلیمان کے فلیٹ پر آکر میں نے نتالی کے رقعے کو ایک بار پھر پڑھا۔ بار بار پڑھا۔ نتالی جس مصیبت میں مبتلا تھی، وہ میرے علم میں تھی۔ یہ مافیا کا چکر تھا۔ دو آدمی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن نتالی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا اور میں بے بس سا ہو جاتا۔ اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ مجھے اس کی ضرور مدد کرنی چاہیئے۔ ساتھ ہی یہ خیال آجاتا کہ میں پردیس میں ہوں۔ یہاں مافیا والوں نے بڑے خونی جال بچھائے ہوتے ہیں، کہیں خواہ مخواہ رگڑا نہ جاؤں۔ میں نے ان جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا بھی تھا اور یہاں آکر بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ یہ لوگ بڑی آسانی سے وزیر سے لے کر خاکروب تک جس کو چاہیں قتل کروا دیتے ہیں اور بعض اوقات جو قتل کرتا ہے، اس کو بھی قتل کروا ڈالتے ہیں۔ یہ منشیات کا دھندہ بھی کرتے ہیں۔ ارب پتی سرمایہ داروں کو بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ ناجائز اسلحہ کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ دہشت گردی بھی کرواتے ہیں۔ یورپ کے کسی ملک میں ایسا کوئی کلب یا کیسینو نہیں ملے گا جہاں ان کے آدمی نہ ہوں۔ رازداری یہاں

تک رکھتے ہیں کہ قتل کرنے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جس کو قتل کرنے جارہا تھا' وہ کیوں قتل کیا جارہا ہے۔ مافیا کے اراکین ایک دوسرے تک سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔

یہ سارے حقائق میرے پیش نظر تھے۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ جس مافیا کے پھندے میں نتالی پھنسی ہوئی ہے' اسکا دھندہ کیا ہے اور وہ نتالی سے کیا کام کروانا چاہتے ہیں؟۔ میں نے اسکا رقعہ جیب میں ہی رکھا اور جب سلیمان آیا تو اس سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے یہی کہے گا کہ خبردار اگر تم اس معاملے میں آئے' یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے اپنے فلیٹ میں بھی رہنے نہ دے۔ سلیمان حسب عادت رات دیر سے آیا۔ اس وقت میں جاگ رہا تھا اور صوفے پر دو کمبل اوڑھے پڑا تھا۔ مگر میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں سو رہا ہوں۔ کافی دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ دماغ یہی سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔ دل سنہری بالوں والی خوبصورت اور گرمجوشی سے محبت کرنے والی لڑکی نتالی کی مدد کرنا چاہتا تھا' مگر دماغ اس کام سے روکتا تھا کہ یہ خطرناک راستہ ہے۔ اس سے باز آجاؤ' مارے جاؤ گے۔ فورا دل مجھے نتالی کے چہرے اور جسم کے مختلف پوز دکھاتا تھا۔ اور میں ایک بار پھر نتالی کے بارے میں سوچنے لگتا کہ آخر وہ ایک عورت ہے اور سخت مصیبت میں ہے' اس کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ چنانچہ سونے سے پہلے میں نے نتالی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ دن میری محبت اور میرے عذاب کا پہلا دن تھا۔

دوسرے دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹیلی ویژن پر محکمہ موسمیات والوں نے کہا تھا کہ آج بارش ہوگی۔ میں نے پولیسٹر کی فوم والی

ایک نئی جیکٹ سیل میں خرید لی تھی۔ یہ بے حد گرم تھی اور شدید سرد راتوں میں بھی میرے جسم کو گرم رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ھڈ یعنی ٹوپی بھی تھی۔ ھڈ سر پر پہن کر جب میں تسمے کس لیتا تھا تو سردی لگنے کا پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے نئی جیکٹ کے ساتھ ھڈ نہ پہنا۔ گرم اونی ٹوپی سر پہ جماکر کانوں تک کھینچ لی۔ سلیمان نے مجھے اس طرح تیار ہو کر نکلتے دیکھا تو پوچھا:

"کیا ایلپس کے پہاڑوں میں سیاحت کرنے جارہے ہو؟"

میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا:

"نہیں برادر! ذرا سپر مارکیٹ تک جارہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔"

نتالی کا لکھا ہوا ایڈریس میری جیب میں تھا۔ جس علاقے کا ایڈریس تھا' اس علاقے سے میں بخوبی واقف تھا۔ یہ شہر کے شمال مشرق میں نہروں والی گلیوں کے آخری سرے پر تھا جہاں سے آگے سمندر شروع ہو جاتا تھا۔ میں دو بسیں بدل کر شمالی کی جانب نہروں والی گلیوں کی ایک چھوٹی سی ڈاک یارڈ پر آگیا۔ نتالی نے مکان کا نام اور نمبر بھی لکھا تھا۔ میں کشتی میں بیٹھ کر اس نمبر والی گلی کے ایک پلیٹ فارم پر جاکر اتر گیا۔ پوچھتا پوچھتا آخر اس خاص مکان پر آگیا جس کا نام نتالی نے اپنے رقعے میں لکھا تھا۔

یہ عجیب سا لاطینی نام تھا۔ اس نام کی ایک تانبے کی تختی مکان کے باہر لگی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کال بیل کا بٹن کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ تیسری بار دستک دینے پر دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور میرے سامنے اپنی کلب

کی نیگرو ڈانسر ساشی گرم لمبا اونی گاؤن پہنے کھڑی تھی۔ اس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود پیچھے ہٹ گئی۔ میں ایک تنگ سے بوسیدہ کمرے میں آ گیا۔ مدھم روشنی میں گھسا پٹا پرانا فرنیچر ادھر ادھر پڑا تھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہاں یہ نیگرو لڑکی کہاں سے آ گئی؟ پھر سوچا کہ یہ نتالی کی سہیلی ہے، ہو سکتا ہے اس کے مکان پر آئی ہو۔ میں نے پوچھا:

"نتالی کہاں ہے؟"

ساشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی جو پہلے کی طرح تنگ اور نیم روشن تھا۔ کونے میں کالک لگا چولہا دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ گول میز پر چائے کے برتن اور دو تین چینی کی تھالیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ کمرے میں پہلے ہی سے گھٹیا تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پلنگ کے پاس بھدا سا صوفہ رکھا تھا جس کے آگے بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا۔ کمرے کی فضا پہلے کمرے کی نسبت گرم تھی۔ ساشی نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود سامنے والی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے ایک بار پھر نتالی کا پوچھا تو ساشی ہیٹر پر اپنے ہاتھ سینکتی ہوئی بولی:

"یہ نتالی کا گھر نہیں ہے۔ یہ میرا مکان ہے، میں یہاں کرائے پر رہتی ہوں۔"

نیگرو لڑکی ساشی نے سرہانے کے نیچے سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ مجھے دیا۔ ایک خود سلگا لیا۔ اپنے چوڑے نتھنوں میں سے سگریٹ کا دھواں نکالتی ہوئی کہنے لگی:

"میں نہیں سمجھتی کہ نتالی نے تجھے اپنی مدد کے لئے کیوں بلایا ہے۔ کیونکہ تم اس ملک کے رہنے والے نہیں ہو۔ تمہیں یہاں کے جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ لیکن نتالی بار بار تمہارا نام لے رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا ہے کہ صرف تم ہی اس کی مدد کر سکتی ہو۔"

میں خاموشی سے نیگرو لڑکی کی باتیں سن رہا تھا۔ بات کرتے کرتے کسی وقت اس کے نتھنے مزید چوڑے ہو جاتے تھے جو مجھے افریقہ کے جنگل کی کسی شیرنی کی یاد دلاتے تھے جو اپنے شکار پر جھپٹنے ہی والی ہو۔ میں دل میں بڑا فخر محسوس کر رہا تھا کہ نتالی کی نظروں میں میں ایک بہادر مرد ہوں۔ ساشی کہہ رہی تھی:

"نتالی میری بچپن کی سہیلی ہے۔ ہم گاؤں میں ایک ساتھ کانونٹ میں پڑھا کرتی تھیں۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اس کا خاوند اسے وینس لے آیا اور اس نے نتالی کو اونچی سوسائٹی میں لے جانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی خوبصورت بیوی کی مدد سے ٹینڈر منظور کرانے لگا۔ نتالی نادان اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ وہ اپنے خاوند کی فرمانبرداری کرتی رہی اور اسے اس وقت ہوش آیا جب وہ گناہ کی دلدل میں پھنس چکی تھی۔ خاوند نے اسے چھوڑ کر دوسری شادی کر لی اور نتالی وینس کے اوباش امراء اور عیاش سرکاری افسروں اور بعد میں مافیا کے آدمیوں کا کھلونا بن گئی۔"

نیگرو لڑکی ساشی رک رک کر سگریٹ کے کش بھی لگا رہی تھی۔ نتالی کی داستان الم مجھ پر بڑا اثر کر رہی تھی لیکن اب میں دل میں گھبرانے بھی لگا تھا کہ نتالی کے ساتھ کہیں میں بھی دلدل میں نہ پھنس جاؤں۔

ساشی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا:

"بس اتنی سی داستان ہے نتالی کی۔ یہ اٹلی کی ہر اس لڑکی کی کہانی ہے جو گاؤں سے شہر میں آتی ہے اور غلط ہاتھوں میں پڑ کر اپنی زندگی تباہ کر لیتی ہے۔ میں تمہارے لئے کافی بناتی ہوں۔ شاید باہر بارش شروع ہو گئی ہے۔"

وہ چولہے کے پاس کھڑی ہو کر کافی بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتی جاتی تھی۔

"کیا تم اس کی مدد کرو گے؟"

ساشی نے مجھ سے سوال کیا۔ میں خاموش رہا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

میں نے کہا:

"میں نتالی کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر تم کو تو معلوم ہی ہے کہ پارما کلب کا ایک معمولی ویٹر ہوں اور اس ملک میں اجنبی ہوں۔"

ساشی خاموشی سے کافی بناتی رہی۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں میں کافی کا ایک ایک مگ لئے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔

"تم نتالی کی مدد کرو چاہے نہ کرو۔ یہ تمہیں اختیار ہے۔ مگر میں ایک بات تمہیں ضرور بتانا چاہتی ہوں۔"

میں ساشی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"نتالی تم سے محبت کرتی ہے۔"

میرا سر مزید فخر سے بلند ہو گیا۔ بس مرد کی یہی کمزوری اسے لے ڈوبتی ہے۔ اگر کسی مرد کی بیوی یا کوئی شریفانہ ماحول میں رہنے والی لڑکی یہ کہے

کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں تو یہ بڑی خوش آئند بات ہوتی ہے اور اس سے مرد کی شرافت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جب کوئی نیم طوائف یا پوری طوائف یا کلب ڈانسر لڑکی یہ کہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں تو مرد کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ ایک کان سے سنے اور دوسرے کان سے نکال دے۔ اور اگر ایسا نہ کر سکے اور جذبات میں بہہ جائے تو اس پر لازم ہے کہ جس راستے پر وہ چل رہا ہے' اس کو چھوڑ دے اور وہاں سے فرار ہو جائے۔ یہ نصیحت میں آپ کو اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے اور یوں سمجھ لیں کہ میں ذلت و رسوائی اور ہلاکت کی گہرائیوں میں گرتے گرتے بچا ہوں۔ افسوس کہ اس وقت مجھے نصیحت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک سلیمان تھا جس کو میں نے یہ باتیں بتائی ہی نہیں تھیں۔ میں خود بھی جذبات کے ریلے میں بہہ رہا تھا۔ نتالی کے سنہری بالوں اور اس کے انداز دلربائی نے مجھ پر جیسے ایک سحر پھونک دیا تھا۔

جس وقت ساشی مجھے نتالی کی الم ناک کہانی سنا رہی تھی تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ مجھے اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہیے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے نتالی کا اداس چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا اور میں سب کچھ بھول کر اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا۔ جب نیگرو لڑکی ساشی نے کہا کہ نتالی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے تو میں نے اس سے پوچھا:

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے' میری تو اس سے صرف ایک ہی ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی سخت افراتفری کی حالت میں۔"

ساشی نے نتھنے مزید چوڑے کرتے ہوئے سگریٹ کا دھواں باہر نکالا اور میری طرف تھوڑا سا جھک کر کہنے لگی:

"ہم وینس کی ڈانسر لڑکیاں ایک گھنٹے کے لئے بھی محبت کرتی ہیں۔ ایک رات کے لئے بھی محبت کرتی ہیں۔ ہم ایک گھنٹہ جھوٹ بولتی ہیں۔ ساری رات جھوٹ بولتی ہیں۔ لیکن جب ہمیں کسی سے واقعی محبت ہو جاتی ہے تو پھر ہم سچی محبت کرتی ہیں اور اس محبت میں اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتیں۔ نتالی تم سے سچی محبت کرتی ہے۔ میں اسے دل کی گہرائیوں سے جانتی ہوں۔ اس وقت وہ مشکل میں ہے۔ اس کو یقین ہے کہ تم ہی اسکی مدد کر سکتے ہو۔ تمہارا فرض بنتا ہے کہ اسکی مدد کرو اور اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤ۔ اگر تم بھی بھاگ گئے تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں نتالی خودکشی کر لے گی۔ کیونکہ اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ ذہن سخت کشمکش میں تھا۔ کبھی خیال آتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹلی کے کسی دوسرے شہر میں چلا جاؤں۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں یہ بزدلی ہے۔ یہ عمل مردانگی کے خلاف ہے۔ بہادر بنو اور نتالی کی مدد کرو۔ کم از کم اس سے مل کر معلوم تو کرو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ کس قسم کی مدد کی اسے ضرورت ہے۔ میں نے ساشی سے کہا کہ مجھے نتالی کے پاس لے چلو۔

ساشی کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے گھٹنے کو اپنے ہاتھ سے دبایا اور خالی مگ لے کر چولہے کی طرف گئی۔

"نتالی سچ کہتی تھی کہ تم اسکی ضرور مدد کرو گے۔ میں ابھی تمہیں اس کے پاس لئے چلتی ہوں۔"

"وہ کہاں رہتی ہے؟"۔ میں نے سوال کیا۔

نیگرو لڑکی میری طرف دیکھ کر بولی:

"میں تمہیں وہ جگہ نہیں بتا سکتی۔ تمہیں وہاں لے چلوں گی۔"

جب وہ مجھے لے کر اپنے مکان سے باہر نکلی تو بارش تھم چکی تھی۔ اس کے دالان کا فرش جو گلی کی نہر کی سیڑھیوں تک چلا گیا تھا، گیلا تھا۔ ساشی نے کالے گرم اوور کوٹ کے اوپر کالی بیرٹ کیپ پہن رکھی تھی۔ ایک گنڈولا پاس سے گذرا تو ہم اس میں بیٹھ کر ڈاک یارڈ تک آئے۔ سرد برفانی ہوا چل رہی تھی مگر میری اونی ٹوپی اور فوم کی جیکٹ نے مجھے سردی سے بچا رکھا تھا۔ ساشی نے ہاتھ دے کر ایک ٹیکسی روکی۔ ٹیکسی کو اس نے کسی علاقے کا نام دے کر چلنے کو کہا۔ ٹیکسی وینس کی گیلی سڑکوں پر چل پڑی۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر ایک دوسرے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ مشرقی ملکوں میں اگر ہم کسی عورت کے ساتھ لگ کر ٹیکسی میں بیٹھے ہوں تو دونوں کی نفسیات پر اثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ہماری آب و ہوا میں ایک قدرتی بات ہے اور پھر اس کے پیچھے عورت سے دور دور رہنے کا اثر بھی ہے۔ اور ہمارے دین کی تعلیمات بھی یہی ہیں۔ لیکن یورپ وغیرہ میں ایسی بات نہیں ہے۔ وہاں مرد اور عورت اگر گاڑی میں بالکل ساتھ لگ کر بھی بیٹھے ہوں تو ان کی نفسیات میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایسے ہی بیٹھے رہتے ہیں جس طرح دو مرد ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوں۔ یہ نتیجہ ہے مغربی ماحول میں صدیوں سے عورت مرد کے آزادانہ میل جول اور ان کے سرد موسم کا۔ شروع شروع میں یہاں آکر جب بس میں یا ٹرین میں یا کسی سینما گھر میں کوئی عورت میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی ہوتی تھی تو مجھ پر شدید رد عمل شروع ہو جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ عورت پر بھی اسکا اثر ہو رہا ہو گا۔ چنانچہ ایک بار میں نے سینما ہاؤس میں عورت کے ساتھ لگ کر بیٹھے بیٹھے کمینگی سے کام لیتے

ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عورت نے ذرا سا چونک کر میری طرف دیکھا اور بڑی ہمدردانہ لہجے میں پوچھا:

"کیا تم بیمار ہو؟ مجھے تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگتے۔"

مجھے سخت ندامت ہوئی اور پسینہ آگیا۔ میں نے جلدی سے سوری کہہ کر ہاتھ پیچھے ہٹالیا تھا۔ تب مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہاں اس قسم کی حرکت کو سخت بدتمیزی اور بیمار ذہن کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ٹیکسی میں نیگرو لڑکی ساشی میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ مجھے اس کے جسم کی حرارت اس کے گرم اوور کوٹ میں سے نکل کر اپنے جسم میں جذب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ نیگرو لڑکی پر میرے جسم کے لمس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ یہ ایک صحت مندانہ رویہ تھا جو مجھے بڑا اچھا لگا تھا۔

ٹیکسی وینس شہر کی گنجان آبادی سے نکل کر پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئی تھی۔ آسمان اسی طرح ابر آلود تھا۔ مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔

ایک بڑی سڑک سے اتر کر گاڑی چھوٹی سڑک پر آگئی۔ یہ سڑک ایک ٹیلے کے گرد چکر کاٹ کر دوسری طرف گئی تو وہاں نشیب میں اونچے اونچے درخت تھے اور کوئی مکان نہیں تھا۔ ساشی نے یہاں ٹیکسی رکوالی اور ڈرائیور کو ٹھہرنے کو کہا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر بائیں طرف پہاڑی پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ یہاں بڑے اونچے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ ان درختوں کی شاخوں سے بارش کا رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔ ہم ڈھلان پر تھوڑی دور گئے تو سامنے نشیب میں ایک کھلی جگہ پر درختوں کے نیچے ایک کاٹج کے باہر کار کھڑی تھی۔ جیسے ہی ساشی کی نظر اس کار پر پڑی اس نے جلدی سے مجھے بازو سے پکڑا اور

اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی ایک درخت کے پیچھے آگئی۔

"کیاہوا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"شی!" ساشی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ کرایا۔

"یہ مارکو کی گاڑی ہے۔ بہت برا ہوا۔ وہ لوگ نتالی کو تلاش کرتے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے اسکا ڈر تھا۔"

ساشی نے گہرا سانس لیا اور آہستہ سے کہا:

"ہمارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

وہ میرا بازو ابھی تک پکڑے ہوئے تھی۔ وہ واپس مڑنے ہی والی تھی کہ درختوں کے نیچے سے جو پرانا سا کاٹج بنا ہوا تھا' اس کا دروازہ کسی نے اندر سے لات مار کر کھولا اور پھر میری آنکھوں نے ایک دردناک منظر دیکھا۔ دو ہٹے کٹے آدمی نتالی کو گھسیٹتے ہوئے کاٹج سے باہر لا رہے تھے۔ نتالی چیخ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ مگر ان آدمیوں پر اس کی آہ و زاری کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اسے اسی طرح گھسیٹتے ہوئے کار کے پاس لائے۔ ایک آدمی نے زور سے نتالی کے چہرے پر گھونسا مارا۔ نتالی کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ میرے ساتھ کھڑی ساشی نے دبی زبان میں انتہائی غصے کے ساتھ اس آدمی کو گالی دی اور میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اتنی دیر میں دوسرے آدمی نے پستول نکال لیا تھا۔ انہوں نے نیم بے ہوش نتالیا کو گاڑی میں ڈال کر دروازہ زور سے بند کیا اور گاڑی سٹارٹ کر کے اسے تیزی سے درختوں میں سے نکال کر لے گئے۔

"اب یہاں رکنا بیکار ہے۔"

یہ کہہ کر ساشی واپس چل پڑی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ میں نے

پوچھا کہ یہ لوگ نتالی کو کہاں لے گئے ہیں؟ ساشی نے ان لوگوں کو گالی دی اور کہا:

"وہ لوگ اسے کسی تہہ خانے میں بند کر دیں گے' اسے طرح طرح کی اذیتیں دیں گے یہاں تک کہ نتالی ان کے لئے کام کرنے پر تیار ہو جائے گی۔"

"وہ نتالی سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟"

ساشی نے کہا:

"یہ جرائم پیشہ لوگوں کا بہت بڑا گینگ ہے' یہ لوگ ارب پتی تاجروں اور سیاسی لیڈروں سے معاوضہ لے کر ان کے حریفوں کو قتل کروا دیتے ہیں۔ اس گھناؤنے جرم کے لئے خوبصورت لڑکیوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں پارٹیوں میں بیش قیمت لباس پہن کر شامل ہوتی ہیں اور بڑی ہوشیاری سے جس شخص کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے' اس کے جام میں انتہائی زہریلا اور بے ذائقہ بے رنگ محلول ملا دیتی ہیں۔ یا پھر اس شخص کے بیڈ روم میں بم لگا آتی ہیں۔ نتالی چونکہ گروہ کی تمام لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے اور بڑی اچھی گفتگو کر لیتی ہے' اس لئے یہ لوگ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

ہماری ٹیکسی چھوٹی سڑک کے کنارے درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ ہم ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ ساشی نے ڈرائیور سے واپس چلنے کو کہا۔ وہ نتالی کے لئے پریشان تھی۔ اس کے چہرے سے اس کے دل کی بات صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ میں خود نتالی کے بارے میں اداس سا ہو رہا تھا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ گاڑی پہاڑی سڑک پر واپس جا رہی تھی۔

اچانک ساشی نے میری طرف گردن موڑ کر دیکھا اور بولی:

"کیا تم نتالی کی مدد نہیں کرو گے؟ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جو گناہ کی دلدل سے نکل کر شریف عورت کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔"

میرے لئے یہ ایک پریشان کر دینے والا سوال تھا۔ میں اگر چاہتا بھی تو نتالی کی کس طرح مدد کر سکتا تھا۔ میں نے کہا:

"اب وہ جرائم پیشہ لوگوں کے قبضے میں ہے اور تم نے خود کہا تھا کہ میں یہاں اجنبی ہوں اور یہ قاتل قسم کے لوگ ہیں۔ میں ان کے ہتھکنڈوں سے بالکل ہی واقف نہیں ہوں۔"

ساشی نے کہا:

"چونکہ اس گروہ کے لوگ تمہاری شکل سے واقف نہیں ہیں' اس لئے تم بہتر طریقے سے نتالی کی مدد کر سکتے ہو۔ اس وقت اگر ہم نے نتالی کی مدد نہ کی تو یہ لوگ اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیں گے۔ اور پھر نتالی تم سے محبت کرتی ہے۔ اسے خدا جانے کیسے یہ یقین ہو گیا ہے کہ تم اس کی مدد کرو گے۔"

میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ میں نتالی کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں خواہ مخواہ بیچ میں آ کر مارا نہ جاؤں۔ مجھے زندہ رہنا تھا۔ میں واپس لاہور جا کر اپنے دوستوں کو وینس کی سیاحت کے مزے دار قصے سنانا چاہتا تھا۔ ساشی بولی:

"تم اکیلے نہیں ہو گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ بس ایک بار اگر ہم اسے ان بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑا لیں تو پھر میں نتالی کا ایسا انتظام کر دوں گی کہ وہ ان غنڈوں کے چنگل سے ہمیشہ کے لئے نکل جائے گی۔"

میں کہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جانے کیوں میں نے کہہ دیا:

"مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

ساشی نے میرا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ اور بڑی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا:

"میں جانتی تھی کہ تم نتالی کی ضرور مدد کرو گے۔ تم مشرقی لوگ بڑے بہادر اور محبت کرنے والے لوگ ہو۔ تم میرے فلیٹ پر چلو۔ وہاں جاکر میں تمہیں سارا پروگرام سمجھادوں گی کہ ہمیں نتالی کو رہا کرانے کے لئے کیا کرنا ہو گا؟"

میں غیر ارادی طور پر اس معاملے میں پھنس گیا تھا۔ اب انکار کرنا اور پیچھے ہٹنا شان مردانگی کے خلاف تھا۔

ساشی مجھے اپنے اسی نیم روشن بوسیدہ فلیٹ میں لے آئی۔ اس نے کافی بنائی۔ ایک طرف کو جھکے ہوئے پرانے فریج میں سے ٹھنڈے برگر نکال کر گرم کئے اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا:

"مافیا کے لوگ نتالی کو دو جگہوں پر رکھ سکتے ہیں۔ اتنا مجھے معلوم ہے اور نتالی نے بھی ایک بار مجھے بتادیا تھا۔ ایک جگہ تو وینس کے گینگ لیڈر بدمعاش مارکو کا بنگلہ ہے جس کے نیچے انڈر گراؤنڈ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ نتالی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ کمرے صرف عیاشی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ دوسری جگہ شمال میں سمندر میں ایک چھوٹا ویران جزیرہ ہے۔ یہاں مارکو نے ایک فارم بنایا ہوا ہے' اس فارم میں ایک عقوبت خانہ ہے جہاں اغوا شدہ لوگوں کو قید میں رکھا جاتا ہے اور نتالی کی طرح جو لڑکیاں گناہ کی دلدل سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں' انہیں اذیتیں دی جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نتالی کو اسی

ویران جزیرے میں رکھا گیا ہے۔ ہمیں اسے وہاں سے نکالنا ہو گا۔ بس یہی وہ مدد ہے جو تم میرے ساتھ مل کر و گے اور جس کی نتالی نے تم سے امید وابستہ کر رکھی ہے۔"

نہ جانے کیوں اور کس جذبے کے تحت میں نے حامی بھر لی کہ میں نتالی کو بد معاشوں کی قید سے نکالنے کے لئے ساشی کی مدد کروں گا۔ نیگرو لڑکی نے بے اختیار میرا ماتھا چوم لیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب میں تمہیں سارا پروگرام سمجھاتی ہوں کہ ہمیں کیا کرنا ہو گا۔"

پروگرام یہ تھا کہ ہم آج رات کلب سے فارغ ہو کر سیدھا ویران جزیرے میں جائیں گے اور نتالی کو وہاں سے نکال کر لانے کی کوشش کریں گے۔ کہنے کو تو یہ بڑا مختصر سا پروگرام تھا مگر اس کی راہ میں کئی ایک رکاوٹیں تھیں اور ہر قدم پر موت نظر آ رہی تھی۔ لیکن چونکہ میں تیار ہو گیا تھا' اس لئے میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ ہو جائے' ایک بار تو نتالی کو رہا کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔

ساشی نے کہا:

"میرے پاس اپنا ایک آٹو میٹک ریوالور ہے' تمہارے لئے ایک ریوالور کا انتظام بھی کر لوں گی۔ ہم کوئی تربیت یافتہ کمانڈو نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی ہمت اور اعتماد کے بھروسے پر جزیرے میں داخل ہونا ہو گا۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم نتالی کو اپنے ساتھ لے آئیں گے۔"

"ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ وہ جگہ کہاں ہے جہاں نتالی کو بند کیا گیا ہے؟"

ساشی نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا:

"نتالی نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ بد معاش مارکو کے فارم کے جنوب میں سمندر کے کنارے بالکل ساتھ ساتھ دو اونچی چٹانیں ہیں' ان چٹانوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا گودام ہے۔ اسی گودام کے نیچے عقوبت خانہ ہے۔"

میں نے کہا: "اس کے لئے ہمیں اپنی کشتی کا انتظام کرنا ہو گا۔ کیا تم کشتی چلا سکتی ہو؟"

ساشی نے کہا: "میں کالج کے زمانے میں کشتی رانی کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی ہوں' ہم ایک کشتی کرائے پر لے لیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں شام تک اسکا پورا انتظام کر لوں گی۔ یہ بتاؤ تمہیں تیرنا آتا ہے کیونکہ حالات کوئی بھی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ میں تیرنا جانتا ہوں مگر سمندر میں کبھی تیراکی نہیں کی۔ ساشی نے سگریٹ سلگا کر کہا:

"سمندر میں تیرنا سب سے آسان ہوتا ہے کیونکہ سمندر کا پانی ایک تو بھاری ہوتا ہے' دوسرے وہ تیرنے والے کو نیچے سے اوپر اٹھائے رکھتا ہے۔"

میں دوپہر کے بعد تک ساشی کے فلیٹ میں ہی رہا۔ ساشی نے وہیں تھوڑا بہت کھانا بنا لیا۔ ہم نے مل کر کھایا۔ میں نے کہا: "اگر موسم خراب ہو گیا۔ میرا مطلب ہے اگر بارش شروع ہو گئی تو...."

ساشی نے مسکرا کر کہا: "بارش ہونے لگی تو ہمارا مشن مزید آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ بارش اور سردی میں پہرے دار بھی کہیں گرم ہو کر سو رہا ہو گا۔"

دوپہر کے بعد میں واپس اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ سلیمان کھانا بنا رہا

تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا: "آج کل تم کچھ زیادہ ہی سیر سپاٹا کرنے لگے ہو۔ اگر کوئی خاص بات ہوگئی ہے تو مجھے بتادو۔ میرا مشورہ تمہارے لئے بڑا مفید ہو گا۔"

میں نتالی مشن کے بارے میں سلیمان کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ سلیمان عام سوجھ بوجھ کا آدمی ہے اور مجھے کوئی مفید مشورہ نہیں دے سکے گا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے نصیحتیں کرنے لگے کہ تم ایک ڈانسر لڑکی کی خاطر اپنی جان کیوں خطرے میں ڈال رہے ہو۔ چونکہ میں نے سفر نامہ لکھتے وقت آپ سے عہد کیا تھا کہ میں جو کچھ لکھوں گا' سچ لکھوں گا۔ سچ بولوں گا اور آپ سے اپنی کمزوریاں بالکل نہیں چھپاؤں گا۔ اس لئے میں اب اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں دل ہی دل میں سنہری بالوں والی لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ یہ محبت کیا تھی؟ خراب محبت تھی یا پاک محبت تھی؟ اس سلسلے میں مجھے خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں خود بھی نتالی سے اپنی محبت کو کسی خانے میں نہیں ڈال سکا تھا۔ بس محبت تھی' جیسی محبت ایک نوجوان لڑکا کسی نوجوان خوبصورت لڑکی سے کرتا ہے۔

کھانا میں ساشی کے ساتھ کھا کر آیا تھا۔ سلیمان سے میں نے کہہ دیا کہ میں نے ایک ریستوران میں کھانا کھالیا تھا۔ وہ ہنس کر بولا: "بڑے لیرے آگئے ہیں تمہارے پاس۔ اس طرح تم بہت جلد قلاش ہو جاؤ گے۔ میرے ساتھ کھا لیا کرو۔ میں کوئی تم سے پیسے لیتا ہوں؟"

میں نے اس مہربانی کے لئے سلیمان کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ دوپہر کا کھانا میں اسی کے ساتھ کھایا کروں گا۔ اس کے بعد میں سو گیا اور شام تک سویا رہا۔ جب جاگا تو سلیمان چابی کارنس پر رکھ کر جا چکا تھا۔

میں نے اٹھ کر کافی بنائی اور نتالی مشن کے بارے میں سوچنا

شروع کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خطرناک مشن تھا۔ اور اس میں پستولیں، بندوقیں بھی چل سکتی تھیں۔ لیکن اس میں ایک ایڈونچر بھی تھا۔ میں نے اس قسم کے ایڈونچرس مشن کی کئی کہانیاں ڈائجسٹوں میں پڑھ رکھی تھیں۔ میں اپنے آپ کو ایسی ہی ایک کہانی کا ہیرو سمجھنے لگا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر اسکاکش لگایا اور دل میں کہا:

"میں ایک مصیبت زدہ لڑکی کی مدد کرنے جارہا ہوں۔ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جو گناہ کی آلودگی سے نجات حاصل کر کے شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ خدا ضرور ہماری مدد کرے گا۔"

رات ہوگئی تو میں منہ ہاتھ دھو کر اپنے کلب کی طرف روانہ ہو گیا۔ کلب میں جاکر بروٹو کو شکل دکھا کر حاضری لگائی۔ وردی پہنی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کلب کا ہال کمرہ روزانہ کی طرح لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ فلور پر ڈانس جاری تھا۔ ان میں نیگرو لڑکی ساشی بھی نیم عریاں کاسٹیوم میں ڈانس کر رہی تھی۔ میں فلور کے قریب لگی ہوئی میزوں کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ اس دوران ساشی نے ڈانس کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور سر کو اثبات کے انداز میں ہلاتے ہوئے تھوڑا سا مسکرائی اور ڈانس کرتے ہوئے دوسری طرف لہرا گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے آدھی رات کے بعد شروع ہونے والے نتالی مشن کے لئے سارا انتظام کر لیا ہے۔

رات کے دس بجے میں نے بار روم کے پیچھے لگے کاؤنٹر کے قریب میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے لئے ہمیں صرف بیس منٹ ملتے تھے۔ میں نے دس منٹ میں ہی کھانا کھالیا۔ کھانا ہماری طرح کا نہیں ہوتا تھا کہ چاولوں کی پلیٹ بھری ہوئی ہے اور ہم اوپر گونگلو ڈال کر کھائے جارہے ہیں۔ وہاں تو

فاسٹ فوڈ تھی۔ مرغی کی ایک ٹانگ، دو ٹماٹر، آلو کے تین چار قتلے اور ڈبل روٹی۔ ہمارے گھروں میں تو ڈبل روٹی بیماروں کو کھلائی جاتی ہے مگر وہاں رات کو بھی مجھے ڈبل روٹی کے ساتھ سالن لگا لگا کر کھانا پڑتا تھا۔ کھانا کھا کر میں نے سگریٹ لگالیا اور اٹھ کر یونہی ٹہلتا ٹہلتا اس کاریڈور کی طرف نکل گیا جہاں ڈانسر لڑکیوں کے ڈریسنگ روم تھے۔

دل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ شائد نیگرو لڑکی ساشی سے وہاں ملاقات ہو جائے اور اس سے رات کے مشن کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم کروں۔ میں ایک ڈریسنگ روم کے قریب سے گذرا تو اسکا دروازہ کھلا۔ ایک سرخ و سفید خوبصورت ڈانسر مسکراتی ہوئی باہر نکلی اور میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی ہائے سینور کہتی گذر گئی۔ بڑی طلسمی خوشبو اس کے ساتھ ساتھ چلی جارہی تھی۔ میں واپس مڑنے لگا تو اچانک کاریڈور کی مدھم روشنی میں سامنے سے ساشی آتی نظر آئی۔ میں وہیں رک گیا۔ اس نے ہاتھ سے مجھے دوسرے نمبر کے ڈریسنگ روم میں چلنے کا اشارہ کیا۔ میں دوسرے نمبر کے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ میرے پیچھے پیچھے ساشی بھی آگئی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کیا اور قریب آکر کہنے لگی:

"سب ٹھیک ہے۔ تمہارے لئے ایک ریوالور بھی میں ساتھ لے آئی ہوں۔"

پھر اس نے دیوار کے ساتھ لگی الماری کے ایک خانے میں چابی لگا کر اسے کھولا۔ اپنا پرس نکالا۔ اس میں دو ریوالور پڑے تھے۔

"یہ تمہارا ریوالور ہے۔ تمہیں ریوالور چلانا آتا ہے نا؟"

میں نے ریوالور صرف ایک بار ہی لاہور میں چلایا تھا۔ ایک بار بسنت کے تہوار پر میں پتنگیں اڑانے اپنے ایک دوست کے گھر بھاٹی گیٹ گیا تھا اور وہاں جب ہم نے اپنے حریف کی پتنگ کاٹی تھی تو ریوالور کی فائرنگ کی تھی۔ میں نے ساشی سے کہا:

"ہاں۔ مگر مجھے نشانہ وغیرہ لگانے کا تجربہ نہیں ہے۔"

ساشی نے پرس بند کر کے الماری کے خانے کو بند کیا۔ اسے چابی لگاتے ہوئے بولی:

"ریوالور کا نشانہ نہیں لگاتے۔ صرف دشمن کو ڈرانے کے لئے چلاتے ہیں۔ ہم بھی ایسا ہی کریں گے اگر اسکا موقع ہوا تو۔ ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔"

"جزیرے پر جانے کے لئے کشتی کا بھی کوئی انتظام ضرور ہو گیا ہو گا۔"

ساشی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے جھکی اپنے چہرے پر پاؤڈر کا پف مار رہی تھی۔ کہنے لگی:

"ہو گیا ہے۔"

پھر میری طرف پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولی:

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میرے بھی وینس میں بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔"

میک اپ درست کرنے کے بعد ساشی میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی:

"تم کتنے بجے ڈیوٹی سے آف ہوتے ہو؟"

"رات تین بجے۔"

"ہوں۔" ساشی ٹشو پیپر اپنے ہونٹوں کے کنارے دباتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ تم ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی عقبی سڑک پر جو بس سٹاپ ہے' وہاں میرا انتظار کرنا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گی۔"

یہ کہہ کر ساشی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے بعد میں بھی ڈریسنگ روم سے نکل گیا۔ ڈنر کے بعد بار ٹینڈر بروٹو نے میری ڈیوٹی کونے میں جو میزیں لگی تھیں' اس طرف لگادی۔ اس کونے میں دیوار پر ایک سکرین لگی تھی جس پر نیم فحش فلموں کے وڈیو کیسٹ چوبیس گھنٹے چلتے رہتے تھے۔ شروع شروع میں میزوں کے گرد گھوم پھر کر گاہکوں کی سروس کرتے ہوئے کانی آنکھ سے اس سکرین کو دیکھ لیا کرتا۔ بریک کے وقت وہاں بیٹھ کر بھی یہ نیم فحش ڈانس دیکھتا۔ مگر پھر میرے لئے ان میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ بلکہ مجھے یہ نیم عریاں ڈانس مکروہ سے لگنے لگے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کہ واقعی عورت کا اصل حسن اس کی حیاداری اور حجاب میں ہے۔ بعد میں مجھے یورپ کے کئی ملکوں کی سیاحت کا موقع ملا اور میں نے وہاں کے ننگے کلب بھی دیکھے اور میں نے ان لوگوں میں رہ کر محسوس کیا کہ وہ لوگ خود اپنی عورتوں کی بے حجابی اور عریانی سے سخت نالاں اور پریشان ہیں۔

رات کے دو بج گئے تھے۔

کلب کی عریانیاں اور رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ فلور پر نئی ڈانسر لڑکیوں کا گروپ آگیا تھا۔ ساشی دوسری لڑکیوں کے ساتھ ڈریسنگ روم میں جاچکی تھی۔ اس گروپ کی رات کے دو بجے ڈیوٹی ختم ہوجاتی تھی۔ ساشی نے

مجھے بتایا تھا کہ جب ہم نیم عریاں کاسٹیوم میں فلور پر ڈانس کر رہی ہوتی ہیں تو ہمیں بالکل احساس نہیں ہوتا کہ ہمارے سامنے مرد بیٹھے ہیں۔ بس ہم کسی مشین کی طرح حرکت کر رہی ہوتی ہیں۔

پونے تین بجے تو میرے دل میں ایک قسم کی تشویش کا احساس بیدار ہونے لگا۔ خدا جانے وہاں جاکر کیسے حالات پیش آئیں' گولیاں تو ضرور چلیں گی۔ اچھا' کوئی پروا نہیں' میں بھی لاہور کا رہنے والا پنجابی ہوں۔ گولیاں چلتی ہیں تو چلیں۔ آمنے سامنے کا مقابلہ ہو گیا تو ایک آدھ کو تو میں بھی بھون کر رکھ دوں گا۔ پھر خیال آنے لگتا کہ یار پردیس کا معاملہ ہے' پولیس پکڑ کر لے گئی تو یہاں تو کوئی ضمانت بھی نہیں دے گا۔ اس وقت نتالی کا چہرہ میرے سامنے آجاتا اور میرے ذہن میں پیدا ہونے والے کمزور اور تشویش انگیز خیالات غائب ہو جاتے۔ کیونکہ میں نتالی سے محبت کرتا تھا اور دل سے چاہتا تھا کہ وہ بری سوسائٹی سے نکل کر اچھی شریف زندگی شروع کرے۔

ٹھیک تین بجے میں نے ٹرے بار کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بروٹو کو گڈ نائٹ کیا۔ وردی اتار کر اپنی جین اور فوم کی جیکٹ پہنی' سر پر اونی ٹوپی جمائی اور عقبی دروازے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا بس سٹاپ پر آگیا۔ بس سٹاپ خالی پڑا تھا۔ آسمان اسی طرح ابر آلود تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی اور خالی سڑک پر لیمپ پوسٹوں کی روشنی میں کاغذ اور پلاسٹک کے شاپر بیگ ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ سڑک پار کی بلڈنگوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی وقت کوئی گاڑی تیزی سے گذرتی تو اس خاموشی میں بھنور سے پڑتے محسوس ہوتے۔ میں بس سٹاپ کے اندر چھت کے نیچے پلاسٹک کے موٹے شیشے کی دیوار کے ساتھ لگا سڑک

کی دونوں جانب دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک ٹیکسی ہمارے کلب کے ساتھ والی گلی سے نکلی اور بس سٹاپ کے سامنے آکر رک گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کے اندر کی بتی جلادی۔ ہلکی روشنی میں مجھے ساشی نظر آئی۔ وہ کھڑکی میں سے ہاتھ باہر نکال کر مجھے چلے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں بھاگ کر ٹیکسی میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی آگے نکل گئی۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ کیونکہ ہم دونوں کو معلوم تھا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ ساشی کی کہنی میری جیکٹ میں گھسی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "دعا کرو بارش شروع ہو جائے۔" میں نے ہاتھ جیکٹ کی گرم جیبوں میں دے رکھے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بارش کی دعا کیوں کر رہی ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے دعا کی:

"یا اللہ! تو دلوں کا حال جانتا ہے' میری نیت نیک ہے۔ میری حفاظت کرنا۔"

ٹیکسی وینس کی خالی سڑکوں پر رات کی سردی میں پوری رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔ ٹیکسی کا ھیٹر زیادہ گرمی نہیں دے رہا تھا۔ ساشی نے اپنے اوور کوٹ کی جیب میں سے سٹیل کا پائنٹ نکالا۔ اس میں سے برانڈی کا ایک گھونٹ خود پیا اور پائنٹ میری طرف بڑھادیا۔ میں نے نفی میں سرہلایا تو اس نے اصرار کرنے کی بجائے پائنٹ جیب میں رکھ لیا۔ برانڈی یورپ کی قیامت خیز سردی کا جز سمجھا جاتا ہے اور یہ بات ہے بھی کسی حد تک درست۔ مگر میں اس وقت خدا کو یاد کر رہا تھا اور دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا۔ اس لئے برانڈی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

ٹیکسی کبھی بڑی سڑک سے گھوم کر چھوٹی سڑک پر آجاتی۔ کبھی چھوٹی سڑک سے نکل کر پھر کسی بڑی سڑک پر آجاتی۔ رہائشی بلڈنگوں کی قطار ختم ہوتی۔ وہ اونچی اونچی بڑے بڑے شیشوں والی عمارتیں شروع ہوجاتیں جن میں دفاتر قائم تھے۔ ان سب عمارتوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ٹیکسی وینس کے شمالی گنجان علاقے میں داخل ہوگئی۔ ایک شراب خانے کے باہر نشے

باہر نشے میں دھت ایک آدمی ہاتھ میں بوتل لئے کھڑا تھا۔ ٹیکسی کو آتے دیکھ کر وہ سڑک کے بیچ میں آگیا اور بوتل والا ہاتھ لہرا کر ٹیکسی کو روکنے کے اشارے کرنے لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے منہ ہی منہ میں اسے ایک ہلکی سی گالی دی اور گاڑی تیزی سے کاٹ کر آگے نکل گیا۔ ساشی میرے اوپر گر پڑی۔ اس نے بھی شرابی کو ہلکی سی گالی دی جو صرف میں ہی سن سکا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ کاش آگے کوئی دوسرا شرابی کھڑا ہو۔ وہ اسی طرح گاڑی روکنے کا اشارہ کرے' ڈرائیور تیزی سے گاڑی کو دوسری طرف کاٹے اور ساشی ایک بار پھر میرے اوپر گرے۔ اس وقت نفسانی خواہشات کا مجھ پر شدید اثر تھا۔ میں نے جلدی سے اس قسم کے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور خدا سے توبہ کر کے اپنے مشن کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگا۔

کافی دیر تک ٹیکسی وینس کی سرد یخ بستہ رات میں خالی سڑکوں پر چلتی رہی۔ پھر روشنیاں کم ہونے لگیں۔ اور دور سے سمندر میں بنی ہوئی عمارتوں کی روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ہم شہر کے شمالی سمندری علاقے میں داخل ہونے والے ہیں۔ ٹیکسی وینس کی نہری گلیوں والے علاقے کو بائیں جانب چھوڑ کر آگے نکل گئی۔ آگے اندھیرا تھا۔ صرف سڑک کے دونوں جانب روشنیاں تھیں۔ سمندر کی مرطوب ہوا صاف محسوس ہو رہی تھی۔ دور سمندر کے اندر کہیں کہیں کوئی روشنی جھلملاتی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں نے ساشی سے سرگوشی میں پوچھا:

"ابھی کتنی دور جانا ہے؟"

اس نے میری طرف کندھا جھکا کر کہا:

"ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔"

اس کے سانس میں برانڈی کی تیز بو تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا تو ساشی نے ڈرائیور کو ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اطالوی زبان میں کہا:

"اس بس سٹاپ کے پیچھے۔"

ٹیکسی ایک ویران سی بس سٹاپ کے پیچھے سڑک کے کنارے رک گئی۔ ہم ٹیکسی سے باہر نکل آئے۔ ساشی نے ڈرائیور کو میٹر دیکھ کر کرایہ ادا کیا۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ ساشی نے کہا:

"اگر سگریٹ پینا ہے تو یہاں لگالو۔"

مجھے سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگالیا۔ ایک سگریٹ ساشی نے بھی سلگالیا۔ میں نے جیکٹ کا زپ اوپر ٹھوڑی تک بند کیا ہوا تھا۔ ساشی نے بھی اوور کوٹ کے سارے بٹن بند کئے ہوئے تھے۔ اس نے وہی برٹش آرمی افسروں والی کالی بیرٹ کیپ پہن رکھی تھی۔ سرد ہوا میں تیزی آنے لگی تھی۔ ہم سڑک سے اتر کر ایک چھوٹی سڑک پر چل پڑے جس کی دونوں جانب اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہوا میں سمندری مچھلیوں کی بو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ساشی سے کشتی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی:

"کشتی ہمیں فش پورٹ پر تیار ملے گی۔"

ساشی نے چلتے چلتے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ریوالور نکال کر مجھے دیا اور کہا:

"اس میں بارہ گولیاں بھری ہوئی ہیں، سیفٹی کیچ لگا ہوا ہے۔ فائر کرنے کی نوبت آجائے تو سیفٹی کیچ ضرور اتار دینا۔ ورنہ گولی نہیں چلے گی۔"

میں نے ہنس کر کہا: "فکر نہ کرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ سیفٹی کیچ کیسے پیچھے کیا جاتا ہے۔ ریوالور کا فائر کئے مجھے ایک مدت ہو گئی تھی۔ آخر فائر میں نے لاہور کے بھاٹی دروازے کے ایک مکان کی چھت پر بسنت کے موقع پر کیا تھا۔ لیکن مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا کہ اگر مقابلہ ہو گیا تو میں انگریزی فلموں کے ہیرو کی طرح دھڑا دھڑ فائر کر دوں گا۔ کوئی پروا نہیں۔

مگر کسی وقت اچانک دل پر ایک خوف سا طاری ہو جاتا کہ یار کہیں مجھے گولی نہ لگ جائے۔ اگر کسی غنڈے کی گولی سیدھی میرے دل پر یا سر میں آکر لگی تو میں اسی وقت بے موت مارا جاؤں گا۔ پھر کیا ہو گا؟ مجھے تو ابھی لاہور واپس بھی جانا ہے جہاں میرے بھائی، بہنیں اور ماں میرا انتظار کر رہی ہے۔ انہیں تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میں مر چکا ہوں اور میری لاش لاوارث قرار دے کر وینس کے کسی پولیس سٹیشن کے پیچھے گڑھے میں دبا دی گئی ہے۔ یہ تصور میرے اندر کمزوری پیدا کر دیتا اور میرے قدم خود بخود آہستہ ہو جاتے۔ دوسرے لمحے طاقتور خیالات کی یلغار ہوتی اور میں اپنے آپ سے کہتا کہ یار بزدل نہ بنو۔ زندگی موت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ تم ایک لڑکی کو گناہ کی زندگی سے نجات دلا کر نیکی کی زندگی کی طرف لانے جا رہے ہو۔ یہ کوئی برا کام نہیں ہے۔ گھبراتے کیوں ہو؟ مرد بنو۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔

ساشی نے سگریٹ پھینک دیا اور سامنے دو تین جگہوں پر فاصلے فاصلے پر جو روشنیاں ہو رہی تھیں، ان کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"وہ فش مارکیٹ ہے۔ یہاں میں نے ایک کشتی کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ چپوؤں والی کشتی ہے، کیونکہ جزیرے پر جانے کے لئے ایسی ہی کشتی کی

ضرورت تھی۔ ورنہ وہاں کشتی کے انجن کا شور گارڈ کو ہوشیار کر سکتا ہے۔"

فش مارکیٹ میں مچھلیوں کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مارکیٹ بند تھی۔ ایک جگہ ایک ٹرک کھڑا تھا جس کا انجن چل رہا تھا۔ ساشی کہنے لگی:

"اس مارکیٹ سے شہر کے شمالی علاقے کو سی فوڈ سپلائی ہوتی ہے۔ یہ پہلا ٹرک آیا ہے۔ اس قسم کے دوسرے ٹرک بھی صبح ہونے سے پہلے یہاں قطار میں لگ جائیں گے۔ اس طرف آجاؤ۔"

ہم اونچی چھت والی خالی مارکیٹ کے سنگی فرش پر سے گذر کر دوسری طرف نشیب میں اتر گئے۔ یہاں پتھر ہی پتھر تھے۔ سمندری لہروں کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ مارکیٹ کی عقبی روشنی سمندر کے پانی میں جھلملا رہی تھی۔

زمین ریتلی تھی اور جگہ جگہ چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں ہم دیکھ دیکھ کر چل رہے تھے۔ ساشی میرا بازو پکڑ کر بائیں طرف گھوم گئی۔ یہاں ایک اونچا چبوترا بنا ہوا تھا۔ چبوترے کے ساتھ ہی مجھے اندھیرے میں ایک گنڈولا ٹائپ کی کشتی پانی میں اوپر نیچے ہوتی نظر آئی۔ اس کشتی پر مارکیٹ کی پچھلی دیوار کے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ ایک آدمی قریب ہی سٹول پر خوب گرم کپڑوں میں اپنے آپ کو لپیٹے منہ میں پائپ دبائے بیٹھا تھا۔ ساشی کو قریب آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے منہ سے پائپ نکال کر سٹول کے ساتھ جھاڑتے ہوئے کہا: "سینوریتا! واپسی پر اسی جگہ کشتی لگا دینا۔ باقی رقم مجھے ابھی دے دو۔"

ساشی نے جیب سے اسے کچھ نوٹ نکال کر دیئے۔ یہ ملاح تھا۔ اس نے نوٹ گنے اور یہ کہہ کر کھانستا ہوا چل دیا:

"کوئی گڑبڑ ہوئی تو میرا نام نہ لینا۔"

میں اور ساشی کشتی میں بیٹھ گئے۔ ساشی نے دونوں چپو سنبھالے اور بڑی مہارت کے ساتھ کشتی کو کنارے سے نکال کر کھلے سمندر کی طرف چل پڑی۔ کشتی پانی پر تھوڑے تھوڑے ہچکولے کھا رہی تھی۔ کیونکہ سمندر کی لہریں دور سے آ آ کر ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ سمندر میں سردی کی وجہ سے ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ میں نے کسی قدر تشویش مگر بظاہر بڑے نارمل لہجے میں ساشی سے پوچھا:

"مجھے تو سمندر میں کسی جزیرے کی روشنی نظر نہیں آ رہی۔"

ساشی کشتی کے چپو چلاتے ہوئے بولی:

"تھوڑی دیر بعد تمہیں اس کی روشنی نظر آ جائے گی۔ دھند کی وجہ سے ابھی دکھائی نہیں دیتی۔"

ویران جزیرے کی روشنی تو نظر نہیں آ رہی تھی مگر فش مارکیٹ کی روشنیاں ہم سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا اگر مجھے سمندر میں تیرنا پڑا تو میں تو سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہو جاؤں گا۔ یا اللہ! تیرا ہی آسرا ہے۔ کشتی اب سمندر کی پرسکون لہروں پر بہہ رہی تھی۔ ہمیں سمندر کی دھند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ دھند کا بادل سا تھا جو سمندر پر پھیلا ہوا تھا۔ جب دھند چھٹی تو دور مجھے ایک روشنی ستارے کی طرح جھلملاتی نظر آئی۔ ساشی نے کشتی چلاتے ہوئے کہا:

"اس روشنی کو دیکھ رہے ہو؟ وہی ویران جزیرہ ہے۔ یہ بدمعاش

مارکو کے فارم کی روشنی ہے۔"

"وہاں ساحل پر گارڈ ضرور ہوں گے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے وہاں جانا چاہئے۔"

ساشی نے کہا: "تم فکر نہ کرو۔ ہم کشتی کو پیچھے کی طرف سے لے جائیں گے۔ تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں؟" میں نے اپنی قدرتی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ساشی واقعی ایک مشاق کشتی چلانے والے کی طرح کشتی چلا رہی تھی۔ اس کا سانس تھوڑا تھوڑا پھول گیا تھا۔ کہنے لگی:

"میری جیب میں برانڈی کا پائنٹ لے لو۔ تم گرم ہو جاؤ گے۔ تمہیں اس وقت برانڈی کی ضرورت ہے۔"

واقعی میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے تھوڑی سی برانڈی کی ضرورت ہے۔ میں نے ساشی کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پائنٹ نکالا۔ اسکا ڈھکن کھولا اور منہ کے ساتھ لگا کر اوپر تلے دو تین گھونٹ برانڈی کے پی گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے اندر سیال آگ اتر گئی ہے۔ میں نے جلدی سے پائنٹ کو ڈھکن لگا کر اسے ساشی کی جیب میں ڈال دیا۔ دیکھتے دیکھتے برانڈی نے میرے کان، پھر دونوں ہاتھ اور پھر سارے جسم کو گرم کر دیا اور میرے خیالات میں ہمت، مردانگی اور جرات کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میرے دل میں تھوڑی دیر پہلے اپنے مشن کے باری میں جو تشویش اور ڈر تھا، وہ فوری طور پر ختم ہو گیا۔ اب میں ہر قسم کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار تھا۔ میں نے ساشی سے کہا:

"لاؤ اب میں کشتی کھیتا ہوں، تم تھک گئی ہو۔"

ساشی نے بغیر تکلف کئے چپوؤں کو چھوڑ دیا اور اٹھ کر میری جگہ پر آگئی۔ کشتی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس کے چلنے سے کشتی ڈولنے لگی اور میں گرتے گرتے بچا۔ ساشی نے مجھے سنبھال لیا اور بولی۔۔۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی:۔۔۔۔

"کہیں برانڈی زیادہ تو نہیں چڑھا گئے؟"

میں نے کہا: "صرف تین گھونٹ پئے ہیں۔"

ویران جزیرے میں بدمعاش مارکو کے فارم کی روشنی اب قریب آرہی تھی۔ مجھ سے کشتی ٹھیک طرح سے نہیں چل رہی تھی۔ ساشی نے چپو ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں لے لئے اور کشتی کو ویران جزیرے کی بائیں جانب لے جانے لگی۔ اس نے کہا:

"اب سگریٹ بالکل نہ جلانا۔ ہمیں صبح کی روشنی ہونے سے پہلے پہلے اپنا مشن مکمل کرلینا چاہئے۔ دن نکل آیا تو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

آسمان پر اندھیرا اور دھند سی پھیلی ہوئی تھی اور کوئی ستارہ نظر نہیں آتا تھا۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ لگ رہا تھا۔ کشتی کو ساشی بڑی مہارت سے چلاتی ہوئی جزیرے کے عقب میں لے آئی۔ اب ہمیں مارکو کے فارم کی اکلوتی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کشتی جیسے جیسے جزیرے کے عقبی ساحل کے قریب ہو رہی تھی، کنارے کے اونچے نیچے ٹیلوں کے ہیولے بھی ہمارے قریب آتے جارہے تھے۔ برانڈی نے مجھے گرم کر دیا تھا اور میرے حوصلے بھی بلند کر دئے تھے۔ میرے دل سے اس خطرناک مشن کا سارا خوف دور ہو چکا تھا۔ اب سمندر سے بھی مجھے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

ساشی کشتی کو اتنی احتیاط سے چلا رہی تھی کہ چپوؤں کی آواز بالکل پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اب ہم ساحل کے قریب آگئے تھے۔ یہاں اندھیرا تھا۔

نہیں ہوتی تھی۔ اب ہم ساحل کے قریب آگئے تھے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ ساشی نے دھیمی آواز میں ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"یہاں دو بلند چٹانیں ہیں، ہمیں وہیں جانا ہے۔"

کشتی ساحل کے ساتھ تھوڑا سا گھومی تو درختوں کے عقب میں اچانک دو بہت بڑی اور اونچی اونچی چٹانیں نظر آئیں۔ ان کے درمیان اندھیرے میں خلا سا تھا۔ اب ہماری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں اور تھوڑا بہت نظر آنے لگا تھا۔ ساشی نے جلدی سے کشتی ایک طرف کو گھمائی اور جہاں بلند درختوں کا جھنڈ تھا، وہاں کنارے پر لاکر کھڑی کر دی۔ سمندری موجوں کی چٹانیں سے ٹکرانے کی آواز، تیز ہوا، اندھیری سرد رات اور سامنے کھڑی دیو ہیکل چٹانیں۔ عجیب ڈراؤنا ماحول تھا۔

ہم دونوں نے مل کر کشتی کو ایک چھوٹی چٹان کی اوٹ میں لے جاکر پتھر کے ساتھ باندھا۔ اس وقت آسمان پر بادلوں میں ہلکی سی گرج سنائی دی اور پھوار سی پڑنی شروع ہوگئی۔ ساشی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے غور سے ایک طرف دیکھ رہی تھی۔ وہاں کسی طرف سے روشنی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے سرگوشی میں ساشی سے پوچھا کہ نتالی نے جس گودام کا ذکر کیا تھا، وہ کس طرف ہو گا؟ اس کے جواب میں ساشی نے آہستہ سے کہا:

"ریوالور جیب میں ہی رکھو مگر اسے اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لو۔"

میں نے سیدھا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈال کر ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ساشی مجھے اشارہ کرنے کے بعد اندھیرے میں ایک طرف ذرا جھک کر چلنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہاں کہیں کہیں

اونچی جھاڑیاں تھیں۔ ریتلی زمین پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے جن پر ہم بڑی احتیاط سے پاؤں رکھتے کہ آواز پیدا نہ ہو۔

ساشی ایک دم رک گئی۔ شاید اسے کوئی سراغ مل گیا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ مجھے اس کے سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے میرے بازو کو ہلانے کے بعد ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ مگر غور سے دیکھنے پر مجھے اندھیرے میں اونچی چار دیواری سی دکھائی دی۔ ساشی نے اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لاکر کہا:

"یہی وہ ٹریش گودام ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔"

وہ دبے پاؤں چلتی اندھیرے میں گم ہوگئی۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں خطرے کی بو سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جرائم پیشہ گروہ کے سربراہ مارکو کے فارم کی وہ روشنی جو ہمیں سمندر میں دور سے نظر آئی تھی، اب کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہ جزیرے کے جنوبی درختوں کی اوٹ میں آگئی تھی۔

اس وقت اپنے وطن پاکستان سے ہزاروں میل دور ایک دور افتادہ سمندر کے ویران جزیرے میں جرائم پیشہ لوگوں کے خطرناک ماحول میں رات کے وقت بیٹھے بیٹھے مجھے ایک دم سے لاہور کے گلی کوچے، موچی دروازہ اور میکلوڈ روڈ یاد آگئے۔ میں نے سوچا۔۔۔ کتنے خوش قسمت ہیں لاہور کے لوگ کہ آرام سے گھروں میں سو رہے ہوں گے یا نمازی نماز پڑھنے کے لئے بیدار ہوگئے ہوں۔ تھوڑی دیر میں لاہور کی مسجدوں سے اذان کی آوازیں بلند ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور درود شریف کا ورد شروع ہو جائے گا۔ ایک میں ہوں کہ موت کے منہ میں بیٹھا ہوں اور کوئی پتہ

نہیں آگے کیا ہونے والا ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایڈونچر بھی تو اسی طرح ہوتے ہیں۔ جن زندہ قوموں کے افراد نے نئے نئے ملک اور بر اعظم دریافت کئے تھے' اگر وہ بھی اسی طرح گھروں میں سوئے رہتے اور بھائی دروازے کے باہر دکان کے پھٹے پر بیٹھ کر چلغوزے کھاتے اور ایک دوسرے سے مذاق کرتے رہتے تو آج یورپ کے ملک خاص طور پر سپین' پرتگال' برطانیہ اور فرانس غریبی اور مفلسی کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوتے۔ جس شہر کی سرد رات کے پچھلے پہر میں سردی میں ٹھٹھرتا ہوا خطرناک حالات میں بیٹھا ہوں۔ وہ سیاح بھی اسی شہر کا رہنے والا تھا جس کا نام مارکو پولو تھا۔ یورپ' امریکہ کے لوگ تو اس بہادر سیاح کو خوب جانتے ہیں مگر ہمارے ملک کے نوجوان شاید یہی جانتے ہوں گے کہ مارکو پولو کسی پولو کے کھلاڑی کا نام ہو گا۔ بہت کم نوجوانوں کو معلوم ہو گا کہ اس نوجوان مارکو پولو نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کن کٹھن حالات میں وینس سے سمرقند اور پھر وہاں سے صحرائے گوبی کو کبھی پیدل اور کبھی خچر پر بیٹھ کر عبور کیا اور کیسی کیسی مصیبتیں سہتا' قدم قدم پر جان کی بازی لگاتا چین پہنچا۔ اور یوں اس نے اپنے وطن اٹلی کے لئے ایسی تجارتی راہیں کھول دیں کہ اٹلی کا ملک مالا مال ہو گیا اور ترقی کی شاہراہ پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اگر وہ بھی وینس کی گلیوں میں اٹلی کی لڑکیوں کا پیچھے کرتے ہوئے اپنی جوانی ضائع کر دیتا تو آج وینس کا شہر صنعتی اعتبار سے کہاں اتنی ترقی کر سکتا تھا۔ جو لوگ محنت کرتے ہیں' جن کے دل اپنے دین اور اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہوتے ہیں اور اس حب الوطنی کے جذبے میں ڈوب کر ترقی کی نئی نئی منزلیں دریافت کرتے ہیں' وہی اپنے وطن کا نام سربلند کرتے ہیں اور خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ

کرتے ہیں۔ میں لاہور کی گلیوں کے تصور میں گم تھا کہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

میں نے ریوالور جیب سے نکال کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اندھیرے میں مجھے ساشی کا ہیولا اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں بھی تھا۔ سرگوشی میں بولی:

"میں نے فارم کا ٹریش روم دیکھ لیا ہے' نتالی ضرور اسی عقوبت خانے میں قید ہوگی۔ وہاں دروازے کے باہر برآمدے میں ایک آدمی پہرہ دے رہا ہے۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا: "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

ساشی کہنے لگی: "اگر کسی طرح ہم اس شخص کو بے ہوش کر سکیں تو ہم گودام میں داخل ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا: "پہلے تو ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ نتالی اندر ہی ہے۔"

ساشی نے زور دے کر کہا: "مجھے پورا یقین ہے کہ نتالی اندر ہی قید ہے۔ ورنہ باہر گارڈ نہ بیٹھا ہوتا۔ اسے اس سرد اندھیری رات میں باہر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تو پھر اسے بے ہوش کس طرح کریں؟" میں نے ساشی سے پوچھا۔ وہ بولی:

"اسے گولی ماری تو فائر کی آواز پر سب ہوشیار ہو جائیں گے۔ ایک ہی طریقہ ہے کہ کسی طرح پیچھے سے آکر گارڈ کے سر پر بھاری پتھر کا وار کیا جائے' یہ کام میں نہیں کر سکتی' تم مرد ہو' تم کر سکتے ہو۔"

میں سہم سا گیا۔ میں نے سوچا اگر میرے پتھر مارنے سے یہ بدمعاش

بے ہوش نہ ہوا۔ یا میرے وار کرنے سے پہلے ہی وہ خبردار ہو گیا تو وہ تو فوراً مجھے دبوچ لے گا۔ ہو سکتا ہے مجھ پر فائر بھی کر دے۔ مجھ پر برانڈی کا جو اثر تھا، وہ اب تقریباً غائب ہو چکا تھا۔ مگر ساشی کے آگے میں انکار بھی نہ کر سکا۔ میں نے اتنا ضرور کہا کہ اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ گارڈ میرے قدموں کی آہٹ سن کر ہوشیار ہو جائے۔ اس کے پاس ضرور پستول وغیرہ بھی ہو گا۔ ساشی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر آہستہ سے جھنجھوڑا اور سرگوشی میں بولی:

"تم مرد ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو؟"

یہ میری مردانگی کی توہین تھی۔ میں نے گردن اٹھا کر کہا:

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ چلو مجھے موقع پر لے چلو۔"

ساشی اندھیرے میں چلتی مجھے گودام کے پیچھے لے آئی۔ اب ہم پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ اس نے اندھیرے میں ہی ایک طرف اشارہ کیا۔ اور میرے کان کے بالکل قریب ہونٹ لا کر سرگوشی کی: "دائیں جانب برآمدے میں گارڈ بیٹھا ہے۔ میرا خیال ہے اس نے گود میں شاٹ گن رکھی ہوئی ہے۔ تم کوئی پتھر اٹھا لو۔"

مجھ پر بڑا کٹھن وقت آن پڑا تھا۔ جو کام میں نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ مجھے کرنا پڑ رہا تھا۔ ساشی نے ہاتھ سے مجھے آگے کو دھکیلا اور خود وہیں بیٹھ گئی۔ بادلوں میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکی سی گرج سنائی دے جاتی تھی اور پھوار اسی طرح پڑ رہی تھی۔ ہوا بھی سرد اور تیز ہو گئی تھی۔ سمندر کی جانب سے موجوں کے چٹانوں سے ٹکرانے کی دھیمی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس خیال سے اپنے آپ کو حوصلہ دیا کہ میں ایک مظلوم لڑکی کی بہتری کے لئے یہ کام کر رہا ہوں۔ وہیں بیٹھ کر چلتے ہوئے میں نے ایک بڑا سا گول پتھر اٹھا لیا۔ یہ پتھر اگر میں پوری طاقت سے پہرہ دینے والے بدمعاش

اٹھالیا۔ یہ پتھر اگر میں پوری طاقت سے پہرہ دینے والے بدمعاش کے سر پر پیچھے سے آکر ماروں تو وہ بے ہوش ضرور ہوجائے گا۔ ہوسکتا ہے مر بھی جائے۔ ساشی نے بتایا تھا کہ گارڈ نے سر پر کوئی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ میں نے خدا کا نام لیا اور گودام کی دیوار کے ساتھ ساتھ جوں کی چال چلتا ہوا دوسری طرف آگیا۔

دیوار کے کونے میں سے میں نے سر ذرا سا باہر نکال کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک انسانی ہیولا مجھے نظر آیا جو برآمدے میں لکڑی کے ستون کے ساتھ لگ کر شاید کرسی یا کسی سٹول پر بیٹھا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس نے اپنا سر ستون کے ساتھ لگا رکھا ہے۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یہ بدمعاش سو رہا ہو یا کم از کم اونگھ ہی رہا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے اتنا نظر آگیا کہ گارڈ کے پیچھے برآمدے میں کافی جگہ تھی۔ مجھے دبے پاؤں اس جگہ پر سے گذر کر گارڈ کے پیچھے پہنچنا تھا۔ یہ بڑا خطرناک کام تھا۔ اگر وہ جاگ رہا ہے تو برآمدے میں میرے قدموں کی آہٹ پر چونک سکتا ہے۔ میں دس پندرہ سیکنڈ تک وہیں کھڑا گارڈ کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ستون کے ساتھ سر لگائے بے حس بیٹھا ہے اور کوئی حرکت نہیں کر رہا۔

میرے پاؤں میں جوگر شوز تھے جن کی آواز پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور پتھر ہاتھوں میں لئے برآمدے پر چڑھ گیا جو زمین سے تین فٹ بلند تھا۔ برآمدے کے لکڑی کے فرش پر آتے ہی میں وہیں سانس روک کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح پہرے دار کے ہیولے پر جمی ہوئی تھیں۔ واقعی وہ کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ اس نے لمبا کوٹ پہن

رکھا تھا۔ جو سٹول سے نیچے بر آمدے کے فرش تک آیا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے جہاں ساشی کے بقول یقیناً شاٹ گن رکھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ صبح ہوگئی اور روشنی پھیلنے لگی تو ہمارا مشن ناکام ہی نہیں ہو گا بلکہ ہم بھی پکڑے جائیں گے اور ہمیں وہیں شوٹ کر دیا جائے گا۔ ہمیں اس لئے بھی وقت مل رہا تھا کہ یورپ میں سردیوں کے موسم میں سورج دیر سے طلوع ہوتا ہے یعنی چھ سات بجے رات کا اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم مزید وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے بر آمدے کے فرش پر بیٹھ کر آگے گھسٹنا شروع کر دیا۔ تین چار سیر کا پتھر میرے دونوں ہاتھوں میں تھا۔

جیسے جیسے میں اونگھتے ہوئے' سوئے ہوئے یا جاگتے ہوتے پہرے دار کے قریب ہو رہا تھا' مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں موت کے قریب ہو رہا ہوں۔ میں کوئی تربیت یافتہ کمانڈو نہیں تھا کہ بڑی مہارت سے سانپ کی طرح رینگتا ہوا ٹارگٹ پر جا پہنچتا اور چیتے کی طرح اچھل کر پہرے دار کی گردن میں بازو ڈال کر تربیت کے مطابق ایک ہی جھٹکے میں گردن کا منکا توڑ ڈالتا۔ میں تو لاہور کا رہنے والا ایک نارمل نوجوان تھا۔ اپنے ٹارگٹ کی طرف بھی بڑھ رہا تھا اور ڈر بھی رہا تھا۔ میرا سانس خوف کے مارے پھول گیا تھا حالانکہ میں جوں سے بھی کم رفتار کے ساتھ فرش پر گھسٹ رہا تھا۔ مگر اس وقت میرے حواس ضرور بیدار تھے اور دل میں یہ خیال حاوی ہو چکا تھا کہ اگر میں ذرا سا بھی چوک گیا تو پھر میری موت یقینی ہے۔ کیونکہ ریوالور میری جیکٹ کی جیب میں تھا اور میں اسے اتنی پھرتی سے نہیں نکال سکتا تھا جس پھرتی سے کمانڈو ٹائپ کی فلموں کے ہیرو پستول نکال لیتے ہیں۔ میں تو بالکل آپ لوگوں کی طرح سیدھا

سادا بندہ تھا۔ بس کسی نہ کسی وجہ سے اس مشکل میں پھنس گیا تھا۔ بلکہ اب تو میں موت کے منہ میں آچکا تھا۔

اچانک پہرے دار نے گہرا سانس لیا اور سٹول پر پہلو بدلا۔ میں تو وہیں سن ہو کر فرش کے ساتھ لگ گیا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ خطرہ تھا کہ کہیں پہرے دار میرے دل کی دھڑکن نہ سن لے۔ پہرے دار نے پہلو بدل کر اپنا سر ستون کے ساتھ لگا دیا۔ میں پتھر کی طرح فرش پر جہاں پڑا تھا' وہیں پڑا رہا۔ ایک پتھر میں بن چکا تھا اور دوسرا پتھر میں نے ہتھیلیوں میں تھام کر ہتھیلیاں فرش کے ساتھ لگا رکھی تھیں۔ میری خوش قسمتی اور پہرے دار کی بد قسمتی سے مجھے اس کے ہلکے سے خراٹے کی آواز سنائی دی۔ میں شیر بن گیا۔ پہرے دار سو رہا تھا۔ میں تیزی سے گھسٹتا ہوا سٹول کے قریب گیا اور جس پھرتی کا میں نے مظاہرہ کیا' اس پر آج بھی جب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔ میں سٹول کے پیچھے آتے ہی ایک دم سے اٹھا اور دونوں ہاتھوں میں پتھر لے کر پوری طاقت سے اس کے سر پر مار دیا۔ میں نے گھبراہٹ میں اتنی زور سے پتھر مارا کہ پہرے دار بھی سٹول سے نیچے گر پڑا اور اس کے ساتھ میں بھی فرش پر گر پڑا۔ تب میں نے اپنی جان بچانے کے واسطے جلدی سے جیکٹ میں سے ریوالور نکال لیا۔ میں نے وہیں فرش پر بیٹھے بیٹھے اپنی نظریں پہرے دار پر جما دیں۔ وہ بے حس پڑا تھا۔ مجھے حوصلہ ہوا۔ اٹھ کر پہلا کام یہ کیا کہ اس کے گھٹنوں پر سے نکل کر جو شاٹ گن نیچے گر پڑی تھی' اسے اٹھایا' پھر جھک کر غور سے پہرے دار کی شکل دیکھی۔ اس کی ہلکی ہلکی ڈاڑھی اور مونچھیں تھیں۔ سر پر اونی ٹوپی تھی۔ میں نے ٹوپی کو ہاتھ لگایا تو میری انگلیاں خون سے گیلی

ہو گئیں۔

ساشی دیوار کے ساتھ لگی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں بھاگتی ہوئی میرے پاس آکر جھک گئی۔ اس نے بھی جھک کر غور سے پہرے دار کے چہرے کو دیکھا۔ پھر اسکی نبض دیکھی اور سرگوشی میں کہا:

"شاید یہ مر چکا ہے۔ اسے چھوڑو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

پیچھے گودام کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ ہم نے اندھیرے میں ٹٹول کر دیکھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ساشی نے مجھ سے شاٹ گن لے لی اور اس کی نال تالے کے کنڈے کے اندر ڈال کر دونوں ہاتھوں سے دستے کو پکڑ کر پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ تالے کا کنڈا کٹک کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ ساشی نے دروازہ پیچھے بند کر دیا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں نتالی کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ ساشی نے جیب سے لائٹر نکال کر جلایا۔ لائٹر کے شعلے کی روشنی میں ہمیں دیوار کے ساتھ لگی ایک کیمپ کارٹ نظر آئی جس پر ایک انسانی ہیولا کمبل میں لپٹا پڑا تھا۔

ساشی نے مجھے ہاتھ سے پیچھے کر دیا اور کان میں کہا:

"ریوالور ہاتھ میں رکھنا۔"

یہ کہہ کر ساشی نے ایک بار پھر لائٹر جلایا۔ کیمپ کارٹ کے قریب گئی اور کمبل ذرا سا ہٹایا۔ اس نے نتالی کا چہرہ دیکھتے ہی کمبل جلدی سے پیچھے ہٹا دیا اور اسے ہلاتے ہوئے کہا:

"نتالی۔ میں ساشی ہوں جلدی سے اٹھو، جلدی کرو۔"

نتالی ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔ لائٹر کی روشنی میں مجھے اس کا اترا

ہوا چہرہ صاف نظر آگیا۔ اس کی ایک آنکھ کالی تھی اور سوجی ہوئی تھی۔ ضرور اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ نتالی کو ساشی نے سہارا دے کر اٹھایا۔ ساشی نے جین پہن رکھی تھی اور پاؤں میں جوگر شوز بھی پہن رکھے تھے۔ وہ جوتوں سمیت کارٹ پر پڑی تھی۔ ساشی نے کہا:

"تمہیں اپنے پاؤں پر چلنا گا۔ جلدی کرو۔"

نتالی نے مجھے بھی دیکھ لیا تھا۔ میرے قریب سے گذرتے ہوئے نتالی نے میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ساشی نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ فرش پر پہرے دار کی لاش پڑی تھی یا وہ بے ہوش پڑا تھا۔ ہم تیزی سے برآمدے میں سے گذرتے ہوئے دوسری طرف نیچے پتھروں میں اتر گئے۔ ساشی آگے آگے تھی۔ نتالی پیچھے پیچھے تھی۔ میں نتالی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

اب ہم سمندری چٹانوں کی طرف تقریبا بھاگ رہے تھے۔ ہم جتنی جلدی ہوسکے، سمندر کے کنارے اسی جگہ پہنچنا چاہتے تھے جہاں ہماری کشتی پتھر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ نتالی بھاگتے ہوئے ایک بار لڑکھڑا گئی۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھال لیا۔ اس نے اطالوی زبان میں مجھے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک نتالی کے فرار کا کسی کو علم نہیں ہوا تھا۔ آسمان بادلوں سے بدستور ڈھکا ہوا تھا اور پھوار پڑ رہی تھی۔ بارش پوری طرح سے نہیں ہو رہی تھی۔ ہم چٹانوں کے قریب سے ایک طرف کو گھوم گئے۔ ساشی نے جلدی سے کشتی کھولی اور نتالی کو سہارا دے کر اس میں بٹھایا۔ پھر میں اور ساشی بھی کشتی میں سوار ہوگئے۔ ساشی چپو ہاتھوں میں تھام کر کشتی کے کونے میں بیٹھی اور کشتی کو سمندر کی ایک لہر کے اوپر ڈال

دیا۔ سمندر کی لہر ہماری کشتی کو کنارے سے اٹھاکر لے گئی۔ ساشی تیز تیز چپو چلانے لگی۔ اس نے کشتی کا رخ پیچھے کی طرف موڑ دیا۔ نتالی کشتی کے فرش پر دونوں ہاتھ بغلوں میں دیئے سمٹ کر بیٹھی تھی۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ آسمان کے مشرقی کناروں پر جو بادل تھے' ان میں دھیمی دھیمی صبح کاذب کی روشنی پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔

ساشی بڑی ہمت کے ساتھ چپو چلا رہی تھی۔ یہ اسکی کشتی چلانے کی مہارت تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں ہم بدمعاش مارکو کے فارم کے پہلو سے نکل کر کھلے سمندر میں آگئے۔ ایک بار پھر ہمیں فارم کی اکلوتی روشنی نظر آنے لگی۔ میں نے ساشی سے کہا:

"تم یہاں آجاؤ۔ میں کشتی چلاتا ہوں۔"

ساشی نے کہا: "تم نتالی کے پاس بیٹھے رہو۔"

ساشی جانتی تھی کہ میں اچھی طرح کشتی نہیں چلا سکوں گا۔ اب کشتی تیزی سے جنوبی کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بدمعاش مارکو کے فارم کی روشنی دور ہوتی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد فش مارکیٹ کی روشنیاں قریب آنا شروع ہوگئیں۔ نتالی میرے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ ایک بار کپکپائی تو میں نے اسے کہا کہ میری جیکٹ بھی پہن لو۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا: "نہیں۔۔ نہیں۔" مجھے چاہئے تھا کہ میں اس گرد بازو ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگالیتا۔ لیکن میری مشرقی حیاداری اور جھجھک نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ نتالی میرے ساتھ لگی سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں نے مجبور ہو کر اپنا بازو اس کے گرد ڈال دیا اور اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ ساشی دیوانہ وار جتنی تیز چپو چلا سکتی تھی' چلا رہی تھی۔ آخر

ہم فش مارکیٹ کے پاس پہنچ گئے۔ ساشی نے کشتی کو زور سے ایک طرف گھمایا۔ کشتی کنارے کی ریت پر چڑھ گئی۔ ساشی چھلانگ لگا کر کشتی سے اتری اور میرا نام لے کر بولی: "میرے ساتھ کشتی کو اوپر کھینچو۔"

ہم دونوں نے مل کر کشتی کو ریت پر کھینچ لیا۔ ہمیں کشتی کو مزید آگے چبوترے کی طرف لے جانا چاہیے تھا جہاں سے ہم کشتی کو لے کر چلے تھے۔ وہاں سمندر چبوترے تک آیا ہوا تھا۔ مگر گھبراہٹ میں ساشی نے ذرا پیچھے ہی کشتی لگادی۔ کشتی کو ہم نے وہیں ایک پتھر کے ساتھ باندھ دیا۔ ساشی نے نتالی کو سہارا دے کر کشتی سے باہر نکالا اور اس کا ماتھا چوم کر بولی: "نتالی! خدا کا شکر ہے ہم تمہیں لے آئے۔"

نتالی پر نقاہت طاری تھی۔ سردی اور کمزوری سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ ساشی نے جلدی سے اپنا اوور کوٹ اسے اوڑھا دیا اور ہم اسے سہارا دے کر فش مارکیٹ کی دوسری جانب سے سڑک پر لے آئے۔ دن نکلنے میں اب زیادہ وقت باقی نہیں رہا تھا۔ سڑک پر دو ٹرک آگے پیچھے چلتے فش مارکیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ سڑک غیر آباد اور چھوٹی تھی۔ ساشی کہنے لگی:

"یہاں ہمیں ٹیکسی نہیں ملے گی۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو، میں دوسری سڑک پر سے ٹیکسی لے کر آتی ہوں۔"

ساشی ہمیں وہیں چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے سڑک کی دوسری طرف چلی گئی۔ اب میں اور نتالی وہاں اکیلے تھے۔ ساشی کے اوور کوٹ نے نتالی کی سردی کافی حد تک روک دی تھی۔ چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا پتھر کا چبوترہ تھا۔ یہاں لیمپ پوسٹ کی روشنی تھی۔ ہم چبوترے کے کنارے پر

کنارے پر بیٹھ گئے۔ نتالی نے اطالوی میں کہا: "مجھے یقین تھا ساشی کے ساتھ تم ضرور آؤ گے۔"

میں نے انگریزی میں کہا: "تمہارا رقعہ مجھے مل گیا تھا۔ پھر میں کیسے آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔"

نتالی نے بیٹھے بیٹھے اپنا الجھے ہوئے بالوں والا سر میرے کاندھے کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے کہا: "تمہاری آنکھ سوجی ہوئی ہے، تمہیں انہوں نے مارا پیٹا تھا؟"

نتالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔ پھر مجھے صبح کی دھندلی روشنی میں اس کی سسکی کی آواز سنائی دی۔ وہ رونے لگی تھی۔ ہم مشرق میں رہنے والے لوگ عورت سے ویسے ہی بڑے متاثر ہو جاتے ہیں۔ نوجوانی میں تو کوئی لڑکی ذرا ہنس کر بات کر لے تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اسے ہم سے محبت ہو گئی ہے۔ اور وہ اگر ہمارے پاس بیٹھ کر ذرا سے آنسو بہا دے تو پھر تو ہم فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھانی شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ میں اب یورپ کی معاشرتی فضاؤں کا عادی ہو چلا تھا۔ مجھے علم ہو چکا تھا کہ مغربی معاشرے میں اگر کوئی عورت آپ کے ساتھ لگ کر بیٹھ جائے، آپ کا منہ چوم لے یا آپ کے سامنے رو بھی دے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ آپ سے محبت کرنے لگی ہے۔ مگر نتالی میری کمزوری سی بنتی جا رہی تھی۔ دوسری اطالوی عورتوں میں بہت سی باتیں ہماری مشرقی عورتوں سے ملتی جلتی تھیں۔ نتالی بھی بڑے گہرے جذبات والی لڑکی تھی۔ ہم ابھی ایک دوسرے سے زیادہ نہیں ملے تھے، پھر بھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اور نتالی ایک بار نہیں، ہزار بار پہلے بھی ایک دوسرے سے مل چکے ہیں اور اگر میں

روایتی بات کروں تو یہ کہوں گا کہ جیسے ہم جنم جنم میں ایک دوسرے کے ساتھ رہ چکے ہیں۔

اس وقت تک میں کئی لڑکیوں سے مل چکا تھا اور مجھے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ میں لڑکی کو دیکھ کر یا اس سے بات کر کے اس کے دل کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ نتالی کے بارے میں میرا تجربہ اور میری عقل اور میرا دل ۔۔۔۔۔ تینوں اس بات پر متفق تھے کہ نتالی دل کی سچی اور شریف لڑکی ہے۔ ماحول نے اور غلط صحبتوں نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔ یہ اس کے کردار کی شرافت تھی کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کے ماحول کو چھوڑ کر شریفانہ زندگی کی طرف لوٹ آنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس ماحول میں کام کرنے والی دوسری لڑکیاں عیش کر رہی تھیں۔ اونچی سوسائٹی سے ان کا ملنا جلنا تھا۔ ان کے پرس میں یورپ کی حسین ترین سیر گاہوں کے ایئر ٹکٹ اور کریڈٹ کارڈ ہوتے تھے۔ نتالی کے اسی احساس گناہ اور اچھی شریفانہ زندگی گذارنے کے عزم نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور میں نے اس کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔

اگرچہ جان کی بازی لگاتے ہوئے میں آخری وقت تک ہچکچا رہا تھا۔ اسے آپ میری کمینگی سمجھ لیں یا خود غرضی کہہ لیجئے کہ میں نتالی سے در پردہ محبت کرتے ہوئے بھی اس کی خاطر جان کی بازی لگانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ انسان میں کمزوریاں تو ہوتی ہیں ہیں' میرے اندر کمزوریاں اور کمینگیاں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے دوسرے لوگوں میں بھی ہوں اور وہ اسے تسلیم نہ کرتے ہوں' مگر میں نے آپ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میں اپنے سفرنامے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ چنانچہ میں اپنی تمام کمزوریوں کو قبول کرتا ہوں۔

اتنے میں ساشی ٹیکسی لے کر آگئی۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ساشی ہمیں سیدھا اپنے نہر کی گلیوں والے بوسیدہ سے فلیٹ میں لے گئی۔ یہاں آتے ہی نتالیا نے گرم پانی سے غسل کیا۔ ساشی نے اس کی سوجی ہوئی آنکھ پر دوائی لگائی اور اسے ناشتہ کرایا۔ پھر اسے اپنے بستر میں لٹا کر اوپر دونوں گرم کمبل ڈال دیئے اور کہا: "نتالی! اب تم آرام کرو۔"

نہا دھو کر نتالی کا چہرہ نکھر آیا تھا۔ اگرچہ اس کی ایک آنکھ پر نیل پڑا تھا اور سوجی ہوئی بھی تھی مگر اس حلیے میں بھی وہ مجھے خوبصورت لگ رہی تھی۔ یہ بھی ایک طرح سے میری کمزوری ہی تھی۔ نتالی نے منہ دیوار کی طرف کرتے ہوئے میری طرف ایک نظر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لئے ممنونیت کا اظہار تھا۔ وہ ذرا سی مسکرائی بھی تھی۔ ساشی نے مجھے ساتھ والے کمرے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اس کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ نہیں تھا بلکہ چھوٹا سا سٹور روم تھا۔ یہاں زمین پر دو میٹرس جوڑ کر بچھا دیئے گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی دوسری طرف کھلتی تھی۔ پرانے کپڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ میٹرس پر کوئی کمبل یا چادر وغیرہ نہیں تھی۔ ایک کلوزٹ تھا جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے بھی اندر ٹنگے ہوئے پرانے کپڑے نظر آرہے تھے۔ ساشی نے پٹ بند کر دیا اور میٹرس پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک کمبل اپنے اوپر کر لیا تھا۔ ایش ٹرے وہ دوسرے کمرے سے اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔

"تم بھی وہ کمبل اٹھا کر لے لو۔ ہم دونوں ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر باتیں کر لیں گے۔ پھر سو جائیں گے۔"

میں نے بھی کپڑوں کے انبار کے اوپر پڑا کمبل اٹھا کر اپنے اوپر کر لیا اور دیوار سے ٹیک لگا دی۔ ہم دونوں نے سگریٹ سلگا لئے تھے۔ بہت جلد کمرہ سگرٹوں کے دھوئیں سے بھر گیا۔ ساشی نے اٹھ کر گلی والی کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ کھڑکی کے کھلتے ہی سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ کمرے میں کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ کھڑکی کا پٹ کھلا تو دن کی دھندلی سی روشنی دکھائی دی اور ساتھ ہی بارش کی بوندا باندی کی بھی آواز آنے لگی۔ میں نے ساشی سے کہا: "دوسری طرف گلی میں نہر ہے کیا۔"

کیونکہ مجھے بارش کے قطروں کے پانی میں گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ساشی نے سر ہلا کر کہا: "ہاں۔ دوسری طرف نہر بہہ رہی ہے مگر یہ بہت چھوٹی ہے۔ اس میں سے کشتیاں نہیں گذرتیں۔ لوگ اس طرف مکانوں کی کھڑکیوں سے کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی: "تم واقعی بڑے بہادر ہو۔ نتالی نے تمہیں ٹھیک پہچانا ہے۔ تم نے برآمدے میں بیٹھے ہوئے بدمعاش پر کچھ زیادہ ہی زور سے وار کر دیا۔ میرا خیال ہے وہ زندہ نہیں بچا ہو گا لیکن تم فکر نہ کرو۔ ان غنڈوں میں سے کوئی غنڈہ ایسا نہیں ہے جس نے چھ سات خون نہ کئے ہوں۔ اگر پولیس کو پتہ چل جائے تو وہ تمہیں ضرور انعام دے گی۔"

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کہیں میری وجہ سے ایک بے گناہ انسان نہ مارا گیا ہو۔ جب ساشی نے بتایا کہ یہ لوگ کئی کئی خون کر چکے ہیں تو میرا ضمیر کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ سگریٹ ختم کر کے ساشی نے کہا: "میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔ میرا دل کافی پینے کو چاہ رہا ہے۔ تمہارے لئے بھی لاؤں؟"

مجھے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے کہہ دیا:

"ہاں ایک مگ میرے لئے بھی لے آنا۔"

ساشی چلی گئی اور میں آنکھیں بند کر کے رات کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ واقعی یہ سب کچھ کسی انگریزی ایکشن فلم کی طرح ہی ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اتنا خطرناک ایڈونچر کیا ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ خدا نے مجھے کامیاب و کامران کیا تھا۔ یقیناً یہ مجھے میری نیت کا پھل ملا تھا۔ کیونکہ میں نیک نیتی سے نتالیا کو غنڈوں کے چنگل سے نکال کر اسے نیک زندگی کی راہ پر ڈالنا چاہتا تھا۔ میں اس سے محبت کرتا تھا یا نہیں کرتا تھا۔ یہ ایک الگ بات تھی۔

تھوڑی دیر میں ساشی اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کے مگ تھے۔ ہم بیٹھ کر کافی پینے اور باتیں کرنے لگے۔ اس نے کہا: "نتالی سو رہی ہے۔ خدا جانے اس کے ساتھ ان بدمعاشوں نے کتنا تشدد کیا ہو گا۔"

میرے دل میں جو اندیشہ تھا' میں نے اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "وہ لوگ اس کی تلاش میں ضرور اپنے آدمی دوڑائیں گے۔ اب تو ان کا

کاایک آدمی بھی قتل ہو گیا ہے۔"

ساشی نے کافی کا گرم مگ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ کہنے لگی: "ان میں سے کسی کو میرے ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔ اور پھر میرے بارے میں وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں ان کے ایک آدمی کو مار کر نتالی کو وہاں سے نکال لے جاؤں گی۔"

میں نے پوچھا: "اب نتالی کیا تمہارے پاس ہی رہے گی؟"

وہ بولی: "نہیں! اس کا زیادہ دیر یہاں رہنا بھی ٹھیک نہیں۔"

میں نے کہا: "وہ اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہیں چلی جاتی؟"

"اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ ایک بھائی کہیں پیرس میں دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ اس دنیا میں وہ اکیلی ہے۔ ایسی لڑکیاں ہی ان بدمعاشوں کے چنگل میں آسانی سے پھنس جاتی ہیں۔"

"اور نتالی کا خاوند۔ وہ کہاں ہوتا ہے؟"

ساشی کے چہرے پر نفرت کے تاثرات ابھر آئے۔ اور بولی: "اس کمینے نے تو اس بے چاری کی زندگی برباد کی ہے۔ نتالی نے تو اس سے طلاق لے لی تھی۔ وہ ذلیل آدمی سنا ہے امریکہ چلا گیا تھا۔"

"تو پھر نتالی کا کیا بنے گا؟"

ساشی نے کندھوں کو سکیڑتے ہوئے کہا: "میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ نتالی نے بھی خود کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ اٹلی چھوڑ کر پیرس یا ڈنمارک چلی جائے۔ اتنا میں ضرور جانتی ہوں کہ اب وہ اٹلی میں نہیں رہ سکتی۔ وہ اس ملک میں جہاں بھی ہو گی۔ جس کونے میں بھی چھپی ہو گی، مارکو کے آدمی اسے ڈھونڈ کر وہیں قتل کر دیں گے۔"

میں نے کہا: "اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ تم نتالی کو نکال کر لے گئی تھیں، پھر کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا؟ جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ میں بھی کوئی کمزور اور شریف عورت نہیں ہوں۔ میرے پاس بھی بھرا ہوا ریوالور ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ میں ان غنڈوں کا مقابلہ کروں گی۔"

میں نے ساشی کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "نتالی پولیس کے پاس کیوں نہیں چلی جاتی۔ پولیس ضرور اس کی مدد کرے گی اور ان سب غنڈوں کو گرفتار کر لے گی۔"

ساشی مسکرائی: "تم اس شہر کی آب و ہوا سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہوئے۔ یہاں پولیس بھی مافیا کے ماتحت ہے۔ پولیس کے بڑے سے بڑا افسران کا تنخواہ دار ملازم ہوتا ہے۔ وہ ان بدمعاشوں کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ پولیس تو مافیا کے لئے جاسوسی کرتی ہے۔ نتالی اگر پولیس کے پاس پناہ لینے چلی جائے تو یقین کرو پولیس اسے پکڑ کر مارکو بدمعاش کے پاس پہنچا دے گی۔"

کھڑکی میں سے سرد ہوا اب بدن کو چبھنے لگی تھی۔ میں نے ساشی سے پوچھا: "کھڑکی بند کر دوں؟"

ساشی نے کافی کا مگ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا: "ہاں اور بتی بھی بجھا دو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔"

ساشی نے اپنے آپ کو کمبل میں اچھی طرح سے لپیٹا اور دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔ میں بھی اپنے کمبل میں گھس گیا۔ اگرچہ میں ساری رات کاجاگا اور موت کے ایڈونچر کی وجہ سے سخت تھکا ہوا تھا مگر میری نیند

غائب ہوگئی تھی۔ آنکھیں جل رہی تھیں مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ ایک نوجوان ڈانسر ٹائپ کی لڑکی میرے بالکل ساتھ کمبل میں لیٹی ہوئی تھی۔ بند کھڑکی کے باہر بڑے زور کی بارش شروع ہوگئی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ یہ ایک باد و باراں کا طوفان تھا۔ ایسا ہی ایک طوفان میرے اندر برپا تھا۔ اگر میں یورپ میں پیدا ہوا ہوتا اور وہاں کے ماحول میں پل کر بڑھا ہوا ہوتا تو شاید میں بھی سوجاتا اور میرے جذبات میں وہ ہیجان پیدا نہ ہوتا جو اس وت پیدا ہوچکا تھا۔ کیونکہ یورپ کے ماحول میں اگر ایک آزاد خیال اور گناہ کے ماحول میں زندگی بسر کرنے والی لڑکی بھی کسی لڑکے سے یہ کہے کہ تم بھی سوجاؤ۔ میں بھی سورہی ہوں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم دونوں کو سوجانا چاہیے' اس کے سوا کچھ اور نہیں کرنا چاہیے اور وہ دونوں پھر واقعی سوجاتے ہیں اور ان کے جذبات میں ایسا ہیجان پیدا نہیں ہوتا جو میرے دل میں پیدا ہورہا تھا۔ اس قسم کے جذباتی ہیجان کے لئے ان مغربی ممالک کے سرد لوگوں نے ایک الگ وقت رکھا ہوتا ہے۔ میں یورپ کے سرد ماحول میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ مجھ پر یہاں کی سماجی حد بندیوں کے مطابق ایک حد عائد ہوتی ہے اور مجھے اس حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مغربی ماحول میں اس قسم کی تجاوزات کو سخت ناپسند کیا جاتا ہے اور وہاں کی طوائف بھی اپنی عزت بچانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

آخر مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہوگیا اور میں سوگیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو نہ بارش کی آواز تھی' نہ بادل گرج رہے تھے۔ بند کھڑکی کی جھریوں میں سے دن کی پھیکی پھیکی سی روشنی تنگ و تاریک کمرے کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ساشی اسی طرح ایک پہلو پر لیٹی

گہری نیند سو رہی تھی۔ مجھے اس کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے کی آواز سنائی دی۔ عورت کے خراٹے مجھے بڑے برے لگتے ہیں، عورت ایسی نازک اور لطیف چیز ہے کہ نہ میں اسے کھانا کھاتے دیکھ سکتا ہوں اور نہ اس کے خراٹے سن سکتا ہوں۔ مگر نیگرو لڑکی ساشی برابر ایک خاص تال کے ساتھ خراٹے لے رہی تھی۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہاں ابھی دیوار کے ساتھ لگا بلب روشن تھا مگر بند کھڑکی کے شیشوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

نتالی بھی گہری نیند میں تھی۔ اس کا چہرہ کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دوپہر کے تین بجنے والے تھے۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ نتالی بالکل خراٹے نہیں لے رہی تھی۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ جس لڑکی کو میں پسند کرتا ہوں یا اس سے محبت کرتا ہوں، وہ خراٹے نہیں لیتی۔ میرے چلنے پھرنے سے نتالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نیند بھری آواز میں پوچھا: "کون؟"

میں نے اپنا نام لیا تو اس نے کمبل چہرے سے ہٹا لیا اور اٹھ کر پلنگ کی آہنی ریلنگ سے ٹیک لگا لی۔ میں اس کے پاس پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے نتالی؟"

نتالی نے اپنا ہاتھ کمبل سے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ مجھ سے زیادہ تر انگریزی میں ہی بات کرتی تھی۔ اس نے کہا: "میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تم میری سہیلی کے ساتھ مل کر مجھے جہنم سے نکال لائے ہو۔ میں تمہارا یہ احسان....."

میں نے نتالی کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی اور کہا: "میں نے وہی کیا جو مجھے ان حالات میں کرنا چاہئے تھا۔"

"ساشی اکیلی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم میری ایک آواز پر میری مدد کرنے ضرور آؤ گے۔"

نتالی کی آنکھ کی سوجن زیادہ ہوگئی تھی۔ اس نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ اپنا ہاتھ آنکھ پر رکھ دیا۔

"انہوں نے مجھے بہت مارا پیٹا ہے۔ اگر میں ان کے لئے کار آمد نہ ہوتی تو اب تک میری لاش سمندر کی مچھلیاں کھا چکی ہوتیں۔"

دوسرے کمرے سے ساشی بھی آگئی۔ اس نے نتالی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کہا: "تمہیں ہلکا ٹمپریچر بھی ہے۔ میں تمہارے لئے دوائی لے کر آتی ہوں۔ ابھی تم یہ گولیاں پانی سے کھالو۔"

ساشی نے میز کے دراز میں سے گولیوں کا ایک پیکٹ نکال کر کھولا اور زرد رنگ کی دو گولیاں نتالی کو کھلادیں۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی: "میں آج کلب میں نہیں جاؤں گی۔ بروٹو سے کہہ دینا کہ میں بیمار ہوں۔ میرا نتالی کے پاس رہنا از حد ضروری ہے۔"

میرا بھی اب واپس سلیمان کے فلیٹ پر جانا ضروری تھا۔ میں نے نتالی سے دوسرے دن آنے کا کہا اور اجازت لے کر وہاں سے آگیا۔

فلیٹ پر پہنچا تو سلیمان کسی لڑکی کو لے کر آیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آنکھ ماری۔ میں وہیں سے واپس مڑ گیا۔ شام تک میں وینس کے گنجان علاقے کے ایک ریستوران میں بیٹھا رہا۔ وہیں میں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ کافی پی اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ میرے دل میں ایک نیا خوف پیدا ہو چکا تھا۔ یہ خوف ایک ایسے شریف آدمی کا خوف تھا جس کے ہاتھوں ایک آدمی قتل ہو گیا تھا۔ میں یہ سننے کے لئے بے چین تھا کہ مارکو کے فارم والا

گارڈ جس کے سر پر میں نے پورے زور سے پتھر مارا تھا' وہ مرا نہیں زندہ ہے۔ مگر یہ بات بتانے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ ریڈیو' ٹیلی ویژن اور کسی اخبار میں یہ خبر چھپ نہیں سکتی تھی۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ بدمعاش مارکو کے خونخوار درندے نتالی کے ساتھ ساتھ اس شخص کی تلاش میں بھی شہر کا کونا کونا چھان رہے ہوں گے جس نے گارڈ کو قتل کیا تھا یا شدید زخمی کیا تھا۔ میں دل میں خدا سے بار بار دعا مانگتا کہ یا اللہ پاک! وہ آدمی زخمی ہوا ہو' مرا نہ ہو۔ مارکو مافیا کے لوگوں میں سے کوئی بھی میری شکل سے شناسا نہیں تھا۔ یقیناً وہ ساشی کو جانتے ہوں گے۔ ساشی لاکھ کہے کہ انہیں اس پر شک نہیں پڑ سکتا۔ لیکن مارکو کے آدمی اتنے بھی بے وقوف نہیں ہوں گے' وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ نیگرو ڈانسر ساشی' نتالی کی سہیلی ہے اور وہ اس کا پتہ کرنے رات کلب میں ضرور آئیں گے۔ وہاں جب انہیں معلوم ہو گا کہ نیگرو ڈانسر آج نہیں آئی تو ان کا شبہ اس یقین میں بدل جائے گا کہ ساشی ہی نے نتالی کو کہیں چھپا رکھا ہے اور وہ اس کے نہر کی گلیوں والے فلیٹ پر دھاوا بول دیں گے۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ میں بھی ایک طرح سے مافیا کے جال میں پھنس گیا ہوا تھا۔ مارکو کے کان میں ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ ان کے گارڈ کو میں نے مارا ہے تو میرا زندہ رہنا ایک ناممکن بات تھی۔ پھر خدا کی ذات ہی مجھے مارکو بدمعاش کے آدمیوں کی گولیوں سے بچا سکتی تھی۔

میں چوتھا سگریٹ سلگانے لگا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے کبھی ایک نشست میں اتنے سگریٹ نہیں پیئے تھے۔ دراصل میں اپنے خیالات اور اندیشوں کی وجہ سے اتنا پریشان تھا کہ سگریٹ

پر سگریٹ پیئے جارہا تھا۔ اس رات میں پارما کلب میں اپنی ڈیوٹی پر گیا تو اندر سے ڈرا ہوا تھا۔ میرے دل میں ایک مجرمانہ احساس تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہر آدمی مجھے گھور رہا ہو۔ جب میں نے بار روم میں بروٹو کو بتایا کہ ساشی کا ایک آدمی میرے فلیٹ پر آکر کہہ گیا تھا کہ ساشی آج رات کلب نہیں آئے گی' اسے بخار ہے تو وہ بھینسے کی طرح پھنکار مار کر بولا: "اس کتیا نے مجھے فون کیوں نہیں کر دیا۔ میں کسی دوسری ڈانسر کا بندوبست کر لیتا؟' جاؤ تم دفع ہو جاؤ۔۔۔ جاکر اپنا کام کرو۔"

میں نے خالی ٹرے اٹھائی اور کان کھجاتا ہوا اس شیلف کی طرف بڑھا جہاں مشروبات کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ اور ساتھ والی ٹھنڈی الماری میں بیئر کے ایک ایک درجن کے ڈبوں کے پیک رکھے تھے۔ وہاں سے میں نے بیئر کے چار ڈبے اور وائن کی ایک بوتل ٹرے میں رکھی اور ڈانسنگ ہال میں آگیا۔ ڈانسنگ ہال میں میوزک زور زور سے بج رہا تھا۔ سلاٹ مشینیں کھٹاک کھٹاک چل رہی تھیں۔ فلور پر ڈانس ہو رہا تھا۔ فضا مشروبات کی بو اور تمباکو کے دھوئیں سے بوجھل ہو رہی تھی۔

ڈانسنگ فلور پر نتالی اور ساشی کی جگہ آج دوسری لڑکیاں رقص کر رہی تھیں اور وہاں بیٹھے ہوئے نیم مدہوش لوگوں کا جی بہلا رہی تھیں۔ میرا خیال بار بار نتالی کی طرف چلا جاتا۔ مجھے معلوم تھا اس پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آنے والی ہے اور ممکن ہے کہ نیگرو لڑکی ساشی بھی رگڑی جائے۔ خود مجھے بھی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ مگر میں یہ سوچ کر اپنے آپ کو حوصلہ دیتا کہ کسی نے مجھے کبھی نتالی کے ساتھ یا ساشی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ کلب کے ہال میں ہاؤ ہو کا بازار گرم تھا۔ خدا جانے یہ کون لوگ تھے کہ جو ساری رات بیٹھے وہاں داد

وہاں داد عیش دیتے رہتے تھے۔ ساشی کی جگہ کوئی اور نیگرو لڑکی نیم عریاں کاسٹیوم پہنے ڈانس کر رہی تھی۔ کلب کی ڈانسروں میں ایک نیگرو لڑکی کا ہونا ضروری تھا۔ لوگ نیگرو لڑکیوں کے گہرے سانولے کالے جسم پسند کرتے تھے۔

رات کے کوئی دو بجے کا وقت ہو گا کہ وہی اسی روز والے باکسر ٹائپ کے آدمی کلب میں داخل ہوئے اور ڈانسنگ فلور کے قریب ایک خالی میز پر بیٹھ گئے۔ وہ بڑے غور سے ڈانس کرتی لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں مشروبات کا ٹرے لے کر ان کے پاس آ گیا۔ یہ میری ڈیوٹی تھی کہ جیسے ہی کوئی گاہک آئے، میں اسے مشروبات پیش کروں۔ کیونکہ وہاں بیٹھنے کی یہ فیس تھی کہ ہر آدمی کو کم از کم بیئر کی ایک بوتل یا ڈبہ ضرور پینا پڑتا تھا۔ میں ان باکسر ٹائپ کے آدمیوں کے پاس گیا تو ان میں سے ایک نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ پھر اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ میں ذرا جھک گیا تو اس نے پوچھا: "اس نیگرو لڑکی سے پہلے جو نیگرو لڑکی ڈانس کرتی تھی، وہ کہاں ہے؟"

اس نے یہ بات اطالوی زبان میں پوچھی تھی۔ اب میں ٹوٹی پھوٹی ہی سہی مگر اٹالین بولنے لگا تھا۔ میں نے کہا: "وہ آج بیمار ہے۔"

باکسر نے جیکٹ کی جیب سے دس لیرے کا نوٹ نکال کر میرے ٹرے میں رکھ دیا اور منہ میں سگریٹ گھماتے ہوئے پوچھا: "کیا تم جانتے ہو وہ کہاں رہتی ہے، ہم اس کے دوست ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا: "سینور! مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم نہیں۔"

وہ اٹھے اور بار کاؤنٹر کی طرف چلے جہاں بروٹو شیشے کے لمبے گلاس

کو ہلا ہلا کر کاک ٹیل بنانے میں مصروف تھا۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ بروٹو کو تو ساشی کا ایڈریس معلوم ہو گا' اگر اس نے بتادیا تو یہ جرائم پیشہ بدمعاش جو یقیناً مارکو کے آدمی تھے' ساشی کے گھر پہنچ جائیں گے اور وہاں نتالی بھی ان کے ہاتھ آجائے گی۔ میں بھی تیز تیز قدموں سے دوسری طرف ہو کر بار کاؤنٹر پر پہنچ گیا اور ٹرے کونے میں رکھ کر شیلف میں سے مشروبات کی بوتلیں نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ میرے کان کاؤنٹر کی طرف لگے تھے جہاں دونوں باکسر پہنچ گئے تھے اور انہوں نے بروٹو سے ساشی کے بارے میں پوچھا تھا۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ نتالی کے متعلق انہیں معلوم ہے کہ وہ کلب میں نہیں آئے گی کیونکہ وہ زخمی حالت میں تھی۔ وہ ساشی کا ایڈریس چاہتے تھے جو نتالی کی گہری سہیلی تھی۔ یہ معلومات پہلے سے ان کے پاس موجود تھیں کہ نیگرو ڈانسر ساشی ہی نتالی کی سہیلی ہے جو اس کی رازدار بھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ بروٹو انہیں فوراً ساشی کا ایڈریس بتادے گا مگر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "سینور! یہ جو لڑکیاں ہمارے کلب میں ڈانس کرنے آتی ہیں' یہ ہمیں کبھی اپنا ایڈریس نہیں بتاتیں' یہ تو رات یہاں گذارتی ہیں' دن کہیں بسر کرتی ہیں۔"

دوسرے باکسر نے پوچھا: "پھر بھی تمہیں اس کا کچھ تو اتا پتا معلوم ہو گا۔"

بروٹو نے ذرا سا مسکرا کر معذرت کا اظہار کیا۔

"نو سینور! مجھے اتنا ہی پتہ ہے کہ یہ لڑکیاں کسی امیرزادے کی گاڑی یا کسی اوباش کے ساتھ ٹیکسی میں آتی ہیں اور واپسی پر بھی انہیں کوئی نہ کوئی آکر لے جاتا ہے۔"

دونوں باکسر کلب کے عقبی دروازے سے باہر نکل گئے۔ مجھے بے حد سکون سا ہو گیا۔ ایک طرح سے ساشی اور نتالی کی زندگی بچ گئی تھی۔ کیونکہ اب جبکہ ان بدمعاشوں کا ایک آدمی بھی قتل یا شدید زخمی ہو چکا تھا' وہ کسی صورت میں نتالی یا ساشی کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ میں بڑے اطمینان سے ٹرے میں شیری کی چھوٹی بوتل رکھ کر ڈانسنگ فلور کی طرف چل دیا۔

رات کو ڈیوٹی آف کر کے میں نے آخری بس پکڑی اور سلیمان کے فلیٹ پر آ گیا۔ وہ بستر میں گھسا خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ میں بھی بتی بجھا کر صوفے پر پڑ گیا۔ بار بار نتالی کی طرف خیال چلا جاتا' وہ کس حال میں ہو گی۔ کہیں یہ بدمعاش کسی دوسرے ذریعے سے اس کے فلیٹ کا پتہ کر کے وہاں پہنچ نہ گئے ہوں۔ طرح طرح کے اندیشے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ آخر انہی اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ میں سو گیا۔ رات کو بڑے ڈراؤنے خواب ٹکڑوں کی شکل میں آتے رہے۔ سلیمان کی کھڑکھڑ نے مجھے جگا دیا۔ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ میری نیند پوری ہو چکی تھی۔ سلیمان کھانا تیار کر رہا تھا۔ کمرے میں بھنے ہوئے قیمے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے صوفے پر بیدار ہوتے دیکھ کر سلیمان مسکرا بولا: "آج کل تم مجھے کسی لمبے چکر میں پڑے ہوئے لگتے ہو؟"

"تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟" میں نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

سلیمان نے خالص اطالویوں کی طرح کندھے سکیڑ کر کہا: "بس لگا لیا اندازہ۔ میں ایک مدت سے اس شہر کی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ یہ وینس شہر ہے۔ جب کوئی سیاح یہاں نوکری کر کے رہنا شروع کر دیتا ہے تو پھر اس کا کسی نہ کسی سکینڈل میں پھنس جانا یقینی ہو جاتا ہے۔"

میں نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا: "نہیں برادر! میرا کوئی سکینڈل نہیں ہے، میں تو کلب کی ڈیوٹی پر جاتا ہوں اور آدھی رات کے بعد واپس آکر یہاں صوفے پر سو جاتا ہوں۔"

میں نے باتھ روم کا دروازہ بند کر دیا تو مجھے سلیمان کے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا: "برادر! ذرا ہوشیار رہنا۔ کہیں مارے نہ جانا۔"

سلیمان کو میں نے نتالی کے بارے میں نہ کچھ بتایا تھا اور نہ میں اسے کچھ بتانا چاہتا تھا۔ تیسرے پہر وہ ٹیکسی لے کر نکل گیا۔ میں فلیٹ میں اکیلا بستر پر لیٹ کر سگریٹ پینے لگا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ذرا اندھیرا ہو تو میں ساشی کے فلیٹ پر جاکر نتالی کا حال معلوم کروں۔ دن کی روشنی میں میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ نیچے گلی نما سڑک پر بچے کھیل رہے تھے۔ موسم خراب نہیں تھا۔ آسمان صاف تھا اور سورج غروب ہونے والا تھا۔ پھر جب شام ہوگئی اور مکانوں میں بتیاں روشن ہوگئیں تو میں نے فلیٹ کو تالا لگا کر چابی خاص جگہ پر رکھی اور سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آگیا۔ چوک میں آکر بس پکڑی اور ساشی کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرا دل اس خیال سے دھڑکنے لگتا کہ کہیں وہاں کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو۔ دشمن نتالی کی تلاش میں تھے اور دشمن بھی ایسے تھے کہ سارا وینس شہر ان کی زد میں تھا اور ان کے جاسوس اور قاتل سارے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ پھر خیال آتا کہ ساشی نے اپنے فلیٹ کا ایڈریس اگر کسی کو نہیں بتایا تو پھر یہ لوگ وہاں نہیں پہنچ سکیں گے۔

نتالی کا خیال آتا تو دل اداس سا ہو جاتا۔ اس سنہری بالوں والی

اطالوی لڑکی نے اپنی مشرقی لڑکیوں والی شرم و حیاداری اور بے زبانی سے میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں لاکھ اس کا خیال دل سے نکالتا مگر اس کا اداس معصوم چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں پہلے ساشی کے فلیٹ پر جاکر نتالی کی خیریت دریافت کروں گا۔ انہیں اس خطرے سے آگاہ کروں گا کہ بدمعاش مارکو کے غنڈے ان کی تلاش میں ہیں اور وہ کلب میں آکر ساشی کے فلیٹ کا پتہ بھی پوچھ رہے تھے۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھوں گا اور پھر کلب میں اپنی ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا۔ بس وینس کے بارونق جگمگاتے ہوئے بازاروں میں سے گذر رہی تھی۔ مگر میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ ایک بڑے چوک میں میں نے بس تبدیل کی۔ اس بس نے مجھے نہروں والی گلیوں کے علاقے میں پہنچادیا۔ ڈاک یارڈ سے میں گنڈولے میں سوار ہوگیا۔ اور ایک گلی کے کونے میں پتھر کے لمبے چبوترے پر اتر گیا۔ یہاں سے میں نے پیدل چل کر دو تین مکانوں کے صحن عبور کئے۔ ایڈریاٹک سمندر کا پانی ندی کی شکل میں گلی میں ہچکولے کھارہا تھا اور آس پاس کے مکانوں کی عقبی روشنیاں ندی کے پانی میں جھلملارہی تھیں۔ ساشی کا گھر مجھے معلوم تھا۔

میں گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ واقعی یہ ایک ویران علاقہ تھا۔ مکانوں کے پچھواڑے گلی میں لگتے تھے۔ دالان پہلے روز کی طرح ویران اور نیم روشن تھا۔ یہ روشنی کونے والے مکان کے باہر جلتے ہوئے بلب کی تھی۔ ساشی کے مکان کے باہر کوئی بتی نہیں جلتی تھی۔ اس نیگرو لڑکی نے اپنے ماحول اور حالات کے مطابق بڑا چن کر مکان لیا تھا۔ اس کے فلیٹ بلکہ مکان کا دروازہ بند تھا۔ یہ مکان صدیوں پرانے تھے۔ اس لئے میں انہیں فلیٹ نہیں کہوں

گا۔ اس علاقے میں ابھی تک کتنے ہی مکان خالی پڑے تھے۔ ان مکانوں میں کوئی نہیں رہ رہا تھا۔

ساشی کے مکان کا دروازہ حسب معمول بند تھا۔ کوئی کال بیل بھی نہیں تھی۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری بار دستک دی۔ کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ میں نے دروازے کو ذرا دبایا تو وہ کھل گیا۔ دروازہ پہلے سے ہی کھلا تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ ساشی نے دروازہ اندر سے بند کیوں نہیں کیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس پر میں مزید حیران ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ساشی دروازہ کھلا چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہو۔ میں آگے بڑھا تو میرا پاؤں آگے پڑی ہوئی کسی شے سے ٹکرایا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے جلدی سے دیوار کو پکڑ لیا اور ٹٹول کر دیوار کے ساتھ لگا ہوا بجلی کا سوئچ دبایا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ بلب کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ساشی کے کمرے کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ کراکری ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں تیزی سے پچھلے سٹور روم میں گیا۔ وہاں میٹرس پر کلوزاٹ سے نکالے ہوئے کپڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار پر لگی ہوئی کسی اطالوی فلم ایکٹریس کی تصویر کا شیشہ چکنا چور ہو چکا تھا اور وہ ٹیڑھی ہو کر دیوار سے لٹک رہی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہاں نہ ساشی تھی اور نہ نتالی ہی تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ مافیا کے آدمی یہاں آئے تھے اور گھر کے سامان کو تباہ کر کے ساشی اور نتالی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں جلدی سے مکان سے باہر آ گیا۔ وہاں رکنا میرے لئے بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔ مکان کا دروازہ بند کر کے میں تیز تیز قدموں سے ساتھ والے مکان کے دالان میں سے گذر کر گلی کے کونے پر آ کر ایک ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا کہ کوئی ٹیکسی گنڈولا یعنی کشتی

ادھر سے گذرے تو میں وہاں سے نکل جاؤں۔ میرا دماغ طرح طرح کے خیال سوچ رہا تھا۔

ان لوگوں نے دونوں کو لے جاکر ضرور ہلاک کر دیا ہو گا۔ ایک گنڈولا آکر رک گیا۔ اس میں پہلے سے تین سواریاں بیٹھی تھیں۔ میں بھی اس میں سوار ہو گیا اور ڈاک یارڈ میں آکر جلدی جلدی یارڈ سے نکل کر بارونق سڑک پر آگیا۔ بس سٹاپ سامنے تھا۔ میں بس سٹاپ کے کیبن میں آکر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا یہ لوگ تو قاتل ہیں' انہوں نے ضرور ساشی کو اذیتیں دے کر یہ معلوم کر لیا ہو گا کہ وہ رات کو ویران جزیرے کے فارم سے نتالی کو نکال کر لے گئی تھی۔ اس نے ضرور یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ میں بھی اس کے ساتھ تھا اور برآمدے میں پہرہ دیتے گارڈ کو میں نے ہی پتھر مار کر ہلاک کیا تھا۔ یہ سوچ کر میرے ہونٹ خوف کے مارے خشک ہو گئے۔ میرا حلق کڑوا ہو گیا۔ یہ لوگ اب مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پھر خیال آیا کہ ساشی نے میرے بارے میں نہیں بتایا ہو گا۔ اگر بتا بھی دیا ہو گا تو مارکو کے آدمیوں کو کیا معلوم کہ وہ میں ہی ہوں۔ انہوں نے میری شکل تو دیکھی نہیں۔ کلب میں کتنے ہی لڑکے میری طرح ویٹر کی جاب کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ لڑکا میں ہی ہوں جو ساشی کے ساتھ ویران جزیرے میں گیا تھا۔

مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ وہاں سے میں نے ایک بس پکڑی اور پارما کلب کے باہر جاکر اتر گیا۔ اس رات میں ہزاروں اندیشے اور وسوسے دل میں لئے کلب میں داخل ہوا۔ میں بروٹو کے قریب سے گذرا تو اس نے حسب عادت چیخ کر کہا: "سکاچ آج پہلے والے شیلف میں رکھی ہے۔ ذرا تیز تیز چلا کرو۔ جاؤ۔"

جب میں مشروبات سے بھرا ہوا ٹرے لے کر ہال میں آیا تو میوزک کے شور میں فلور پر لڑکیاں نیم عریاں کاسٹیوم میں رقص میں مصروف تھیں۔ فلور کے ساتھ لگی میزوں پر بیٹھے ہوئے عیاش لوگ ان پر آوازے بھی کس رہے تھے اور مشروبات اور سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ ہر رات کی طرح فضا میں تمباکو اور مشروبات کی بو رچی ہوئی تھی۔ اب میں اس بو کا عادی ہو گیا تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد تمام میزوں کا جائزہ لے لیتا تھا کہ کہیں مارکو کے باکسر ٹائپ کے آدمی تو میری تلاش میں وہاں نہیں آئے مگر ان میں سے مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گیارہ بجے میں نے کاؤنٹر کے پیچھے چھوٹی سی ٹیبل پر بیٹھ کر مختصر سا کھانا کھایا اور واپس اپنی ڈیوٹی پر آ گیا۔ رات کے کوئی ایک بجے کے قریب میں نے ان دونوں باکسروں کو کلب کے ہال کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس طرف ہال کا ایک ہی دروازہ تھا۔ میں دوسرے دروازے کی طرف جانے لگا تو دونوں باکسروں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک لمحے کے لئے وہیں بت سا بنا رہا۔ میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ میری ڈیوٹی بھی تھی کہ کوئی گاہک بلائے تو میں اس کی بات سننے اس کے پاس ضرور جاؤں۔ میں نے دل میں سمجھ لیا تھا کہ انہیں میرے بارے میں ساشی نے سب کچھ بتا دیا ہے اور اب یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اوپر سے بظاہر مسکراتا ہوا ان کے قریب چلا گیا اور روائتی خوش اخلاقی سے بڑی مشکل سے پوچھا: "یس سینور!"

ان میں سے ایک باکسر نے جس کے ناک کی ہڈی درمیان سے ٹوٹ

کر ایک طرف مڑ گئی تھی' میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا دباتے ہوئے کہا: "تم ہمارے دوست ہو۔ ہمیں ایک ضروری بات تم سے پوچھنی ہے' یہ لو' اسے اپنے پاس رکھو۔"

اور اس نے دوسرا ہاتھ جیب سے نکال کر دس لیرے کا نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیا۔ میں سخت تذبذب میں تھا۔ کبھی لگتا کہ انہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ کبھی لگتا کہ نہیں' انہیں ابھی کچھ نہیں پتہ۔ باکسر نے میری طرف جھک کر پوچھا: "یہ بتاؤ کہ تم بیروں میں وہ کون سا بیرا ہے جس کی نیگرو ڈانسر ساشی سے دوستی تھی؟"

اس بدمعاش کی زبان سے یہ جملہ سن کر میری جان میں جان آگئی۔ انہیں میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اتنا مجھ پر انکشاف ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو اذیتیں دے دے کر اس سے معلوم کر لیا ہے کہ وہ کلب میں اپنے ایک دوست بیرے کے ساتھ ویران جزیرے پر گئی تھی۔ مگر اس نے میرا حلیہ انہیں غلط بتایا تھا جس کی' بعد میں ان باکسروں نے تصدیق بھی کر دی۔ میں نے کہا: "ساشی ڈانسر تو سب بیروں سے ہنس کر ملتی تھی۔ اب پتہ نہیں آپ کس بیرے کی بات کر رہے ہیں..."

دوسرے باکسر نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا: "اس بیرے کا نام گنز الیز ہے۔ سوئٹش ہے' عمر چالیس کے قریب ہے۔ ماتھے پر ایک طرف زخم کا لمبا نشان ہے۔"

پہلے والا باکسر بولا: "ہمیں اس حلئے کا بیرا یہاں کہیں نظر نہیں آرہا۔ کیا تم اس کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکتے ہو۔ ہمیں اس سے بڑا ضروری ملنا ہے۔"

میرے تن مردہ میں مزید جان پڑ گئی۔ ساشی نے میرے ساتھ پوری پوری دوستی نبھائی تھی۔ اس نے نہ جانے کیسی کیسی اذیتیں برداشت کیں مگر میرا حلیہ غلط بتایا۔ اگر وہ ان قاتلوں کو صرف اتنا ہی بتا دیتی کہ جس لڑکے کے ساتھ میں نتالی کو نکال کر لائی تھی اور جس کے حملے سے ان کا گارڈ مارا گیا' وہ پاکستانی ہے۔ اس کا نام یہ ہے اور اس کا حلیہ اس طرح کا ہے تو یہ باکسر کلب ہال میں داخل ہوتے ہی مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے اور بڑے اطمینان سے باہر نکل جاتے۔ میرا کھویا ہوا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا:

"ہاں ہاں' یاد آیا۔ تم گنز الیز کی بات کر رہے ہو' مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں کہ یہی ہے کہ نہیں' ہاں اس حلئے کا ایک آدمی میں نے دو تین دن پہلے یہاں دیکھا ضرور تھا۔ پھر وہ نظر نہیں آیا۔ آپ لوگ مسٹر بروٹو سے کیوں نہیں معلوم کرتے؟"

دوسرے باکسر نے بروٹو کو موٹی سی گالی دی اور کہا: "اس سے بھی پوچھ لیں گے۔"

اور دونوں بدمعاش تیزی سے دروازے کی طرف مڑ گئے۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور خیال ہی خیال میں ساشی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "ساشی! تم واقعی مخلص دوست ہو۔ تم نے دوستی کی لاج رکھ لی۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

نتالی کے ساتھ مجھے ساشی کی بھی فکر تھی۔ قیاس یہی تھا کہ مارکو نے نتالی کو قتل نہیں کیا ہو گا کیونکہ بقول ساشی اس سے اس گروہ کے گہرے مجرمانہ مفادات وابستہ تھے۔ میں یہ بھی سوچتا کہ ساشی کو بھی انہوں نے ٹھکانے نہیں

لگایا ہو گا۔ اگر ان کا کوئی ایسا ارادہ ہوتا تو ساشی کے فلیٹ میں ہی دونوں کی لاشیں پڑی ہوتیں۔ کافی رات گئے میں کلب سے واپس آیا۔

دوسرے دن میں شام تک سویا رہا۔ جب سے مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ ساشی نے مارکو کے آدمیوں کو میرا اصلی حلیہ اور نام پتہ نہیں بتایا میرے دل سے ایک خوف سا دور ہو گیا تھا۔ دوسری رات میں کلب میں گیا تو مارکو کا کوئی آدمی وہاں نہ آیا۔ تیسری رات بھی ایسے ہی گذر گئی۔ نتالی اور ساشی کا بھی کچھ پتہ نہ چل سکا۔ میں نے سراغ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دل میں ان دونوں اطالوی لڑکیوں کے بارے میں تشویش ضرور لگی تھی کہ خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گی، کہاں ہوں گی اور مافیا کے قاتل غنڈے ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کر رہے ہوں گے۔ چوتھے دن میں کلب سے واپس آکر سلیمان کے فلیٹ میں سو گیا۔ اگلے دن دوپہر کے بعد اٹھا تو سلیمان میز کے پاس بیٹھا برگر کھاتے ہوئے کافی پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار بھی تھا۔ مجھے جاگتا دیکھ کر اس نے کہا: "برادر! تمہارے کلب کی ایک ڈانسر قتل ہو گئی ہے، یہ دیکھو اس کی تصویر چھپی ہے۔"

مجھ پر تو جیسے بجلی سی گری۔ میں ایک پل کے لئے ساکت ہو گیا۔ مگر جلدی سے اپنے حواس پر قابو پایا اور سلیمان سے اخبار لے کر دیکھا۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر چوکٹھے میں ساشی کی لاش کی تصویر چھپی تھی۔ نیچے لکھا تھا کہ ریالٹو جزیرے کے ڈاک یارڈ میں ایک نوجوان لڑکی کی لاش ملی ہے جس کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ پارما کلب میں ڈانس کیا کرتی تھی۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھا تھا۔ ساشی کا نام بھی اخبار والوں نے معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس قسم کے قتل وینس میں آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ میرا دل

ڈوبنے سا لگا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے ساشی کو ہلاک کر ہی دیا۔ نتالی بچ گئی تھی، صرف اس وجہ سے کہ مارکو کاگینگ اس سے کام لینا چاہتا تھا۔ ساشی نے مجھے بتایا تھا کہ اونچی سوسائٹی میں نتالی کی شخصیت کو بہت پسند کیا جاتا ہے اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بات کرتی ہے۔ ساشی کی موت کا مجھے دلی صدمہ ہوا۔ مگر میں سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ اس دوران مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ نتالی کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ میرے دل میں اس کی یاد برابر آتی تھی۔ ایک رات میں نے اسے خواب میں بھی دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پرانا باغ ہے اس میں ایک گرجا گھر ہے جس کی دیواروں پر سرسبز بیل چڑھی ہوئی ہے۔ اچانک گرجا گھر کے دروازے میں سے نتالی باہر نکلتی ہے۔ اس نے یورپ کی دلہنوں والا سفید لباس پہن رکھا ہے۔ سر پر سفید پھولوں کا تاج ہے۔ ہاتھ میں سفید پھولوں کا گلدستہ ہے۔ اس کے سفید جالی دار گاؤن کو پیچھے سے دو ننھی ننھی پریوں نے اٹھا رکھا ہے۔ نتالی گرجے کے دروازے میں کھڑی ہو کر پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑتی ہے۔ میں سرو کے ایک جھنڈ کے پاس کھڑا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہے اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتی ہے۔ اس نے کہنیوں تک سفید ریشمی دستانے پہنے ہوئے ہیں۔ میں بے اختیار سا ہو کر اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کی آواز نہیں نکلتی۔ اچانک وہ اپنا گلا دونوں ہاتھوں سے پکڑتی ہے اور پھر اس کے منہ

سے خون ٹپکنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ چیخ مار کر گر جاگھر کے اندر دوڑتی ہے۔ میں اس کے پیچھے اسے آوازیں دیتا جاتا ہوں۔ میں کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑتا ہوں اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

میں سلیمان کے کمرے میں صوفے پر سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نتالی کے خواب نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ ایک ایسا خواب تھا جس کے حسن اور معصومیت میں خون بھی شامل تھا۔ دیر تک میں صوفے پر پہلو بدلتا رہا۔ پھر مجھے نیند نہ آئی اور میں اٹھ کر نیچے گلی کے ریستوران میں آکر کافی پینے لگا۔ شام تک میں خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ دل یہی کہتا تھا کہ نتالی کسی مصیبت میں ہے' اسے میری مدد کی ضرورت ہے' مگر میں اس کی کیسے مدد کر سکتا تھا۔ مجھے تو اس کا کچھ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ نتالی کی مدد میں دو وجوہات کی بناء پر کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ کرنے پر تیار تھا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میں نتالی سے محبت کرنے لگا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نتالی دل سے چاہتی تھی کہ وہ گناہ کی زندگی سے توبہ کر کے اس دلدل سے نکل جائے اور عزت اور آبرو مندی کی شریفانہ زندگی بسر کرنی شروع کرے۔ چونکہ میری اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ اس لئے اب چشم پوشی سے کام لینا مردانگی اور انسانی اقدار کے خلاف تھا۔ مجھے ہر حالت میں اس کی مدد کرنی چاہئے تھی' یہ میرا فرض بنتا تھا۔

وہاں کوئی ایسا آدمی یا عورت نہیں تھی جس سے میں نتالی کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا۔ پارما کلب میں اس قسم کے معاملات پر دوسری ڈانسر لڑکیوں سی بات کرنا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔ کیونکہ وہ سب ایک طرح سے مافیا گینگ کے جال میں پھنسی ہوئی جل پریاں تھیں۔ مافیا والوں کے کانوں میں

ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی کہ پارما کلب کا ایک بیرا نتالی کے بارے میں پوچھ رہا تھا تو وہ لوگ ضرور میرے پیچھے لگ جاتے کیونکہ یہ طے شدہ بات تھی کہ مارکو کو ابھی تک اپنے فارم والے گارڈ کے قتل یا اسے شدید زخمی کر کے نتالی کو نکال لے جانے والے اصلی آدمی کا پتہ نہیں چلا تھا۔ کیونکہ اصلی آدمی تو میں تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میرے دل سے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نتالی کا خیال نکل جاتا۔ مگر ہوا یہ تھا کہ نتالی مجھے پہلے سے زیادہ شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ میرا یہ سفرنامہ پڑھنے والوں میں سے اگر کسی نے محبت کی ہے تو وہ میرے جذبات کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ محبت ایک عجیب و غریب جذبہ ہے اور جوانی میں جو محبت کی جاتی ہے' اس کی شدت کی جوالا مکھی' پہاڑ کے کھولتے ہوئے لاوے سے کم نہیں ہوتی۔ ہم بڑے ہو کر لاکھ نصیحتیں کریں مگر جوان دلوں پر محبت کا نقش کبھی نہیں مٹتا۔ میرا بھی نتالیا کے بغیر یہی حال ہو رہا تھا۔

سارا دن تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ نتالی کا خیال آتا اور میں اس کے تصور میں گم ہو جاتا۔ رات کو کلب جاتا تو دوسری لڑکیوں کو فلور پر ڈانس کرتے دیکھ کر بے اختیار نتالی کا تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ ایک بار تو میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس جذباتی عذاب کو سہنے سے یہی بہتر ہے کہ میں وینس چھوڑ کر فلارنس یا نیپلز یا روم کے شہر میں چلا جاؤں۔

مجھے اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کا پورا پتہ تھا کہ میں دور ہو کر اپنی محبت کے اور قریب ہو جاؤں گا۔ پھر مجھے نتالی پہلے سے زیادہ یاد آئے گی۔ یہاں تو پھر بھی یہ امید ہے کہ شاید کبھی نتالی کی صورت دکھائی دے جائے'

اٹلی کے دوسرے شہروں میں چلا گیا تو وہاں تو یہ امید بھی ختم ہو جائے گی۔

اسی حالت میں تین مہینے گذر گئے۔ موسم سرما گذر گیا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہونے لگا۔ جن درختوں کے پتے سوکھ کر گر چکے تھے۔ ان کی شاخوں پر نئی نئی کونپلوں کی آنکھیں نکلنے لگیں۔ رات کو سردی کم ہو گئی تھی۔ ایک رات میں کلب سے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے عقبی دروازے سے باہر نکلا تو گیراج کے باہر ایک جانب اندھیرے میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب سے گذرا تو کسی نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

گیراج کی مدھم بتی کی روشنی میں مجھے پرانی سی کار کے پاس ایک لڑکا کھڑا نظر آیا جس کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ اس نے دوسرا سوال کیا: "سینور! تم کس ملک سے آئے ہو؟"

میں نے کہا: "پاکستان سے۔۔کیوں۔کیا معاملہ ہے؟"

لڑکا میرے قریب آگیا۔ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور بولا: "مجھے آپ کا جو حلیہ بتایا گیا تھا' میں نے اس سے آپ کو پہچانا ہے۔ آپ کا نام اور ملک کا نام بھی وہی ہے جو مجھے بتایا گیا تھا۔ کیا آپ نتالی کو جانتے ہیں؟ یہ میرا آخری سوال ہے؟"

میں سمجھ گیا کہ اسے نتالی نے بھیجا ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ عقبی گلی رات کے وقت بالکل خالی تھی۔

"نتالی کہاں ہے؟"

لڑکے نے لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا: "سینور! یہ لفافہ نتالی نے دیا ہے کہ آپ کو پہنچادوں۔ اس میں سب کچھ لکھا ہو گا۔"

یہ کہہ کر لڑکا گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ

کر کے تیزی سے گلی میں آگے نکل گیا۔ میں نے لفافے کو فوراً اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا سڑک پر آگیا۔ سامنے بس سٹاپ تھا جہاں مجھے ہاتھ دے کر بس کو کھڑا کرنا تھا۔ نتالی کے خط نے میرے جذبات محبت میں ایک ہیجان سا برپا کر دیا تھا۔ میں پہلی فرصت میں خط کو پڑھنا چاہتا تھا مگر بس سٹاپ پر دو عورتیں پہلے سے کھڑی تھیں۔ پچھلے پہر کی ہوا میں اب سردیوں کی راتوں والی تیزی اور شدت نہیں تھی۔ ایک عورت بوڑھی تھی جو بنچ پر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔ دوسری عورت نے بہت زیادہ میک اپ کیا ہوا تھا اور کھڑے کھڑے کسی وقت پرس سے چھوٹا شیشہ نکال کر کھمبے کی روشنی میں اپنا میک اپ ٹھیک کرنے لگتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی اور کہاں جا رہی تھی۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس وقت میرے ذہن میں سوائے نتالی کے اور کسی کا خیال نہیں تھا۔ اگر بس سٹاپ کا کیبن خالی ہوتا تو میں وہیں اس کا خط نکال کر پڑھنا شروع کر دیتا۔ اتنے میں بس آگئی۔ میں نے اور اس فیشن ایبل عورت نے ایک ساتھ بس کو ہاتھ دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔ بوڑھی اطالوی عورت بھی اٹھ کر ہمارے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ بس میں تین چار سواریاں پہلے سے بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ میں بھی بس میں سوار ہو گیا۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر شیشے میں سے باہر دیکھنے لگا۔ فیشن ایبل عورت میرے ساتھ والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ گھٹیا قسم کے پرفیوم کا جھونکا میرے قریب سے ہو کر گذر گیا۔ عورت نے پرس میں سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ منہ میں دبایا اور مجھ سے لائیٹر مانگا۔ میں نے لائیٹر نکال کر اسے دے دیا۔ مجھے اس وقت کسی عورت کی مداخلت ہرگز پسند نہیں

آسکتی تھی۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا۔

عورت نے سگریٹ سلگایا تو پیچھے سے کسی کی آواز آئی: "بس میں سگریٹ پینا منع ہے۔"

میرے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت نے سگریٹ منہ سے نکال کر پاؤں تلے مسل دیا اور جس مرد نے آواز دی تھی' اسے منہ ہی منہ میں گالی دی اور میرے کندھے سے کندھا ملا کر کہا: "ہر شخص کو آزادی ہونی چاہئے' سگریٹ پینے کی اور محبت کرنے کی بھی۔ کیوں سینور! تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اسے اپنا خیال بتاتا۔ کیونکہ میں نتالی کے خیال میں' اپنی محبت کے پاکیزہ خیال میں تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھنے لگا۔ شیشہ بند تھا۔ اس میں سے بھی مجھے بس کی روشنی میں اسی عورت کا اور اپنا عکس ہی نظر آیا۔

اس عورت نے اب یہ کیا کہ مجھ پر اپنا بوجھ ڈالنا شروع کر دیا۔ تب میں نے اسے ذرا پیچھے دھکیلتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اطالوی میں کہا: "سینوریتا! میں شریف آدمی ہوں۔ میں جانتا ہوں تم کیا چاہتی ہو۔ مگر اس وقت میں ذہنی طور پر بہت مصروف ہوں اور تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ بہتر ہے کہ تم گھر جا کر آرام کرو۔"

وہ مسکرائی اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

سلیمان ابھی تک رات کو ہی ٹیکسی چلاتا تھا اور صبح کسی وقت آتا تھا۔ میں فلیٹ پر گیا تو حسب معمول وہ نہیں آیا ہوا تھا۔ کیونکہ اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں نے بتی جلائی اور جلدی سے لفافہ کھول کر بیٹھ گیا۔ لفافے کے اندر نتالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مختصر سا خط تھا۔ یہ اس

نے انگریزی میں لکھا تھا تاکہ میں اچھی طرح سمجھ سکوں۔ اس نے لکھا تھا

"میرے پیارے ------ اس وقت میں اپنی زندگی کے دوراہے پر کھڑی ہوں' ایک طرف گناہ کا جہنم ہے' دوسری طرف پاک صاف زندگی کا فردوس ہے' اس وقت صرف تم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جنت کی راہ پر چلا سکتے ہو۔ اگر تم ایسا فیصلہ کر لو تو سنو! ایئر پورٹ کے پیچھے پارکنگ لاٹ ہے۔ پارکنگ لاٹ کے کونے پر وینس دیوی کا ایک سنگی مجسمہ لگا ہوا ہے۔ تم کل رات کے گیارہ بجے آجانا۔ وہاں تمہیں ایک گاڑی کے پاس وہی لڑکا ملے گا جس نے تمہیں میرا خط دیا ہے۔ اگر تم آگئے تو یقین کرو جہنم سے نکل کر نیکی کے راستے پر میرا سفر شروع ہو جائے گا اگر تم نہ آئے تو پھر جہنم کے شعلے تو میری قسمت میں لکھے ہی ہوئے ہیں۔

تمہاری نتالی!"

خط کو میں نے کئی مرتبہ پڑھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ نتالی کل رات کے گیارہ بجے ایئر پورٹ کے پارکنگ لاٹ میں کہاں سے آئے گی۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ جن بدمعاشوں میں گھری ہوئی ہے' کسی نہ کسی طرح ان کے چنگل سے نکل کر ہی آئے گی۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی منصوبہ ضرور بنا رکھا ہو گا۔ اس وقت مجھے اس کا ساتھ دینا چاہئے۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا مگر اتنا ضرور مجھے کرنا چاہئے تھا کہ وہ بری زندگی سے نکل کر اچھی زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

میں نے دوسری رات گیارہ بجے ایئر پورٹ پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے جینز کی پچھلی جیب میں خط سنبھال کر رکھ لیا اور بتی بجھا کر لیٹ گیا۔ دیر تک سوچتا رہا۔ نتالی کس طرف سے آئے گی؟ مارکو کے بدمعاشوں کو پتہ چل گیا

تو ضرور اس کے پیچھے بھاگیں گے۔ ہو سکتا ہے گولیاں بھی چلیں۔ میرے پاس جو ریوالور تھا' وہ ساشی نے واپس لے لیا تھا۔ میں نے خالص پنجابیوں کی طرح اپنے آپ سے کہا: "یار' دیکھا جائے گا۔ جو ہوتا ہے' ہو جائے' اللہ مالک ہے۔ "

اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے روز میں شام کو کلب اپنی ڈیوٹی پر گیا تو میں نے جاتے ہی بروٹو سے کہا کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' ٹمپریچر بھی ہے' مجھے دس بجے چھٹی دے دیجئے گا۔ بروٹو نے خشمگیں آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے ہلکی سی گالی دے کر بولا: "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ٹھیک ہے چلے جانا دس بجے۔ مگر میں پانچ گھنٹوں کے پیسے کاٹ لوں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور یونہی سوں سوں کرتا جیسے مجھے زکام بھی ہو' ٹرے اٹھا کر مشروبات کے شیلف کی طرف چل دیا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ نتالی مجھے کہاں لے جائے گی؟ ضرور اس نے کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہو گا۔ ہو سکتا ہے مارکو کے آدمی اسے کسی دوسرے شہر لے جانے کے لئے ایئرپورٹ پر لا رہے ہوں اور نتالی نے وہیں سے فرار ہو جانے کا منصوبہ تیار کر رکھا ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن میں ایئرپورٹ پر جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔

ایئرپورٹ کو L-17 نمبر کی بس جاتی تھی۔ یہ مجھے معلوم تھا۔ یہ بس ہمارے کلب سے کوئی چار بلاک کے فاصلے پر ایک چوک سے روانہ ہوتی تھی۔ میں پونے دس بجے ہی بروٹو سے چھٹی لے کر بس سٹاپ پر آ گیا۔ وہاں سے جلدی جلدی پیدل ہی چلتا ایئرپورٹ والے بس سٹاپ پر پہنچ گیا۔ اس وقت

وینس کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ چوک روشنیوں سے جگ مگ کر رہا تھا۔ نیون سائینز کی رنگ برنگ روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ سڑک پر کافی رش تھا۔ بس سٹاپ پر دوسرے لوگ بھی کھڑے تھے۔ بس آئی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ ایئرپورٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر زیادہ دور ہوتا تو میں ضرور کوئی ٹیکسی پکڑ لیتا۔ پندرہ منٹ بعد بس نے مجھے ایئرپورٹ پہنچا دیا۔ میں ایئرپورٹ کے مین گیٹ کے سامنے سے ہو کر عقبی پارکنگ لاٹ کی طرف چل پڑا۔ یہ کوئی چھوٹا ایئرپورٹ نہیں تھا۔ بڑا کشادہ رقبہ تھا۔ سامنے والے پارکنگ لاٹ میں گاڑیاں ہی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لوگ مین گیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک جمبو جیٹ جہاز ایئرپورٹ کے اوپر سے گذر گیا۔ وہ اتنی کم بلندی پر تھا کہ اس کی کھڑکیوں کی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

ایئرپورٹ کا عقبی پارکنگ لاٹ بھی گاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔

میں پارکنگ لاٹ کے کونے کی طرف بڑھا۔ وہاں دور ہی سے مجھے ایک مجسمہ دکھائی دیا۔ یہ وینس دیوی کا مجسمہ تھا جو ایک چبوترے پر کھڑا تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ وہاں کونے میں کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی اور وہ لڑکا بھی نہیں تھا جو مجھے نتالی کا خط دے گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ساڑھے دس نہیں بجے تھے۔ کافی وقت تھا۔ میں وہاں سے ہٹ کر نیم دائرے میں بنی ہوئی دکانوں کی طرف آگیا جن کے شیشے روشنیوں میں چمک رہے تھے۔ شوکیسوں میں عورتوں اور مردوں کے مجسّمے کھڑے تھے' ان مجسّموں نے نئے فیشن کے لیڈیز اور مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں ایک کتابوں کی دکان بھی تھی۔ میں دکان میں آکر شیلفوں میں لگی کتابیں دیکھنے لگا۔ زیادہ کتابیں اطالوی زبان میں تھیں۔ انگریزی کی کلاسیکی کتابیں بھی تھیں۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کی اطالوی اور انگریزی دونوں جلدیں رکھی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں دانتے کے شہر فلارنس بھی ضرور جاؤں گا۔ فلارنس میں اس عظیم اطالوی شاعر کا گھر ابھی تک محفوظ ہے۔ جس طرح ہمارے عظیم شاعر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا گھر سیالکوٹ میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ افسوس کہ ہمارے پنجابی کے عظیم شاعر وارث شاہ کی کوئی بھی چیز ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے' مگر ہم

پس ماندہ یا ترقی پذیر قوم ہیں۔ ہمارے ہاں ان چیزوں کی کون پروا کرتا ہے۔ ہم بادشاہوں کے مقبروں اور غسل خانوں کی تو سرکاری طور پر حفاظت کرتے ہیں اور ان کے بوسیدہ شاہی لباس کو عجائب گھروں میں سجا سجا کر رکھتے ہیں مگر کلاسیکل صوفی شاعری کے شہنشاہ وارث شاہ اور میاں محمد صاحب کے کلام کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کی ٹکسالی کے باہر ایک کوٹھڑی ہی یادگار کے طور پر رہ گئی ہے اس کی بھی دیواریں گرنے کو ہیں۔

میں یونانی دیوی وینس کا وہ مجسمہ دیکھ رہا تھا جو کتابوں کی دکان میں دانتے اور ہومر کی کتابوں کے درمیان سجا ہوا تھا۔ میں پھرتے پھراتے کتابوں کی دکان کے دوسرے دروازے سے نکل کر پیچھے کی جانب آ گیا۔ میرا ارادہ تھوڑی دیر وہاں چل پھر کر وقت گذارنے کا تھا۔ کیونکہ وہاں گول چبوترے کے اندر شفاف پانی کا فوارہ اچھل رہا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار ہو گیا ہوا تھا۔ سردی کی شدت ختم ہو چکی تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ صرف رات کو ذرا ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ فوارے کے پیچھے ایک کشادہ سڑک تھی جس پر سے کاریں اور ٹریلر وغیرہ گذر رہے تھے۔ سڑک کے عقب میں ایک عالی شان بلند و بالا عمارت تھی جس کی شیشے کی دیواریں تھیں۔ دیواروں کے اندر پردے پڑے تھے جن پر دھیمی دھیمی روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ کوئی فائیو سٹار یا تھری سٹار ہوٹل لگ رہا تھا۔ میں فوارے کے پاس لکڑی کے بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے اور فوارے پر پڑتی رنگ برنگی روشنیوں کا نظارہ کرنے لگا۔

میں نے سگریٹ ختم کر کے گھڑی دیکھی۔ رات کے گیارہ بجنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے۔ میں اٹھ کر کتابوں کی دکان کے اندر سے ہوتا ہوا پارکنگ لاٹ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں فٹ پاتھ پر تھا۔ درمیان میں

سڑک تھی جو ایئر پورٹ کی وسیع و عریض عمارت کے گرد اگرد جاتی تھی۔ سامنے کونے میں وینس دیوی کا سنگ مرمر کا مجسمہ تھا۔ ابھی تک اس کے نیچے کوئی گاڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سب گاڑیاں پارکنگ لاٹ میں ہی کھڑی تھیں۔ نئی گاڑیاں بھی پارکنگ کے گیٹ میں سے داخل ہو کر وہیں جا کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔ اس دوران کئی جہاز وینس کے ایئر پورٹ پر اترے اور کئی جہازوں نے ٹیک آف کیا۔ جن کی آوازیں میں سنتا رہا۔ لینڈ کرنے والے دو تین جہاز ایئر پورٹ کی عمارت کے اوپر سے بھی گذرے۔ جب گیارہ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تو میری بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ اچانک ایک جانب سے ایک پرانی سی کار آکر وینس کے مجسّمے کے ذرا پیچھے اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے گاڑی پر نظریں جما دیں۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا۔ میں نے دور ہی سے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس نے مجھے نتالی کا خط لا کر دیا تھا۔ میں فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک کراس کر کے اس کے پاس آ گیا۔ لڑکا گاڑی کے بونٹ کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔

اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اندر بیٹھ گیا۔ وہ دروازہ بند کرنے لگا تو میں نے اٹالین میں پوچھا: "سینوریتا کہاں ہے؟"

لڑکے نے بند کھڑکی کے شیشے کے قریب منہ لا کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ وہ مجھے خاموش رہنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں گاڑی کی پچھلی

سیٹ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے انگریزی فلموں کے سین یاد آ رہے تھے۔ خدا جانے نتالی نے کس طرف سے آنا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جس قسم کا کلائمیکس پیدا کیا جا رہا ہے' یہ کوئی مار کٹائی اور وائلنس کا سین ہی ہو گا۔ دھڑا دھڑ فائرنگ ہو گی' نتالی بھاگتی ہوئی آئے گی اور دور ہی سے چلا کر کہے گی: "گاڑی سٹارٹ کرو۔"

اور پھر دھم سے گاڑی میں اپنے آپ کو گرا دے گی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ گاڑی کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیوں نے بتایا کہ پورے گیارہ بج گئے ہیں۔ پراسرار لڑکے نے بھی اپنی گھڑی پر وقت دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

زبردست سسپنس پیدا ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کوئی دھماکہ ہو گا۔ اچانک مجھے ایک زبردست دھماکے کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ میرا وہم ہے۔ مگر دھماکہ اس قدر شدید تھا اور اتنی زبردست آواز پیدا ہوئی تھی کہ لوگ ایئرپورٹ سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف دوڑتے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ کسی تخریب کار نے ایئرپورٹ کے اندر بم پھینک دیا ہے۔ میں نے لڑکے سے کہا: "کوئی بم پھٹا ہے۔ نتالی ابھی تک کیوں نہیں آئی۔"

پراسرار لڑکے نے اب بھی مجھے کوئی جواب نہ دیا اور ونڈ سکرین پر آگے کو جھکا غور سے ایئرپورٹ کے مین گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے انجن سٹارٹ کر دیا۔

مین گیٹ میں سے لوگ گھبراہٹ کے ساتھ باہر بھی نکل رہے تھے اور کچھ دوڑ کر اندر بھی داخل ہو رہے تھے۔ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔ اتنے میں مجھے نتالی نظر آئی۔ وہ لمبے کوٹ میں تھی۔ اس کے سر پر ہیٹ تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے تقریبا دوڑتی ہوئی ہماری گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ لڑکے نے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر اس طرح گھمایا کہ میرے برابر والی خالی سیٹ سڑک کی جانب ہو گئی۔ لڑکے نے کہا: "دروازہ کھول دو سینور۔ "

میں نے دروازہ کھول دیا۔ نتالی قریب آ چکی تھی۔ وہ جلدی سے گاڑی میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر کے سر کو سیٹ کے پیچھے لگا کر نیچے کھسک گئی تاکہ وہ باہر سے کسی کو نظر نہ آ سکے۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا تھا اور کانپ رہا تھا۔

گاڑی ایئر پورٹ کی عقبی سڑک پر سے نکل کر فوارے کے پیچھے جو بڑی سڑک تھی، اس پر آ گئی۔ یہاں سے گاڑی نے دائیں جانب ٹرن لیا تو میں نے دیکھا کہ ایئر پورٹ کے عقب میں جو ہوٹل کی شاندار بلڈنگ تھی، اس کی چوتھی منزل کے ایک کمرے سے آگ کے شعلے اور دھواں باہر نکل رہا تھا۔ آگ بجھانے والے انجن کا سائرن زور زور سے بج رہا تھا اور لوگ ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر تماشائیوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہماری گاڑی ہوٹل کے پہلو سے ہو کر آگے نکل گئی۔ نتالی نے ابھی تک مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور ہم کہاں جا رہے ہیں؟۔

میں بھی سیٹ پر کھسک کر نیچے ہو گیا تھا۔ میں نے نتالی کی طرف

جھک کر پوچھا: "تم ٹھیک ہو ناں؟"

نتالی نے جواب دینے کی بجائے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ گرم اوور کوٹ کے اندر سے مجھے اس کے دل کی دھڑکن محسوس ہونے لگی۔ نتالی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے لڑکے کا نام لے کر اطالوی میں کہا: "گاڑی تیز کر دو۔"

گاڑی کی رفتار مزید تیز ہوگئی۔ شہر کی بارونق سڑکیں اور جگمگاتی عمارتیں پیچھے رہ گئیں اور گاڑی ہائی وے پر آکر فل سپیڈ کے ساتھ شمال کی طرف روانہ ہوگئی۔ تب میں نے نتالی سے پوچھا: "ہم کس طرف جا رہے ہیں؟"

اب ہم سیٹ پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ مگر نتالی نے ہیٹ کو ماتھے پر آگے کو اس طرح جھکایا ہوا تھا کہ کوئی گذرتی گاڑی میں بیٹھا اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نتالی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اب اس کا ہاتھ گرم تھا اور کپکپا بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھ ٹھیک ہوگئی تھی۔ سوجن کا بھی کہیں نام و نشان باقی نہ تھا۔ وہ بھرپور میک اپ میں تھی۔ جب اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو میں نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے پوچھا: "اتنا بھاری میک اپ کر کے تم کہاں جا رہی تھیں؟"

نتالی نے بڑی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا: "میں صرف تمہارے پاس آ رہی تھی۔"

میں نے پوچھا: "اچھا یہ بتاؤ پلیز کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور ہوٹل میں یہ دھماکہ کیسا ہوا تھا؟"

نتالی نے میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا: "سب کچھ بتا دوں گی۔ ابھی

ابھی خاموش رہو۔"

وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گردن گھما کر پچھلے شیشے میں سے ہائی وے کو دیکھ لیتی تھی۔ اس نے ایک بار ڈرائیور لڑکے سے اطالوی زبان میں کہا: "کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا ناں۔"

لڑکے نے اوپر لگے شیشے کی طرف غور سے تکنے کے بعد کہا: "نہیں، ابھی تک کوئی نہیں ہے۔"

نتالی نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہا: "میں بہت تھک گئی ہوں۔ میرے اعصاب شل ہو چکے ہیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے سونے کی کوشش کرتی ہوں۔"

اس نے سر سیٹ کی پشت سے لگا کر فیلٹ ہیٹ اپنے چہرے کے اوپر کر لیا۔ میں نے بھی اپنا سر پیچھے لگا دیا۔ گاڑی ایک نپی تلی رفتار کے ساتھ ہائی وے پر دوڑی جا رہی تھی۔ ہمارے آگے پیچھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دوسری گاڑیاں بھی تھیں۔ میں نے سپیڈو میٹر کی سبز روشنی میں دیکھا۔ ہماری رفتار ستر میل فی گھنٹہ تھی۔ ہم وینس شہر کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل آئے تھے۔ اب ہائی وے پر گاڑیوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ نتالی سو گئی ہو گی۔ مگر وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں کہا: "تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے اطالوی زبان میں میرے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا: "نتالی! میں جو کچھ کر رہا ہوں، صرف اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

یہ اعتراف میں نے پہلی بار اس کے سامنے کیا تھا اور اس کے کان

کے قریب منہ لے جاکر کیا تھا۔ نتالی نے فیلٹ ہیٹ چہرے کے آگے سے ہٹاکر میری طرف دیکھا۔ گاڑی کے اندر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ باہر سے کوئی گاڑی گذرتی تو اس کی روشنی اندر چمک جاتی تھی۔ لیکن اتنا اندھیرا بھی نہیں تھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ میں نے دیکھا کہ نتالی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ پھر اس نے اپنا چہرہ میرے بازو میں چھپایا اور ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگی۔ میں خاموش رہا اور اپنا بازو اس کے گرد ڈال کر اس کے بازو کو آہستہ آہستہ تھپتھپانے لگا۔ میں نے دل میں سوچا کہیں میں نے نتالی کے آگے جھوٹ تو نہیں بول دیا۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ میں بڑی آسانی سے جھوٹ بول دیا کرتا تھا۔ اور خاص طور پر پاکستان میں' میں نے کئی لڑکیوں کے آگے جھوٹ بولا تھا اور ان سے محبت نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں یقین دلایا تھا کہ میں ان سے شدید محبت کرتا ہوں۔

لیکن میں نے نتالی کے آگے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہ میں آپ کے سامنے بھی کہتا ہوں کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ کیونکہ میں نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں جو کچھ لکھوں گا' جو کہوں گا' سچ کہوں گا' سچ لکھوں گا۔ اس واقعے کو جبکہ اتنے سال بیت گئے ہیں' اب جب میں اپنا سفرنامہ اور سرگذشت لکھنے بیٹھا ہوں تو ہر چیز کھل کر میرے سامنے آرہی تھی۔ یقین کریں کہ میں واقعی نتالی سے محبت کرنے لگا تھا۔ ورنہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے ایسا آدمی جو لڑکیوں کے آگے اکثر جھوٹ بولتا ہو' ایک غیر ملکی لڑکی کے لئے اپنی جان پر کھیل جانے کے لئے تیار ہو جاتا۔

رات آدھی گذر چکی تھی کہ ہم وینس سے آگے اٹلی کے شمال مشرقی شہر پڈووا پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے ریل پکڑی اور اٹلی کے دوسرے

شہر ویرونا کے لئے چل پڑے۔ پراسرار لڑکا یہاں ہم سے جدا ہو گیا۔ میں نے نتالی سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اسکی بڑی بہن کا بیٹا ہے اور پڈووا میں جاب کرتا ہے۔ نتالی نے اسے اسی مقصد کے لئے پڈووا سے وینس بلایا تھا۔ کیونکہ وینس میں وہ کسی دوسرے آدمی پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ساشی کے قتل پر افسوس کا اظہار کیا تو نتالی کا چہرہ اداس ہو گیا۔ کہنے لگی: "وہ میری ایک ہی سہیلی تھی۔ میری خاطر اس نے اپنی جان قربان کر دی۔ میں اس کے احسانوں کو مرتے دم تک کبھی نہ بھلا سکوں گی۔"

میں نے پوچھا: "آخر ہوا کیا تھا۔ ساشی کے فلیٹ پر کون لوگ تم دونوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے؟"

نتالی نے کہا: "مارکو کے آدمیوں کے سوا اور کون لوگ ہو سکتے ہیں۔"

"وہ تمہیں کہاں لے گئے تھے اور ساشی کو انہوں نے اسی روز قتل کیوں نہیں کر دیا۔"

وہ کہنے لگی: "ہم دونوں کو مارکو کے اسی فارم میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں سے تم اور ساشی مجھے نکال کر لے آئے تھے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ساشی کے ساتھ وہ کون تھا جس نے ان کے آدمی کو شدید زخمی کیا تھا اور مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ساشی اکیلی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔"

"پھر کیا ساشی نے انہیں میرے بارے میں بتا دیا؟"

میں نے ابھی نتالی سے یہ بات پوشیدہ رکھی تھی کہ مارکو کے دو غنڈے باکسر میری تلاش میں کلب میں بھی آئے تھے اور انہوں نے میرے

بارے میں مجھ ہی سے پوچھ گچھ کی تھی اور تب مجھے پتہ چلا تھا کہ ساشی نے انہیں میرا نام اور حلیہ اصلی نہیں بتایا۔ نتالی کہنے لگی: "انہوں نے ساشی کو بڑی سخت اذیتیں دیں' اسے بہت مارا پیٹا مگر اس نے تمہارا نام نہ لیا۔ ساشی نے مجھے بتایا تھا کہ اذیتوں سے تنگ آکر اس نے مارکو کے غنڈوں کو تمہارا غلط نام اور غلط حلیہ بتادیا تھا۔"

میں نے نتالی کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "ساشی بڑی گریٹ عورت تھی نتالی! اب میں تمہیں بتاتا ہوں۔ کلب میں مارکو کے آدمی میرا پتہ معلوم کرنے آئے تھے....."

پھر میں نے نتالی کو سارا واقعہ بیان کردیا۔ اور کہا: "مجھے یہ بتاؤ کیا وہ بدمعاش گارڈ میرا پتھر لگنے سے مرگیا تھا؟"

نتالی نے کہا: "نہیں' وہ زندہ بچ گیا تھا مگر شدید زخمی ہوگیا تھا اور اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ابھی تک وینس کے ہسپتال میں ہے۔"

"کیا انہوں نے تم پر تشدد نہیں کیا؟ تم سے میرے بارے میں نہیں پوچھا؟" میں نے نتالی سے سوال کیا۔

وہ کہنے لگی: "اصل میں اب وہ مجھ پر مزید تشدد کرکے میرا حلیہ بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مجھ سے وہ کام لینا تھا جس کا دھماکہ تم نے آج ایئرپورٹ کے پاس سنا تھا۔"

میں نتالی کا منہ تکنے لگا۔ میں نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا: "تو کیا یہ دھماکہ تم نے کیا تھا نتالی؟"

نتالی نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اپنا سر ٹرین کی کھڑکی کے ساتھ لگادیا جس پر سفید پردے آدھے کھنچے ہوئے تھے۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور ٹرین

شمالی اٹلی کے پہاڑی علاقے میں سے گذر رہی تھی۔ نتالی اپنے ساتھ کافی پیسے لے کر آئی تھی۔ اس نے پڈووا سے ویرونا تک کے لئے فسٹ کلاس کا ایک دو آدمیوں کا کوپے لے لیا تھا اور ہم اسی فیملی کوپے میں سفر کر رہے تھے۔ آمنے سامنے دو بستر لگے تھے اور ان پر صاف ستھری سفید چادریں بچھی تھیں اور گولڈن کلر کے کمبل بڑی نفاست سے تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے نتالی سے اپنا سوال دہراتے ہوئے پوچھا: "نتالی! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا وہ دھماکہ تم نے کیا تھا؟"

نتالی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں۔ وہ دھماکہ میں نے ہی کیا تھا مگر جہاں مارکو دھماکہ کرانا چاہتا تھا وہاں نہیں کیا تھا۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔"

میں نے کہا: "پلیز نتالی! مجھے سب کچھ بتاؤ۔ سب کچھ کیونکہ میں تم سے پیار کرتا ہوں اور میں تمہارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ مجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ میں نے تمہاری خاطر جان کی بازی لگا دی تھی اور یقین کرو اگر وقت پڑا تو میں تم پر اپنی جان بھی نچھاور کر سکتا ہوں۔"

نتالی پر میرے جملوں کا شدید اثر ہوا۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ عورت چاہے کالا شاہ کاکو کی ہو، چاہے پیرس کی۔ وہ محبت اور خلوص کی پیاسی ہوتی ہے۔ وہ خود بھی اندر سے محبت اور خلوص کا پیکر ہوتی ہے۔ اس کے دل کے کسی نہ کسی کونے میں محبت، مامتا اور سچائی اور قربانی اور ایثار کا سرچشمہ ابل رہا ہوتا ہے اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے خلوص کو پہچانے، اس سے سچا پیار کرے اور اس کو قربانی اور ایثار کا موقع دے۔ مرد نے عورت کو

بہت ہی کم سمجھا ہے۔ اس نے اسے اپنے جذبات کا کھلونا بنایا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر نہیں دیکھا کہ اصل عورت محبت' پیار' خلوص اور ایثار کا نام ہے۔

ویرونا ایکسپریس تیزی سے شمالی اٹلی کے پہاڑی علاقے میں بھاگتی چلی جارہی تھی۔ ابھی باہر آسمان پر سپیدہ سحر نمودار نہیں ہوا تھا۔ میں نے نتالی سے بم دھماکے کے متعلق دوبارہ سوال کیا تو اس نے مجھے ساری کہانی سنائی۔ میں اس کہانی کو جو سچے واقعات پر مشتمل تھی' اپنی زبان میں بیان کرتا ہوں۔ مارکو اٹلی کے وینس کے علاقے میں مافیا کا ہیڈ تھا۔ سیاسی قتل' دہشت گردی' ارب پتی تاجروں کا کاروباری رقابت کی بناء پر قتل اور اغوا برائے تاوان۔۔۔ ۔۔یہ مارکو کے گینگ کی سرگرمیاں تھیں۔ اٹلی میں مافیا کے سربراہ کا مارکو کو حکم ملا کہ اٹلی کا ارب پتی تاجر زاویرے وینس میں کاروباری دورے پر آیا ہوا ہے' اسے قتل کرنا ہے۔ بس صرف دو لفظی حکم تھا۔ مارکو نے فورا تیاری شروع کر دی۔

اسے معلوم ہوا کہ وینس کے فائیو سٹار ہوٹل میں زاویرے نے کچھ کاروباری لوگوں کو کھانے پر بلایا ہے۔ اس نے نتالی کو یہ مشن سونپ دیا۔ نتالی اس وقت تک تشدد اور گھناؤنی جسمانی اذیتوں سے نڈھال ہو کر اپنے آپ کو مارکو گینگ کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن دل میں وہ کسی موقع کی تلاش میں تھی۔ آج اسے موقع مل گیا تھا۔ کیونکہ اسے کسی وقت بھی تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ گینگ کے دو غنڈے پستولیں جیب میں ڈالے سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ جب اسے بتایا گیا کہ فلاں دن' رات کے اتنے بجے اسے ایئر پورٹ کے عقب والے فایئو سٹار ہوٹل میں ارب پتی زاویرے کو

بم کے دھماکے سے ہلاک کرنا ہے تو نتالی کو امید کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔ اس نے اپنے ذہن میں سارا پروگرام تیار کرلیا اور اپنے بھانجے سے کسی طرح رابطہ کرلیا اور اس کے ہاتھ میرے نام خط روانہ کردیا۔ نتالی اس فائیو سٹار ہوٹل کے سارے باہر نکلنے والے راستوں سے واقف تھی۔ اس کے ذمے جو کام سونپا گیا تھا' وہ یہ تھا۔۔۔۔!

وہ رات کے نو بجے فائیو سٹار ہوٹل کے ایک خاص کمرے میں پہنچے گی۔ وہاں اسے ویٹرس کا لباس پہنایا جائے گا۔ ایک ٹرالی پر کافی کا سارا سامان رکھا ہو گا۔ وہ ڈنر کے بعد کافی کی ٹرالی لے کر ڈائننگ روم میں سیدھی ارب پتی زاویرے کی کرسی کے پیچھے جائے گی اور ٹرالی اس کے عقب میں ستون کے پاس رکھ کر واپس آجائے گی۔ ٹرالی میں جو کافی گلدان رکھا ہو گا' اسی میں پلاسٹک کا زبردست دھماکے سے پھٹنے والا بم رکھا ہوا ہو گا۔ اس بم کو ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے چلایا جانا تھا۔ نتالی بم والی ٹرالی وہیں چھوڑ کر واپس اسی کمرے میں آجائے گی جہاں وہ ویٹرس والی وردی اتار کر اپنے کپڑے پہن لے گی۔ اس دوران ایک آدمی ہیڈ بیرے کی وردی میں برابر اس کی نگرانی کر رہا ہو گا۔ وقت مقررہ پر نتالی کو گاڑی میں بٹھا کر فائیو سٹار ہوٹل پہنچادیا گیا۔ اسے عقبی دروازے سے اوپر کمرے میں پہنچادیا گیا جہاں مارکو کے تین آدمی پہلے سے موجود تھے۔

ہوٹل کی ایک ویٹرس بھی بیڈ روم میں بند تھی۔ اس ویٹرس کی وردی اور نمبر اور لگا کر نتالی نے کافی کی ٹرالی ارب پتی زاویرے کی میز کے عقب میں میں لے جانی تھی۔ نتالی کو ایک آدمی بیڈ روم میں لے گیا۔ وہاں اصلی ویٹرس کے منہ پر سکاچ ٹیپ لگی تھی۔ اس کی وردی اتروا کر نتالی کو پہنائی گئی۔ جو وقت آپریشن شروع کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ٹھیک اس

جو وقت آپریشن شروع کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ٹھیک اس وقت مارکو کے خاص آدمی سارتو نے ڈرائنگ روم کے کونے میں تیار رکھی ہوئی کافی کی ٹرالی میں گلدان رکھ دیا اور گلدان رکھنے سے پہلے اس نے گلدستہ نکال کر نتالی کو پلاسٹک کا وہ انتہائی طاقتور بم دکھایا جسے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے کافی کی ٹرالی زاویرے کے عقب میں رکھنے کے ٹھیک دس منٹ بعد پھٹنا تھا کیونکہ اسی وقت ڈنر جاری ہو گا۔ نتالی' سار کو اور دوسرا باکسر اپنی اپنی گھڑیاں دیکھنے لگے۔ یہ گھڑیاں انہوں نے پہلے ہی سے ملا رکھی تھیں۔ جب گھڑی کی سوئیاں ایک خاص ہندسے پر پہنچیں تو سار کو نے چٹکی بجا کر نتالی کو اشارہ کیا۔ نتالی نے ٹرالی کمرے سے باہر نکالی اور کاریڈور میں سے تیزی سے گذرتے ہوئے بڑی راہ داری میں آگئی جہاں سے ہوٹل کے ویٹر وغیرہ کھانے پینے کا سامان لے کر ڈائننگ روم کی طرف جاتے تھے۔ سار کو کمرے میں ہی رہا تھا۔ اس کا ساتھی نتالی کی نگرانی کے طور پر چند قدم پیچھے چلا آرہا تھا۔ جب نتالی ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو نگران جاسوس باہر ایک طرف رک گیا۔ اسے یہاں کھڑے رہ کر نتالی کی واپسی کا انتظار کرنا تھا اور پھر اسے اپنی نگرانی میں واپس کمرے میں لانا تھا جہاں نتالی نے لباس تبدیل کرنا تھا اور پھر تینوں کو فائیو سٹار ہوٹل کی اس منزل کے عقبی لفٹ کے نیچے آجانا تھا اور پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکال کر ہوٹل سے دو فرلانگ دور جا کر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دینا تھا اور ہوٹل کی تیسری منزل کے ڈائننگ روم کو ایک دھماکے کے ساتھ اڑ جانا تھا۔ یہ سارا پروگرام ایک ایک سیکنڈ کے حساب سے طے تھا۔

مگر نتالی نے بھی اپنے دل میں ایک پروگرام طے کر رکھا تھا۔ اسے صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں اس کا محافظ اس کے ساتھ ہی ڈائننگ روم میں

نہ آجائے۔ کیونکہ پھر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اس کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سارکو کا ساتھی جو نتالی کی ٹرالی کے چند قدم پیچھے چل رہا تھا' ڈرائنگ روم کے باہر ہی کھڑا ہو گیا۔ اسکی صرف ایک ہی وجہ تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ ارب پتی تاجر زاویرے نے شہر کے سربر آوردہ تاجروں کو کھانے پر بلا رکھا تھا اور ان میں سے کچھ لوگ سارکو اور اس کے ساتھی کی صورتوں سے واقف تھے اور یہ لوگ انہیں اپنی شکلیں نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ نتالی ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ ڈرائنگ روم میں ڈنر ہو رہا تھا۔ فضا قسم قسم کے نفیس کھانوں کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ ان میں خوش لباس اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین کے قیمتی پرفیومز کی خوشبوئیں بھی شامل تھیں۔ آدمیوں کی باتیں کرنے اور پلیٹوں سے چھری کانٹوں کے ٹکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ نتالی نے جو پروگرام اپنے دل میں طے کر رکھا تھا' اس پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔

نتالی' ٹرالی کو ارب پتی تاجر زاویرے کی کرسی کے عقب میں ستون کے پاس کھڑی کرنے کی بجائے کونے میں جو لفٹ لگی تھی اس کے پاس لے گئی۔ اور لفٹ کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں جو بیرے سروس میں مصروف تھے' انہوں نے نتالی کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ کیونکہ وہ ویٹرس کے لباس میں تھی اور سب یہی سمجھے کہ وہ کافی کی سروس کے سلسلے میں نیچے جا رہی ہو گی۔ لفٹ اوپر سے نیچے آئی۔ دروازہ کھلا۔ نتالی ٹرالی سمیت لفٹ میں داخل ہو گئی اور دوسری منزل کا بٹن دبا دیا۔ دوسری منزل میں وہ لفٹ سے نکلی۔ ساتھ ہی جنیٹرز روم تھا جہاں صفائی وغیرہ کا سامان پڑا رہتا تھا۔ نتالی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

اس نے گلدان اٹھاکر جنیٹرز روم کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کمرہ خالی ہوتا ہے یہاں بم پھٹ بھی گیا تو جانی نقصان نہیں ہو گا۔ اس طرف سٹور روم ہی تھے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے ٹرالی لے کر اوپر تیسری منزل میں آئی۔ ٹرالی کو ایک طرف کھڑا کیا اور تیز تیز قدموں سے ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔ سارکو کا آدمی چند قدموں کے فاصلے پر دیوار سے لگ کر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نتالی کو تیز تیز قدموں سے آتی دیکھ کر وہ واپس پلٹا۔ نتالی نے قریب سے گذرتے ہوئے کہا: "میں نے ٹرالی زاویرے کے پیچھے رکھ دی ہے۔ مجھے باتھ روم میں جانے کی زبردست حاجت ہو رہی ہے۔ تم کمرے میں چلو، میں ابھی آتی ہوں۔"

محافظ نے نتالی کی طرف گھور کر دیکھا۔ نتالی نے مسکرا کر اس کے گال کو آہستہ سے تھپتھپایا اور کہا: "میری جان! مجھ پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں تو اب ساری زندگی تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔"

اور نتالی نے اسکا منہ چوم لیا۔ محافظ نتالی کے جال میں آگیا اور بولا: "جلدی باہر نکلنا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔"

نتالی مسکراتے ہوئے سامنے والے عورتوں کے باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ اس باتھ روم کا عقبی دروازہ دوسری راہ داری کی طرف کھلتا تھا۔ یہ ساری معلومات نتالی نے اپنے بھانجے اور اسی پراسرار لڑکے برونو کی مدد سے معلوم کر رکھی تھیں۔ نتالی نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتی باتھ روم کے عقبی دروازے سے دوسری راہ داری میں آگئی۔ یہاں سے لفٹ میں آئی اور ہوٹل کی لابی میں آگئی اور وہاں سے تیز تیز

چلتی ایئر پورٹ کی سڑک پار کر کے تقریبا دوڑتی ہوئی پارکنگ لاٹ میں وینس کے مجسمے کے پاس پہنچ گئی جہاں میں اور اس کا بھانجا برونو پہلے سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس کے بعد اوپر کیا ہوا؟ نتالی کا غنڈہ محافظ ضرور دو منٹ انتظار کرنے کے بعد باتھ روم میں داخل ہو گیا ہو گا۔ جب اسے اندر نتالی نظر نہیں آئی ہو گی تو وہ دوڑتا ہوا سارکو کے پاس آیا ہو گا اور اسے کہا ہو گا کہ نتالی بھاگ گئی ہے۔ یقیناً سارکو نے یہی فیصلہ کیا ہو گا کہ جتنی جلدی ہو سکے، ہوٹل سے نکل جانا چاہیے اور باہر نکل کر وہ گاڑی میں بیٹھے ہوں گے اور دو فرلانگ یا اس سے بھی کم فاصلے پر جا کر سارکو نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا ہو گا۔ زبردست دھماکے اور آگ کے شعلوں اور دھوئیں کو دیکھ کر کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا ہو گا کہ دھماکہ دوسری منزل کے جنیٹرز روم میں ہوا ہے۔ خود میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا کہ دھماکہ تیسری منزل پر ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے سارکو اور اس کے باکسر ساتھی کو معلوم ہو گیا ہو کہ دھماکہ دوسری منزل میں ہوا ہے اور وہ انتہائی غصے کے عالم میں پستولیں نکال کر گاڑی لے کر نتالی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ مگر اس وقت تک ہم ہائی وے پر بہت دور نکل چکے تھے۔ نتالی نے جو کہانی سنائی، میں اسے بڑے غور سے سن رہا تھا۔ میں نے اسے کہا:

"اب تک تو ان لوگوں کو صاف پتہ چل گیا ہو گا کہ تم نے دوسری منزل میں گلدان رکھا تھا۔ ارب پتی تاجر زاویرے بھی زندہ ہو گا۔ مارکو کے آدمی تمہاری تلاش میں ہوں گے۔"

نتالی کہنے لگی: "وہ اس طرف نہیں آئیں گے جہاں ہم جا رہے ہیں۔

میں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ان لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ ان کے آدمی تو اٹلی کے ہر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔

"ضروری بات ہے کہ انہوں نے پڈووا اور ویرونا شہر میں بھی جہاں ہم جا رہے ہیں' اپنے آدمیوں کو خبردار کر دیا ہو گا۔"

نتالی کہنے لگی: "ویرونا کے لوگ میری شکل سے واقف نہیں ہیں۔ جتنی دیر میں ارجنٹ میل کے ذریعے ان تک میری تصویر پہنچے گی' ہم ویرونا سے بھی آگے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔"

میں کسی حد تک مطمئن ہو گیا مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہم خطرے سے دور نہیں بلکہ خطرے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ میں نتالی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس نے صرف میرے بھروسے پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ صرف اس امید میں کہ میں اسے گناہ کی دلدل سے نکالنے اور ایک بہتر شریفانہ زندگی گذارنے میں مدد دوں گا۔ میں نے اپنی تسلی کے لئے کہا:

نتالی! اگر خدا نہ کرے مارکو کے آدمیوں نے ہمیں پکڑ لیا تو تمہیں تو وہ اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے۔ لیکن مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تمہاری خاطر میں ہر طرح کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔"

نتالی نے اپنا سر میرے کندھے کے ساتھ لگا دیا اور بولی: "اس دفعہ وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کچھ ہو۔ اگر تم چاہو تو ویرونا سٹیشن پر مجھ سے الگ ہو سکتے ہو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔"

میں نے نتالی کا ماتھا چوم کر کہا: "میری جان! تمہارے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے۔"

لیکن میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ویرونا سٹیشن پر نتالی سے الگ ہو جاؤں گا۔ میں نتالی سے محبت ضرور کرتا تھا۔ لیکن اس کی خاطر اپنی جان مزید خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ کیونکہ اب اگر وہ لوگ ہمیں پکڑ لیتے ہیں۔ (اور یقینی بات تھی کہ ایک نہ ایک دن انہوں نے ہمیں پکڑ لینا تھا) تو پھر یا تو مجھے اسی وقت شوٹ کر دیں گے اور یا پھر اتنا تشدد کریں گے، اتنی اذیتیں دیں گے کہ میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔ پردیس میں مجھے ایسی ذلیل موت مرنا ہرگز گوارا نہیں تھا۔ مجھے اپنا گھر، بھائی، بہن اور لاہور شہر کے اپنے دوست یاد آنے لگے تھے۔ اب میرا دماغ میرے ضمیر کو اپنی مرضی کے مطابق سمجھانے لگا کہ یہ نتالی لڑکی محض ایک ڈانسر ہے۔ تم اس کی باتوں پر کیوں اعتبار کرتے ہو۔ ہو سکتا ہے کل کو وہ پھر اسی ڈگر پر آجائے۔ اور پھر تم اس کے ساتھ اگر شادی بھی کر لو گے تو مارکو مافیا کے لوگ تمہیں کبھی نہ کبھی ضرور دبوچ لیں گے۔ نتالی تو بڑے آرام سے اپنی پرانی زندگی اختیار کر لے گی مگر تم رگڑے جاؤ گے۔ آخر یہ اطالوی لڑکی اتنی بھی نیک پروین نہیں ہے۔ ٹرین ویرونا کے ریلوے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی اور میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا تھا اور اب یہ سوچ رہا تھا کہ نتالی کو ریلوے سٹیشن پر کس جگہ اکیلا چھوڑوں؟

ٹرین ویرونا کے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔

اس دوران نتالی نے مجھے بتادیا تھا کہ اسکا پروگرام کیا ہے۔ اٹلی کے اس شمالی شہر سے دور پہاڑی علاقے میں کہیں ایک گاؤں تھا جہاں نتالی کی ایک آنٹی رہتی تھی۔ نتالی میرے ساتھ کچھ روز وہاں روپوش ہو کر رہنے کے بعد سوئٹزرلینڈ کی طرف نکل جانا چاہتی تھی جہاں اس کا ارادہ مجھ سے شادی کر کے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا تھا۔ اس نے یہ پروگرام بنا رکھا تھا اور میں نے یہ پروگرام بنالیا تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہی اسے کسی بہانے ویٹنگ روم میں تھوڑی دیر کے لئے انتظار کرنے کو کہوں گا اور خود شہر میں روپوش ہو جاؤں گا۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ نتالی میرا انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر چلی گئی ہو گی تو ریلوے اسٹیشن پر آکر اٹلی کے کسی دوسرے شہر کی طرف رفو چکر ہو جاؤں گا۔ پاسپورٹ ہر وقت میں اپنی جیکٹ کی اندر کی جیب میں ہی رکھتا تھا۔ میرے پاس اتنی رقم بھی تھی کہ میں وہاں سے میلان کے شہر تک بآسانی جا سکتا تھا۔ میلان اٹلی کے شمال میں ایک بڑا شہر تھا۔ وہاں مجھے

کسی نہ کسی کلب میں کام مل سکتا تھا۔ تھوڑا بہت وہاں کماؤں گا اور پھر وہاں سے کسی دوسرے شہر چلا جاؤں گا۔

ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوگئی تھی۔ اس وقت سورج غروب ہوچکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہوگئے تھے۔ عجیب اتفاق تھا کہ پیچھے سارا راستہ آسمان صاف رہا تھا مگر ویرونا کے قریب پہنچتے پہنچتے آسمان پر بادل نظر آنے لگے تھے اور لگتا تھا کہ بارش ہوگی۔ ویرونا کے پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا۔ ٹرین ابھی رکی نہیں تھی کہ نتالی نے اپنا لباس درست کیا۔ بڑی محبت سے میرا ماتھا چوم کر کہا: "میں پہلے باہر نکلوں گی۔ تم میری پیچھے پیچھے کچھ فاصلہ چھوڑ کر آنا۔ ہو سکتا ہے مارکو کے آدمی یہاں ہماری تلاش میں موجود ہوں۔"

میں نے دل میں کہا: مارکو اور اس کے آدمی جائیں جہنم میں، میں تو یہاں سے ایسا غائب ہوں گا کہ پھر میری شکل بھی کسی کو نظر نہیں آئے گی۔

ٹرین رک گئی۔ ابھی تک ڈبے کی کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے۔ ٹرین رکی تو نتالی نے پردے کو ایک طرف کھسکا کر پلیٹ فارم پر نظر ڈالی۔ اس نے جلدی سے پردہ برابر کیا اور گھبرا کر وہیں بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

نتالی کا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا تھا۔

"میرے خدا! کوبرا اپنے آدمیوں کے ساتھ آرہا ہے۔"

میں ابھی سمجھ بھی نہیں سکا تھا کہ یہ کوبرا کون بلا ہے کہ ڈبے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور تین بھینسے نما انسان اندر گھس آئے جو آدمی آگے آگے تھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی سائی لینسر چڑھا ہوا

تھا۔ اس نے نتالی کا نام لے کر غراتے ہوئے کہا: "تم کیا سمجھتی تھیں کہ ہمارے چنگل سے نکل جاؤ گی۔"

میں ذرا پیچھے کو کھسکنے لگا تو اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا اور اطالوی میں کہا: "اب تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں اطالوی زبان نہیں جانتا۔ اتنے میں اس کے آدمیوں نے آگے بڑھ کر نتالی کی پسلیوں میں زور سے ایک ایک گھونسا مارا۔ نتالی وہیں دوہری ہو کر سیٹ پر گر پڑی۔ ایک گھونسا اس کے جبڑوں پر پڑا۔ نتالی بے ہوش ہو چکی تھی۔ جو آدمی آگے آگے تھا۔ یقیناً اسی کا نام کوبرا تھا۔ اس کو دیکھ کر ہی نتالی نے کوبرا کا نام لیا تھا۔ کوبرا نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے فوراً بے ہوش نتالی کو اٹھایا اور ڈبے سے باہر نکل گئے۔ کوبرا نے ریوالور کی نالی میری کمر کے ساتھ لگا دی اور بالکل میرے ساتھ لگ کر بولا: "باہر چلو۔ ذرا ادھر ادھر ہوئے تو چھ گولیاں تمہارے جسم کے پار ہو جائیں گی۔"

میں یوں ظاہر کرنے لگا جیسے میں کچھ نہیں سمجھا۔ اس نے میرے سر کے پیچھے زور سے مکا مارا۔ میں آگے کو گرا۔ اس نے ٹھڈا مار کر مجھے اٹھایا اور گرج کر کہا: "آگے چلو۔"

وہ بالکل میرے ساتھ لگ گیا۔ ریوالور کی نالی میری پشت کے ساتھ لگی تھی۔ وہ بالکل میرے ساتھ لگ کر اس طرح ڈبے سے باہر نکلا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا اور وہ میرا دوست ہے جو مجھے لینے آیا ہے اور پہلے جس عورت کو بے ہوشی کی حالت میں باہر نکالا گیا تھا وہ میری بیوی تھی اور بیمار تھی۔ میں نے سوچا کچھ اور تھا اور آگے کچھ اور ہی ہو گیا تھا۔ شاید خدا نے مجھے میری خود

غرضی اور نتالی ایسی صاف ضمیر لڑکی کے ساتھ میری منافقت کی سزا دی تھی۔ وہ نتالی کو پہلے ہی کسی راستے سے نکالکر لے جا چکے تھے۔ ریوالور کی نالی میری پسلیوں کو چبھ رہی تھی۔ اور یہ لوگ سکے بند قاتل تھے۔ اگر میں وہاں شور بھی مچاتا تو اسکا نتیجہ یہی نکلتا کہ اوپر تلے کم از کم تین گولیاں میری پسلیاں توڑتی ہوئی نکل جاتیں۔ جہاں تک اٹلی کی پولیس کا تعلق تھا تو میں اسے بڑی اچھی طرح سے سمجھ چکا تھا۔ کہیں فائرنگ وغیرہ ہو تو پولیس کے آدمی منہ دوسری طرف کر لیتے تھے۔ جرائم پیشہ غنڈوں کی فائرنگ سے تو وہ خود گھبراتے تھے اور موقع واردات سے کھسک جاتے تھے یا صرف سیٹیاں بجاتے رہتے تھے۔ اتنے میں قاتل اپنا کام کر کے روپوش ہو چکا ہوتا تھا۔

کوبرا مجھے ریوالور کی نالی سے دھکیلتا ہوا پلیٹ فارم کی پچھلی طرف لے گیا جہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ یہاں کچھ گاڑیاں اور ٹرالر کھڑے تھے۔ ان میں ایک ایمبولینس کی گاڑی بھی تھی۔ وہ مجھے لے کر ایمبولینس کی طرف بڑھا۔ جب مجھے اس نے ایمبولینس کے پچھلے دروازے سے اندر دھکا دے کر گرایا تو میں نے دیکھا کہ اس کے دونوں بھینسے نما غنڈے ساتھی پہلے سے وہاں بیٹھے تھے۔ درمیان میں سٹریچر پر نتالیا بے ہوش پڑی تھی اور اس کے اوپر سینے تک لال کمبل ڈال دیا گیا تھا۔ کوبرا بھی اندر گھس آیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ایمبولینس گاڑی سائرن بجاتی ویرونا کی سڑکوں پر روانہ ہو گئی۔ گاڑی بند تھی۔ شیشوں پر پردے پڑے تھے۔ میں ایمبولینس کے بنچ پر دو غنڈوں کے درمیان سکڑ کر بیٹھا خدا کو یاد کر رہا تھا۔ کوبرا نے اطالوی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اطالوی جانتا ہوں۔ میں نے ایسا ردعمل ظاہر کیا جیسے میں کچھ نہیں سمجھا کہ اس نے کیا کہا ہے۔ اس نے انگریزی میں یہی سوال

دہرایا تو میں نے کہا:

"میں تو ٹورسٹ ہوں۔ مجھے اطالوی زبان نہیں آتی۔ اس لڑکی سے پڈووا ریلوے سٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ سفر کرنے کی دعوت دی اور میں....."

یہ جملہ ابھی میری زبان پر ہی تھا کہ کوبرا نے زور سے میرے جبڑے پر ایک مکا مارا۔ میں دوسرے غنڈے کے اوپر گر پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ درد سے میری چیخیں نکلیں تو ایک غنڈے نے اطالوی میں کہا: "اسے بے ہوش کر دو کوبرا۔ یہ راستے میں کوئی مصیبت نہ ڈال دے۔"

کوبرا نے جیب سے چمڑے کا ایک بٹوا نکالا۔ اس میں سرنج پہلے سے کسی دوائی سے بھری ہوئی رکھی تھی۔ اس نے سوئی کے اوپر چڑھا ہوا کور اتارا۔ دونوں غنڈوں نے مجھے پکڑے رکھا اور کوبرا نے میرے بازو پر ٹیکہ لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں ایک نیم روشن چھوٹے سے کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔ میرے نیچے میٹریس تھی جس کے سپرنگ مجھے چبھ رہے تھے۔ میرا سارا بدن دکھ رہا تھا۔ جبڑا سخت درد کر رہا تھا۔ بے ہوشی کی دوائی کا ابھی تک اثر تھا۔ آنکھیں پوری طرح سے نہیں کھل رہی تھیں۔ حلق خشک تھا۔ چھت پر تار کے ساتھ بندھا ایک بہت دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ قریب ہی فرش پر ایک کرسی پڑی تھی۔ سامنے ایک لکڑی کا ایک سٹول تھا۔ دیوار میں ایک ہی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دن کا وقت ہے یا

رات کا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور کوبرا اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھی نے مجھے بکرے کی طرح پکڑ کر اٹھایا اور زبردستی سٹول پر بٹھادیا۔ کوبرا میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھنکار ایسی آواز نکال کر انگریزی میں کہا:

"ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ تم ہی وہ ٹورسٹ ہو جو ساشی کے ساتھ مارکو کے فارم پر آدھی رات کو آئے تھے۔ تم نے ہی ہمارے آدمی کی کھوپڑی توڑی تھی اور نتالی کو نکال کر لے گئے تھے۔ ہمیں صرف اتنا بتادو کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا اور نتالی تمہیں ساتھ لے کر کس کے پاس جارہی تھی؟"

میں اپنے پہلے بیان پر قائم رہا اور بڑی مشکل سے اپنے حواس قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "میں کسی ساشی واشی کو نہیں جانتا۔ میں تو ایک معمولی سا ٹورسٹ ہوں۔ پاکستان سے یہاں سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔ پڈووا اسٹیشن پر....."

کوبرا نے مجھ پر گھونسوں اور ٹھڈوں کی بارش کردی۔ میں فرش پر گر پڑا۔ اور اپنے آپ کو کوبرا کی لاتوں اور گھونسوں سے بچانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ جب کوبرا تھک گیا تو اس نے اطالوی زبان میں اپنے ساتھی سے کہا: "اسے صبح صبح دریا پر لے جاکر ختم کردو' لاش دریا میں ہی پھینک دینا۔"

میں درد سے کراہ رہا تھا مگر میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں نے کوبرا کے جملے کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔ میں درد سے کراہتا رہا۔ ساتھ ہی میرے جسم میں خوف کی سرد لہر بھی دوڑ گئی۔ موت میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ یہ

لوگ سرد مہر سفاک قاتل تھے۔ میں تو اس بات پر آج بھی حیران ہوں کہ انہوں نے مجھے وہیں پر ہی کیوں نہیں شوٹ کر دیا۔ خدا جانے اس میں کونسی مصلحت یا مجبوری تھی کہ جس مکان میں انہوں نے مجھے بند کر رکھا تھا' وہ وہاں پر مجھے ہلاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کوبرا پہلے کمرے سے باہر نکلا' پھر دوسرا آدمی بھی مجھے گھور کر دیکھتا باہر نکل گیا۔ دروازے پر باہر سے تالا لگانے کی آواز آئی۔ یہ میری جوانی کا زمانہ تھا۔ مجھے بری طرح مارا پیٹا گیا تھا مگر میں اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ جسم ضرور درد کر رہا تھا۔

صبح صبح آنے والی موت کے خوف نے میرے جسم کی درد کو تھوڑی دیر کے لئے بھلا دیا۔ مجھے وہاں سے فرار کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولنا چاہی۔ کھڑکی کے پٹ کیلیں ٹھونک کر بند کر دیئے گئے تھے۔ میں میٹرس پر بیٹھ گیا۔

پھر سجدے میں گر گیا اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ لاہور میں اپنے ماں باپ' بہن بھائیوں اور دوستوں کی شکلیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ لاہور شہر کے بازار دروازے گلی کوچے اور بزرگان دین کے مزارات یاد آنے لگے۔ میں مسلسل رو رہا تھا اور خدا سے التجا کر رہا تھا کہ یا اللہ میری خود غرضیوں' میری کمینگیوں اور میری منافقتوں کو معاف فرمادے۔ میں نے بڑے گناہ کئے ہیں' شاید اتنے گناہ نہیں کئے جتنے گناہ کے ارادے کئے ہیں' مگر گناہ کا ارادہ کر لینا بھی گناہ کرنے کے برابر ہوتا ہے' تو بخشش کرنے والا ہے' مجھے بخش دے۔ میری جان بچالے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالوں گا۔

کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا' بلکہ گناہ کا ارادہ تو کیا گناہ کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گا۔

میں نے سجدے سے سر اٹھایا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا ذہن کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ جسم کا درد بھی کافی گھٹ گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ میاں نے میری فریاد میری دعا قبول فرمالی ہے۔ اس یقین نے میرے اندر جیسے ایک نئی طاقت' ایک نئی توانائی بھر دی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ میں وہاں سے کیسے فرار ہو سکتا ہوں۔ ابھی تک مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وقت کونسا ہے' آیا دن ہے یا رات ہے۔ میری گھڑی اور پاسپورٹ وغیرہ ان لوگوں نے نکال لئے تھے۔ میری جیکٹ میں ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ سگریٹ اور لائیٹر بھی غائب تھے۔ میں نے اٹھ کر دوبارہ کھڑکی کو کھولنے کی کوشش کی مگر میری پسلیوں میں ایک ٹیس سی اٹھی اور میں وہیں بیٹھ گیا۔ پھر وہیں ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ مجھے اس چھوٹے سے نیم روشن کمرے پر پھانسی کی کوٹھڑی کا گمان ہو رہا تھا جہاں سے مجھے صبح صبح پھانسی دینے کے لئے لے جایا جائے گا۔ پردیس میں ایسی عبرت ناک موت کے خیال سے میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ کاش میں اس ملک کے سفر پہ کبھی نہ آتا۔ کاش میں نے نتالیا کے سنہری بالوں کے جال میں الجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالا ہوتا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں اپنے آپ کو برے ماحول سے بچا کر رکھتا اور جس طرح دوسرے سیاح اٹلی میں آتے ہیں' ان کی طرح میں بھی آتا۔ وینس شہر کی سیر کرتا' کہیں تھوڑے دن جاب کرتا اور کرایہ اکٹھا کر کے دوسرے شہر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ لیکن میں جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا اور آج اس کا سنگین نتیجہ بھگت رہا تھا۔

مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کیا یہ لوگ مجھے

مارنے سے پہلے سگریٹ کا ایک کش بھی نہیں لگانے دیں گے؟ کسی وقت خیال آتا کہ نہیں، یہ لوگ مجھے ماریں گے نہیں۔ کوبرا نے محض ڈرانے کے لئے صبح کو مجھے باہر لے جاکر شوٹ کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ آخر ان لوگوں کو مجھے مار کر کیا ملے گا؟ میں نے ان کے کسی آدمی کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ وہ تو زخمی ہوا تھا، پھر یہ لوگ مجھے کیوں ماریں گے؟ بدن بھی درد کر رہا تھا۔ بے ہوشی کے انجکشن کا اثر بھی تھا۔ کسی وقت میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو جاتیں اور آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا۔ اور اس اندھیرے میں تارے سے چمک چمک کر ٹوٹنے لگتے۔ کسی وقت میں ہوش میں آجاتا اور پوری آنکھیں کھول کر قید خانے کی سنگین دیواروں تکنے لگتا۔ اس کے بعد میری آنکھیں دوبارہ بند ہو جاتیں۔ اسی طرح زندگی اور موت کے درمیان بہتا رہا۔ کبھی جاگ کر، کبھی سو کر۔ اسی طرح نہ جانے کتنا وقت گذر گیا۔ بند کھڑکی کی دوسری جانب سے کوئی آواز تک سنائی نہیں دی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کوٹھڑی کسی قبرستان میں واقع ہے۔

اچانک ہوائی جہاز کے گذرنے کی آواز آئی۔ یہ جیٹ طیارے کی آواز تھی جو میرے قید خانے کے اوپر سے گذرا تھا۔ انجنوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ لینڈ کرنے والا ہے۔ ایئرپورٹ وہاں کہیں قریب ہی تھا۔ میرے دل میں حسرت پیدا ہوئی۔ کاش میں ہوائی جہاز میں سوار ہوتا اور فضا میں پرواز کرتا اپنے وطن پاکستان پہنچ جاتا اور کراچی کے ایئرپورٹ پر اتر کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا اور لوگوں کو بتاتا کہ خدا کے لئے اپنے وطن پاکستان کی قدر کرو۔ یہی ایک ملک ہے جہاں تم جس حالت میں بھی ہو، غریب ہو، امیر ہو، بدحال ہو، جیسے بھی ہو، تمہاری شناخت، تمہاری زندگی اور تمہارا حفظ و

امان اللہ کے بعد اسی وطن پاکستان کے ساتھ قائم ہے۔

مگر جمبو طیارے کی آواز گم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ باہر سے کسی پرندے کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ اچانک کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ موت کا فرشتہ آن پہنچا ہے۔ اب خدا سے اپنے گناہوں کی آخری بار معافی مانگ لو۔ تھوڑی دیر بعد تمہاری بے گور و کفن لاش کسی گڑھے میں پڑی ہوگی یا دریا میں اسے مچھلیاں کھا رہی ہوں گی۔ دروازہ کھلا۔ دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ یہ وہی آدمی تھے جو کوبرا کے ساتھ ہوتے تھے۔ میرا دل حلق کے قریب آکر دھڑکنے لگا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دوسرے کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ ریوالور والے نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ میری موت نے مجھے اشارہ کیا تھا۔ میں اٹھا۔ مگر لڑکھڑا گیا۔ دوسرے نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور مجھے ایک طرح سے گھسیٹتا ہوا کمرے سے نکال کر اپنے ساتھ ہی دوسری طرف لے آیا جو ایک تنگ سی راہ داری تھی۔ آگے دیوار میں ایک دروازہ تھا جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ یہاں سے ٹھنڈی ہوا آئی۔ وہ مجھے باہر کھلی فضا میں لے آئے۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے آسمان کو دیکھا۔ آسمان پر سپیدہ سحر کی دھندلی سی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ کوبرا کے حکم کے مطابق مجھے صبح صبح گولی مار کر میری لاش کو دریا میں پھینکنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ میں خدا کو یاد کرنے لگا۔ سمن آباد میں اپنے گھر کا نقشہ میری آنکھوں میں گھومنے لگا۔ لاہور کی سڑکوں پر میں نے سکوٹر گاڑیاں اور بسیں چلتی دیکھیں۔ مجھے لاہور کی مسجدوں سے بلند ہوتی اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دینا۔ یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دینا۔

میں بڑا گناہ گار ہوں۔ مجھے بخش دینا۔

یہی ورد کرتا میں بند جیپ میں بیٹھ گیا۔ بلکہ اندر دھکیل دیا گیا۔ جیپ پہاڑی اونچے نیچے رستوں پر میری موت کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھنے لگی۔ مجھ پر موت کا خوف طاری تھا۔ اپنے لاہور کے دوست یاد آرہے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس کی محفلیں یاد آرہی تھیں۔ الوداع! میرے پیارے دوستو! الوداع! میرے پیارے وطن پاکستان کے شہرو۔ شہر کی پیاری گلیو! اب تم سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ خدا تمہیں آباد رکھے۔

جیپ تیزی سے چلی جارہی تھی۔ اب وہ ایک چڑھائی چڑھنے لگی۔ یہاں اسکی رفتار ہلکی ہوگئی۔ وہ ٹیلہ آگیا تھا جہاں لے جاکر ان جلادوں نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر جیپ ایک طرف گھوم کر رک گئی۔ مجھے کھینچ کر جیپ سے باہر نکالا گیا۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں میں نے دیکھا کہ یہ ایک ٹیلے کی چوٹی ہے۔ ارد گرد کوئی درخت نہیں ہے۔ مجھے چوٹی کے کنارے کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے آخری بار چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ نیچے کافی گہرائی میں مجھے دریا کا پانی بہتا ہوا نظر آیا۔ مجھے ٹیلے کے کنارے پر اسی لئے کھڑا کیا گیا تھا کہ گولی لگنے کے بعد جب میں مرجاؤں تو اپنے آپ میری لاش نیچے دریا میں گر پڑے اور ان لوگوں کو میری لاش ٹھکانے لگانے کی بھی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمک اٹھا۔

یہ صرف خیال ہی نہیں تھا' اس کے ساتھ خیال پر عمل کرنے کی طاقت بھی آگئی تھی۔ اگر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ زندگی بچانے کی آخری کوشش کی جائے۔ ریوالور والا آدمی ایک طرف ہٹ کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ دوسرا

آدمی رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں آنا فانا ہو گیا۔ وہ رائفل کا رخ میری طرف کر کے شست لگا ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو پیچھے گرا دیا۔ آخری آواز جو میں نے سنی وہ رائفل کے دھماکے کی آواز تھی۔

میں قلابازیاں کھاتا نیچے دریا میں جا گرا اور نیچے ہی نیچے اترتا چلا گیا۔ میری زندگی ابھی باقی تھی۔ یہاں دریا گہرا تھا اور نیچے بڑے بڑے پتھر نہیں تھے۔ اوپر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ خدا جانے ان لوگوں کی گولیاں کہاں گر رہی تھیں۔ میں پانی کے اندر نیچے ہی نیچے ہاتھ پاؤں چلاتا آگے بڑھنے لگا۔ پانی کا بہاؤ یہاں زیادہ تیز نہیں تھا۔ زندہ رہنے اور موت کے چنگل سے بچ نکلنے کی خوشی نے میرے اندر زبردست طاقت بھر دی تھی۔ مجھے پانی کے اندر فائر کی آوازیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔ میرا سانس ختم ہو گیا۔ میں نے جلدی سے سر پانی سے باہر نکالا۔ یہاں دریا ایک طرف مڑ رہا تھا اور موجوں کی رفتار تیز تھی۔ پانی کا ریلا مجھے تیزی سے بہاتا ہوا پہاڑی کی دوسری طرف لے گیا۔ یہاں دریا نشیب میں بہتا تھا۔ میں تیز رفتار موجوں کے ساتھ تیزی سے بہتا ہوا کافی آگے نکل گیا۔ خدا نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ دن کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دریا کے دونوں جانب اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔

یہ پہاڑیاں بالکل سیدھی تھیں۔ اور ان کی چوٹیوں پر بھورے رنگ کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دریا کا بہاؤ مجھے اپنے آپ بہائے لئے جا رہا تھا۔ سردی سے میرا جسم بے حس ہونے لگا تھا۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ کہیں دریا کے یخ پانی میں ٹھٹھر کر نہ مر جاؤں۔ بدن سن ہو جانے کی وجہ سے جسم سے

درد کا احساس جاتا رہا تھا۔ اگر سردیوں کا موسم ہوتا تو میں اب تک سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ بہار کا موسم تھا اور فضا میں ہلکی ہلکی گرمائش آ چکی تھی۔

میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے' دریا سے باہر نکل جاؤں مگر بہاؤ بڑا تیز تھا اور میں لکڑی کے ٹکڑے کی طرح لہروں پر ادھر ادھر اچھلتا بہا چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر رات کے شروع میں جو بادل چھائے ہوئے تھے اور جنہیں میں نے ویرونا ریلوے سٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا' اب غائب ہو چکے تھے اور سورج کی پیلی گلابی شعاعیں بائیں جانب والی پہاڑیوں کے درختوں کو روشن کرنے لگی تھیں۔ دریا ایک بار پھر ٹیلے کی دوسری جانب گھوم گیا۔ میں نے وہاں جھاڑیوں کو پکڑنے کی بڑی کوشش کی مگر پانی کے تیز بہاؤ نے مجھے اتنی مہلت نہ دی کہ کسی جھاڑی کو مضبوطی سے پکڑ کر کنارے پر جا پہنچوں۔ پہاڑی ٹیلوں کے اندر ہی اندر دو تین موڑ مڑنے کے بعد دریا کھلی جگہ میں آ گیا۔ یہاں موجوں کی رفتار سست ہو گئی۔ پہاڑی ٹیلے دور دور ہٹ گئے تھے۔ میں نے اپنے جسم کی بچی کھچی طاقت کو جمع کر کے دریا کے قریبی کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ تیرنا مجھے لاہور کے دریائے راوی اور حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ صاحب والی نہر نے سکھایا تھا۔ بچپن اور لڑکپن میں میں اس نہر میں چھلانگیں لگایا کرتا تھا۔ کالج کے زمانے میں دریائے راوی پر تیرنے جاتا تھا۔ اس زمانے کا تجربہ میرے کام آ رہا تھا۔ بہت جلد میں دریا سے نکل گیا۔

کنارے پر آتے ہی میں جھاڑیوں میں لیٹ گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ جسم سرد ہو گیا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ دھوپ کی گرمی نے میرے

جسم کی سردی ختم کر دی۔ اس کے ساتھ ہی جسم درد کرنے لگا۔ ان غنڈوں نے میری بہت پٹائی کی تھی۔ پسلیاں اور جبڑا ابھی تک درد کر رہا تھا۔ مگر میں زندہ بچ کر نکل آیا تھا۔ جس دریا میں میری لاش کو تیرنا تھا' اس دریا میں سے میں تیر کر کنارے پر نکل آیا تھا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور جھاڑیوں میں سے لنگڑاتا ہوا نکلا اور کھلی جگہ گھاس پر آکر بالکل چت لیٹ گیا۔ دھوپ میرے سارے جسم پر پڑ رہی تھی۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ کوبرا اور اس کے ساتھی اتنی جلدی میرے پیچھے اس علاقے میں نہیں آسکتے تھے۔ دریا کی موجیں مجھے کئی پہاڑیاں درمیان میں ڈال کر بہت آگے لے آئی تھیں۔ اس طرح میرے اور میرے جلادوں کے درمیان کافی فاصلہ پڑ چکا تھا۔ پھر بھی میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے' وہاں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہیے تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری جیکٹ جینز سب کچھ گیلا ہو چکا تھا۔ میں نے جیبوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور دریا کے کنارے کنارے سورج کی سمت چلنے لگا۔ یہ علاقہ زیادہ تر پہاڑی علاقہ تھا۔ مگر پہاڑیاں اور ٹیلے دور دور تھے۔ میں جھاڑیوں میں سے نکل کر کھلی جگہ پر آگیا۔ یہ گھاس کا ایک میدان تھا۔ میدان کے پار مجھے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا۔ میں اس طرف چل پڑا۔ کہ شاید وہاں کوئی باڑا وغیرہ ہو اور میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر کم از کم اپنے کپڑے ہی سکھا سکوں۔ جسم درد کر رہا تھا مگر میں رکے بغیر آہستہ آہستہ چلتا جا رہا تھا۔ گھاس کے میدان میں ایک پگڈنڈی مل گئی جو درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہی تھی۔ یہ بھی ڈر تھا کہ وہاں کوبرا کے لوگ نہ مل جائیں۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ میری لئے اب سارے کا سارا اٹلی کا ملک ہی

مافیا کا اڈا تھا۔ مجھے ہر حال میں اس ملک سے نکلنا تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ بھی نہیں ہے اور میں سرحد پار کرتے ہوئے پکڑا جاؤں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ سرحد پار کر کے پکڑ لیا جاؤں تو ٹھیک ہے۔ کم از کم مافیا والوں سے تو بچ جاؤں گا۔ یہ بات میرے علم میں بھی تھی کہ میں شمالی اٹلی میں ہوں جہاں مشرق کی طرف یوگوسلاویہ کا ملک شروع ہوتا ہے اور شمال کی جانب سوئٹزرلینڈ کا ملک ہے۔ میں مشرق کی جانب جا رہا تھا۔

درختوں کا جھنڈ قریب آیا تو میں ایک جگہ بیٹھ کر غور سے درختوں کو دیکھنے لگا۔ درختوں کے درمیان مجھے ایک ڈھلوان چھت والا باڑا دکھائی دیا جس کے پہلو میں ایک چھوٹا سا پتھر کا دیہاتی ٹائپ کا مکان تھا۔ وہاں کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مویشی وغیرہ بھی نہیں تھے۔ میں نے خدا کو یاد کیا اور باڑے کا رخ کر لیا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ دیوار میں اوپر جا کر روشندان تھے۔

یہ باڑا ہی تھا جسے انگریزی زبان میں بارن کہتے ہیں۔ اس کا آدھا دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ یورپ کے رواج کے مطابق وہاں سوکھی گھاس کے چوکور گٹھے ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ گینتی، بیلچے اور فصل صاف کرنے والے پھاوڑے اور سلاخ دار بیلچے لگے تھے۔ گڈے کا ایک پہیہ بھی پڑا تھا۔ باڑے میں فضا گرم تھی۔ مجھے وہاں بڑا سکون ملا۔ سوکھی گھاس کے گٹھوں کے درمیان کافی جگہ تھی۔ میں وہاں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہاں سے مجھے کس طرف جانا چاہیے۔ میں نے اب یوگوسلاویہ کی سرحد پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یوگوسلاویہ کی بارڈر پولیس مجھے غیر قانونی طور پر سرحد پار کرتے ہوئے ضرور گرفتار کر لے گی۔

میں یہی چاہتا تھا۔

میں اٹلی میں پاکستانی سفارت خانے میں بھی جا سکتا تھا۔ مگر اٹلی میں ہمارا سفارت خانہ روم شہر میں تھا جو وہاں سے اتنی دور تھا کہ مافیا کے لوگ مجھے درمیان میں ہی پکڑ لیتے۔ اور پھر میرے پاس روم تک پہنچنے کا کرایہ اور زاد راہ بھی نہیں تھا۔ میرے لئے یہی بہتر تھا کہ میں یوگو سلاویہ کی سرحد پر گرفتار ہو جاؤں اور پھر اپنے پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے بھوک اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ وہاں نہ تو کہیں پانی نظر آ رہا تھا اور نہ کھانے کو کچھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ باڑے کے ساتھ جو پتھر کا بنا ہوا چھوٹا سا دیہاتی مکان ہے' وہاں ضرور کوئی نہ کوئی رہتا ہو گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں باڑے سے نکلا اور ساتھ والے مکان کے پاس آ گیا۔ اس کے صحن میں زراعت اور کاشت کاری کے آلات ایک طرف پڑے تھے۔ پیچھے ایک کمرہ تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا تو اندر بھوسہ بھرا ہوا تھا۔ واپس صحن میں آ گیا اور پتھر کی تین فٹ اونچی دیوار پر دھوپ میں بیٹھ گیا۔

سوچنے لگا کہ یہاں بیٹھنے رہنا بیکار ہے۔ مجھے آگے چل دینا چاہیے' شاید آگے کوئی گاؤں آ جائے اور مجھے کھانے پینے کو کچھ مل جائے۔ اتنے میں مجھے باڑے کی جانب سی بکری کے ممیانے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ باڑے کے باہر ایک دیہاتی لڑکی سر پر سفید ٹوپی اور بدن پر لمبا گاؤن پہنے ہاتھ میں چھڑی لئے کھڑی میری طرف غور سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے پہلے ہی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بکری تھی جس کی رسی لڑکی کے ہاتھ میں تھی۔ میں اطالوی زبان میں بات کر سکتا تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا کہ مجھے بھوک اور پیاس لگی ہے۔ میں ٹورسٹ ہوں اور

راستہ بھول کر ادھر آنکلا ہوں۔ لڑکی نے کہا: "تم یہاں بیٹھو، میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

بکری کو اس نے ایک کھمبے کے ساتھ باندھا اور خود دوڑتی ہوئی درختوں کے جھنڈ کی دوسری طرف نکل گئی۔ دوسری طرف نشیب تھا۔ میں نے سوچا کہیں یہ کسی کو میرے بارے میں بتا نہ دے۔ کہیں مافیا کے آدمی یہاں بھی نہ پہنچ گئے ہوں۔ موت کے خوف کی وجہ سے میرے دل میں طرح طرح کی وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے درختوں کے پاس جاکر نیچے نشیب میں دیکھا۔ میدان کی ڈھلان پر ذرا نیچے جاکر دو دیہاتی مکان ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ لڑکی ان میں سے ایک مکان میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کی بوتل تھی جو دھوپ میں چمکتی مجھے دور سے نظر آگئی تھی۔

یہ دیہاتی لڑکی میرے لئے ڈبل روٹی، سیب کا مربہ اور پانی لائی تھی۔ اس نے یہ چیزیں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "گھر میں اس وقت یہی کچھ تھا جو میں لے آئی ہوں۔ تم کس ملک کے رہنے والے ہو؟"

میں نے سیب کے مربے کے ساتھ ڈبل روٹی کھاتے اور ساتھ ہی پانی کا گھونٹ نگلتے ہوئے صرف اتنا کہا: "پاکستان۔"

وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ مجھے کھاتے دیکھ کر ذرا ذرا مسکرا دی تھی۔ کھانا کھانے اور پانی پینے سے میری توانائی بحال ہوئی تو میں نے لڑکی سے پوچھا: "یہاں سے آگے یوگوسلاویہ کا ملک کس طرف ہے؟ میں یوگوسلاویہ جانا چاہتا ہوں۔"

لڑکی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "مجھے نہیں معلوم میرے پاپا ممی مارکیٹ گئے ہوئے ہیں۔ تم یہاں بیٹھو۔ وہ آئیں گے تو تم ان سے پوچھنا۔ "

یہ کہہ کر لڑکی نے ٹوکری اور برتن اٹھائے اور واپس چلی گئی۔ کھانے کے بعد میں اپنے اندر طاقت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ یہ دیہاتی قسم کے لوگ ہیں۔ ان بے چاروں کا مارکو مافیا سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ ان سے یوگوسلاویہ کے بارڈر کے بارے میں پوری معلومات حاصل کی جائیں اور پھر آگے قدم اٹھایا جائے۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی کہ میں چلتا چلتا کسی شاہراہ پر پہنچ کر کسی بس وغیرہ میں ہی سوار ہو سکتا۔ میں وہیں دھوپ میں لیٹ کر لڑکی کے ماں باپ کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہی دیہاتی لڑکی ایک مضبوط قد کاٹھ والے آدمی کے ساتھ میری طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ آدمی یقیناً اس لڑکی کا باپ تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر بال تھوڑے تھوڑے سفید تھے۔ وہ منہ میں سگریٹ دبائے ہوئے تھا۔ میں نے اسے اطالوی طرز پر سلام کیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا: "تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے اسے بھی یہی بتایا کہ میں پاکستان کا سیاح ہوں۔ راستے میں میرا سامان کا تھیلا چوری ہو گیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یوگوسلاویہ جا کر اپنے ملک کے سفارت خانے سے رابطہ پیدا کروں او اپنے ملک واپس چلا جاؤں۔

اس آدمی نے کہا: "تم اٹالین اچھی طرح بول لیتے ہو۔ ورنہ عموما

سیاح جو یہاں آتے ہیں، وہ ہماری زبان نہیں بول سکتے۔"

میں نے کہا: "پاکستان سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے اطالوی زبان کا کورس پورا کیا تھا۔"

اس نے اپنی بیٹی کو واپس گھر جانے کا اشارہ کیا اور خود میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے سگریٹ پینے کو دیا اور کہنے لگا: "یوگوسلاویہ کی سرحد یہاں سے کافی دور ہے، اس طرف کوئی ریلوے لائن بھی نہیں ہے۔ یہاں سے آگے سو کلومیٹر پر لبرسنک نام کا ایک قصبہ ہے۔ وہاں سے سبزیوں اور انگوروں سے لدے ہوئے ٹرک بارڈر تک جاتے ہیں۔ اگر وہ لوگ تمہیں ٹرک میں بٹھالیں تو تم یوگوسلاوی بارڈر تک پہنچ سکتے ہو۔"

یہ میرے لئے بہت بڑی خوشخبری تھی۔ میں نے کہا: "مگر میرے پاس انہیں کرایہ ادا کرنے کے لئے ایک لیرا بھی نہیں ہے۔"

وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا: "میں تمہیں اتنے پیسے دے سکتا ہوں کہ تم یوگوسلاوی سرحد تک پہنچ جاؤ۔ یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میرے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہیں یہ بھی مافیا کا ایجنٹ نہ ہو، کہیں یہ مارکو کے آدمیوں کو خبر نہ کر دے، کہیں میں مارا نہ جاؤں۔ پھر سوچتا کہ نہیں یہ تو سیدھا سادا دیہاتی آدمی ہے۔ مجھ سے ہمدردی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ میں انہی خیالوں میں کھویا وہاں بیٹھا رہا۔ کبھی اٹھ کر ڈھلان کے پاس جاکر نیچے دیکھتا کہ وہ گھر سے باہر نکلا ہے کہ نہیں۔ میں نے اسے مکان سے باہر آتے دیکھا تو جلدی سے واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔

نیک دل دیہاتی نے مجھے کچھ لیرے دیئے۔ ایک لفافہ دیا جس میں ایک لمبی ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے اور کچھ سوکھا گوشت تھا۔ کہنے لگا: "یہاں

سے سیدھا ان ٹیلوں کی طرف چلتے جانا۔ آگے تمہیں ایک سڑک ملے گی۔ وہاں سے تمہیں کوئی نہ کوئی سواری لبرسنک جاتی مل جائے گی۔"

اتنا کہہ کر اس نیک دل دیہاتی نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ سارے کا سارا علاقہ سرسبز اور پہاڑی تھا مگر پہاڑیاں ایک دوسری سے کافی دور دور ہوتی جا رہی تھیں۔ جس پگ ڈنڈی پر میں چلا جا رہا تھا' وہ گھاس کا میدان عبور کرتے ہی کشادہ ہو گئی۔ اب یہاں کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پسلیوں میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا جس کی وجہ سے میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس اعتبار سے مجھے ایک اطمینان بھی تھا کہ مارکو کے لوگ یہاں میرے تعاقب میں نہیں آئیں گے۔ کیونکہ ان لوگوں کا زور اور سرگرمیاں زیادہ تر شہروں میں ہی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو مجھ سے کوئی سنگین خطرہ بھی نہیں تھا' وہ تو مجھے مار ڈالنے آئے تھے۔ میں نے بلند پہاڑی کی چوٹی سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔ انہیں یقین ہو گا کہ میں اتنی بلندی سے پتھروں سے بھرے ہوئے دریا میں چھلانگ لگانے کے بعد زندہ نہیں بچا ہوں گا۔ پھر انہوں نے اوپر سے کافی فائرنگ بھی کی تھی۔ بہرحال میں اس ملک سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے' نکل جانا چاہتا تھا۔

چراگاہ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میرے جسم میں گرماہٹ بھی آگئی تھی اور میرے گیلے کپڑے بھی سوکھ گئے تھے۔ جسم کے گرم ہو جانے سے میری چوٹوں کے درد میں بھی تھوڑا سا افاقہ ہو گیا تھا۔ مگر پسلیوں میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اسی طرح پڑ رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے میں ایک سڑک پر آگیا۔ یہ پختہ سڑک تھی۔ دور سے ایک ٹرک آ رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا۔ وہ رکا نہیں۔ گذر گیا۔ اس کے

کچھ دیر بعد ایک ٹرالر آیا جس پر سبزیاں لدی ہوئی تھیں۔ یہ بھی میرے ہاتھ کے اشارے پر نہ رکا اور آگے نکل گیا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلا جارہا تھا۔ میری دائیں جانب نشیب میں پھلوں کے باغات تھے۔ دو تین آدمی ان باغوں میں کانٹ چھانٹ میں لگے تھے۔ مجھے پیچھے سے موٹر کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک ویگن آرہی تھی ۔میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

خوش قسمتی سے ویگن میرے قریب آکر رک گئی۔

ویگن کی چھت پر مرغیوں کے ڈربے لدے ہوئے تھے۔ ایک سفید مونچھوں والا بوڑھا اطالوی منہ میں پائپ لگائے اسے چلا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر کہا: "میں لبر سنک تک جارہا ہوں۔"

میں نے کہا: "مجھے بھی وہیں جانا ہے۔ سینور!"

اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ویگن آگے روانہ ہوگئی۔ یہ بوڑھا اطالوی بڑا باتونی تھا۔ فرفر دیہاتی اطالوی زبان میں باتیں کئے جارہا تھا۔ اس کی کچھ اطالوی میری سمجھ میں آتی۔ کچھ نہیں آتی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستان کا سیاح ہوں اور اب یوگوسلاویہ جارہا ہوں تو وہ خوش ہوکر بولا: "پاکستان۔ میں وہاں ایک بار گیا ہوں۔ لاہور۔۔ خوبصورت شہر۔۔۔ لوگ بڑے اچھے ہیں۔ تم بہادر لوگ ہو۔ ہم رومن بھی بہادر قوم ہیں۔ تم نے ۶۵ء کی جنگ میں ہندوستان کی زبردست طاقت کا خوب مقابلہ کیا۔ کیا تم شادی شدہ ہو؟"

اس کے اس اچانک سوال پر میں نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا: "تم ایشیائی لوگ بہت دیر بعد شادی

کرتے ہو، یہ اچھی بات ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ ہم لبرسنک کس وقت تک پہنچ جائیں گے۔ وہ بڑے آرام سے کہنے لگا: "کل اس وقت تک پہنچ جائیں گے۔"

میں ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ دوپہر تک وہ ویگن چلاتا رہا۔ اس دوران ویگن کئی چھوٹے چھوٹے قصبات سے گذری۔ پھر اس نے سڑک کے کنارے ایک پٹرول پمپ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ پٹرول ڈلوایا اور گاڑی وہیں چھوڑ کر مجھے ایک ریستوران میں لے آیا۔

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہوں گے۔"

میں نے سارے لیرے جیب سے نکال کر اس کو دکھائے۔ وہ غور سے میری ہتھیلی پر رکھے نوٹوں کو دیکھ کر بولا: "ٹھیک ہے۔ انہیں تم اپنے پاس رکھو۔ دوپہر کا کھانا تمہیں میں کھلادوں گا۔ تم مجھے رات کا کھانا کھلا دینا۔"

ریستوران میں ہم نے جو کچھ ملا، کھایا۔ بوڑھے نے وائن کی ایک بوتل بھی ساتھ رکھ لی۔ یہاں سے چلے تو پھر شام تک سفر جاری رہا۔ رات ہم نے ایک بڑے قصبے کے پٹرول پمپ کے گیراج میں ویگن کے اندر ہی لیٹ کر گذاری۔ رات کا کھانا میں نے کھلایا تھا۔ میرے پاس تھوڑے سے پیسے بچے تھے۔ مگر میں اسی خیال سے بڑا خوش تھا کہ کل میں اٹلی سے نکل چکا ہوں گا۔ بوڑھا کھانے کے بعد وائن کی پوری بوتل چڑھا گیا اور رات گئے تک خدا جانے کیا کیا بولتا اور کیا کیا کچھ مجھے سناتا رہا۔

دوسرے دن کوئی گیارہ بجے کے قریب ہماری ویگن لبرسنک کے سرحدی شہر کے مضافات میں داخل ہو گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر تھا جس کی گلیاں پتھریلی تھیں۔

سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک گرجا گھر کی خوبصورت عمارت بنی ہوئی تھی۔ زیادہ تر لوگ سائیکلوں پر آجا رہے تھے۔ شہر کا دروازہ پتھر کا محراب دار تھا، جس طرح ہمارے ہاں لاہور کا دہلی دروازہ ہے۔ بوڑھے نے مجھے بارڈر کا راستہ بتا دیا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے پارک میں بیٹھ گیا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دو تین بچیاں پارک میں رنگین فٹ بال سے کھیل رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت ان کے قریب ہی بنچ پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ بڑی پرسکون فضا تھی۔ ہوا میں سردی بالکل نہیں تھی۔ دو لیرے کا میں نے سگریٹ کا سستا سا پیکٹ خرید لیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور سوچنے لگا کہ بارڈر کو کہاں سے اور کس طرح کراس کیا جانا چاہیے۔ قاعدے قانون کے مطابق میں بارڈر کراس نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بارڈر کی چوکی پر سے ہی واپس کر دیا جاتا۔ کیونکہ میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بارڈر پولیس مجھے گرفتار کر لے۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کی کوشش کروں۔ اس میں یہ خطرہ بھی تھا کہ بارڈر پولیس کی گولی کا نشانہ نہ بن جاؤں۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں بارڈر کراس کرنا چاہیے اور اس وقت کراس کرنا چاہیے جب بارڈر سیکورٹی پولیس کی جیپ دور ہی سے نظر آ رہی ہو۔

یہ سوچ کر میں اٹھا اور اس سڑک پر روانہ ہو گیا جو بارڈر کو جاتی تھی ۔یہ چھوٹی سی سڑک تھی جو گول پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ مجھے اس بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ بارڈر کی طرف جاتے ہوئے یا بارڈر کراس کرتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے۔ بلکہ میں خود چاہتا تھا کہ مجھے بارڈر سیکورٹی پولیس والے دیکھیں اور گرفتار کر لیں۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد بارڈر کا ایریا شروع ہو گیا۔ یہاں درختوں کا صفایا کر دیا گیا تھا اور کئی جگہوں پر زمین میں گول پتھر گڑھے ہوئے تھے جن پر سفید رنگ پھیر دیا گیا تھا۔ میں دو چھوٹے ٹیلوں کے درمیان آ گیا جہاں خاردار تار لچھوں کی شکل میں ٹیلوں کی ڈھلان سے شروع ہو کر میرے سامنے سے گذرتی ہوئی دوسرے ٹیلے کے اوپر تک چلی گئی تھی۔ یہ اٹلی اور یوگوسلاویہ کا بارڈر تھا۔ یہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گا تھا کہ میں خاردار تاروں کے لچھوں کو کہاں سے اور کیسے عبور کروں۔ میں خاردار باڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایک جگہ میری نظر پڑی' وہاں زمین میں بارش کے پانی کے گرنے کی وجہ سے گڑھا بن گیا تھا۔ گڑھے میں پانی نہیں تھا۔ وہ خاردار باڑ کے بالکل نیچے تھا۔ میں گڑھے میں اتر گیا اور دونوں ہاتھوں سے مٹی ہٹانے لگا۔ مٹی نرم تھی۔ بڑی جلدی وہاں اتنا سوراخ بن گیا جس میں سے میں گذر سکتا تھا۔ میں نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا اور سوراخ میں سے گذر کر دوسری طرف نکل گیا۔ دوسری طرف چھوٹا سا پتھریلا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں وہاں آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے یوگوسلاویہ کی بارڈر سیکورٹی فورس والوں کا انتظار تھا۔ مجھے ایک جیپ دور سے اپنی طرف آتی نظر آئی۔ میں بھاگنے کی بجائے وہیں کھڑا رہا۔ جیپ میرے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں سیکورٹی فورس کے تین وردی پوش سپاہی سوار تھے۔ وہ فورا میرے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے گردن سے دبوچ لیا اور اپنی زبان میں کچھ پوچھا۔ ظاہر ہے یہی پوچھا ہو گا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کون ہوں۔

میں گونگا بن گیا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر جیپ میں بٹھایا اور چیک پوسٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اگر میں انگریزی یا اطالوی

میں انہیں بتاتا کہ میں پاکستانی ہوں اور میں اٹلی کا بارڈر کراس کر کے یوگوسلاویہ جانا چاہتا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے وہیں سے اٹلی کی طرف دھکیل دیتے۔ جب میں گونگا بن گیا تو انہیں شک پڑا کہ میں ضرور کوئی جاسوس ہوں اور جان بوجھ کر گونگا بن گیا ہوں۔ چیک پوسٹ پر میری تلاشی لی گئی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ چیک پوسٹ سے مجھے پیچھے لے جاکر ایک کوارٹر میں بند کر دیا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد ایک وردی پوش صحت مند خوب صورت افسر اندر آیا۔ اس کے ساتھ دو سیکورٹی فورس کے سپاہی بھی تھے۔ افسر نے آتے ہی مجھ سے بڑی صاف انگریزی میں پوچھا: "تم کون ہو؟ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

میں یہاں یہ بیان کر دوں کہ یوگوسلاویہ میں ابھی بوسنیا' سربیا اور کروشیا کی چپقلش شروع نہیں ہوئی تھی۔ ابھی سارے ملک کا نام یوگوسلاویہ تھا۔ یہ قیام پاکستان کے کچھ بعد کا زمانہ تھا۔ میں نے یوگوسلاوی افسر کو انگریزی میں اپنی ساری روداد بالکل سچ سچ بیان کر دی اور اس سے درخواست کی کہ مجھے پاکستانی سفارت خانے میں پہنچا دیا جائے۔ خدا جانے یہ میری زبان اور سچ بولنے کا اثر تھا یا وہ یوگوسلاوی افسر ہی رحم دل تھا۔ اس پر میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا اور اپنی زبان میں اپنے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں سے کچھ کہا اور ان کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔

ایک گھنٹے بعد میرا بیان قلم بند کیا گیا۔ میرے ہاتھوں کے نشان لئے گئے اور مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ دو دن تک میں بارڈر پولیس کی حوالات میں بند رہا۔ اس دوران کسٹم حکام نے میرے بارے میں اپنے طور پر ضروری تحقیقات مکمل کی اور پھر ایک روز بارڈر پولیس کے ٹرک میں بٹھا کر

زغرب شہر روانہ کر دیا۔ زغرب میں بھی امیگریشن والوں نے میرے بارے میں اپنے طور پر ضروری تحقیق کی اور بلغراد میں پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنے کے بعد مجھے پولیس کی حراست میں بلغراد کے پاکستانی سفارت خانے پہنچادیا گیا۔ میں بھی اس زمانے کی یوگوسلاوی حکومت اور یوگو سلاوی کسٹمز حکام کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میرے ساتھ انسان دوستی کا سلوک کیا۔

بلغراد میں پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے میرا عارضی پاسپورٹ بنایا گیا اور مجھے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچادیا گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں طوفانی سمندروں اور خطرناک جنگلوں کے ہیبت ناک سفر کے بعد اپنے گھر کے آنگن میں آگیا ہوں۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں پاکستان کی سرزمین کو جھک کر چوم لوں۔ مگر اس خیال سے میں ایسا نہ کر سکا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کراچی سے میں ٹرین میں بیٹھا اور لاہور اپنے گھر آگیا۔ وینس شہر اور اٹلی میں میرے ساتھ بیتے ہوئے واقعات کی تلخ اور خوشگوار یادیں ابھی تازہ تھیں۔ کسی وقت اکیلا لاہور کے کسی ریستوران کے کونے میں بیٹھا چائے پی رہا ہوتا تو گذرے ہوئے واقعات کی ایک فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگتی۔ وینس کے قبرستان میں ملنے والی پراسرار لڑکی یاد آجاتی۔ وینس کی نہروں والی گلیوں کی پرانی حویلی میں قدیم رومن ایمپائر کی یادوں کو سینے سے لگائے عہد ماضی کے ایوانوں میں گم ماورائی لڑکی ایلس یاد آتی۔ کشادہ پیشانی اور چوڑے نتھنوں والی، نتالی کی سہیلی نیگرو لڑکی ساشی یاد آتی جس نے نتالی کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے دی۔ سنہری بالوں والی نتالی یاد آتی جو گناہ آلود زندگی کے حصار سے نکل کر نیکی کے روشن راستوں کی تلاش میں غائب

کر دی گئی۔ جو مجھ سے محبت کرتی تھی اور جس سے مجھے بھی محبت ہو گئی تھی۔ سگریٹ کے نیلگوں دھوئیں میں نتالی کا چہرہ ابھرا بھر کر ڈوب جاتا۔ میں جب آخری بار اس سے جدا کیا گیا تو اسے وینس کے جرائم پیشہ غنڈوں نے بری طرح زدوکوب کیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر وہ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔

یہ منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ اور میرا دل غم سے بوجھل ہو جاتا۔ وقت گذرتا رہا۔ مجھے وینس سے واپس لاہور آئے دو مہینے گذر چکے تھے کہ ایک روز مجھے ڈاک میں ایک ایئر میل لفافہ ملا جس پر اٹلی کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اس پر وینس کے کسی پوسٹ آفس کی مہر بھی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافے کو کھولا۔ اس میں سے ایک خط نکلا۔ یہ خط سینٹ ماریانہ ہسپتال کے پیڈ پر لکھا گیا تھا۔ خط کی تحریر انگریزی میں تھی۔ اوپر میرے نام سے پہلے "سینور" لکھا ہوا تھا۔ آگے لکھا تھا۔۔۔۔۔

"سینور.....!

یہ خط ہسپتال کے بیڈ نمبر ۱۱ کی مریضہ نتالیانہ مجھ سے لکھوا رہی ہے۔ وہ بستر مرگ پر ہے۔ اس کے پیٹ میں تین گولیاں لگی تھیں۔ وہ چند لمحوں کی مہمان ہے۔ اس پر صبح سے بے ہوشی طاری ہے۔ رات جب میں اس کا ٹمپریچر لینے گئی تو وہ ہوش میں تھی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور زندگی کے آخری لمحوں میں تمہیں یاد کر رہی ہے۔ اس نے تمہارا ایڈریس بھی مجھے دیا اور تاکید کی کہ میں اس کا آخری سلام محبت تم تک پہنچا دوں۔ اس کے کچھ دیر بعد نتالیانہ بے ہوش ہو گئی۔ میں

وارڈ کی ہیڈ نرس ہوں۔ مجھے معلوم ہے نتالیانہ پر موت کی بے ہوشی طاری ہوئی ہے۔ میں اس کے بیڈ سے اٹھ کر یہ خط تمہیں نرسنگ روم میں بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ نتالیانہ کو کوئی ظالم شخص گولیاں مار کر ہائی وے کے کنارے جھاڑیوں میں پھینک گیا تھا۔ نتالیانہ کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لایا گیا۔ میں ایک ہفتے سے اس کی تیمارداری کر رہی ہوں۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد مجھ سے صرف تمہارا ذکر کیا۔ تمہارا نام بتایا اور کہا کہ وہ تم سے پیار کرتی تھی اور موت کے بعد بھی تم ہی سے پیار کرتی رہے گی۔ عجیب لڑکی ہے۔ اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں۔ نتالیانہ صبح سے بے ہوش ہے۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایک گولی اس کے جگر میں سے گذر گئی تھی۔

میں خط لکھنا تھوڑی دیر کے لئے بند کرتی ہوں۔ نتالیانہ کے ٹمپریچر چیک کرنے کا وقت ہو گیا ہے ..... سینور! میں ابھی ابھی نتالیانہ کے بیڈ سے واپس آئی ہوں۔ میں اس کا ٹمپریچر چیک کرنے گئی تھی۔ مگر افسوس کہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔

آئی ایم سوری!

فقط!

ہیڈ نرس جولیانہ پوڈسٹا"

اٹلی کے سینٹ ماریانہ ہسپتال سے سنہری بالوں والی نتالی کی موت لے کر آیا ہوا خط میرے سامنے کھلا تھا اور اس پر میرے آنسو گر رہے تھے۔ جس طرح خشک پتوں پر خزاں کی بارش کے موتی گرتے ہیں۔
